مارہ ۴، ۵] لاہور [جولائی اگست ۵۸

اس شمارہ میں

مدیران تحریر: پروفیسر سراج الدین، پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین: عبدالغفور چوہدری، فضل احمد

یمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جولائی، اگست سنہ ۱۹۵۸ء

جلد ـــــــــ ۱۱

شمارہ ـــــــــ ۴ و ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

دورانِ ملازمت تعلیم

ایم۔ اے مخدومی

موجودہ دور برق رفتار تبدیلیوں کا دور ہے۔ سائنس کے نئے نئے انکشافات ٹیکنالوجی میں انقلاب آفرین تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں اور ان کی بدولت صنعت، رسل و رسائل، آلات جنگ اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہوش ربا تیزی سے انقلاب آرہا ہے۔ سائنسی ترقی کے پہلو بہ پہلو وہ علوم بھی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں جن کا تعلق انسانی کردار اور انسانی مراسم کے مطالعہ سے ہے۔ غرض تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں علوم و فنون کی ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوئی تھی جس قدر آج ہے۔

یہ امر تعلیم کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مدرسے کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ نئی پود کو اسکی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ بنائے۔ یہ ذمہ داری اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب استاد خود اپنی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ جن استادوں نے کئی سال پہلے تربیت حاصل کر کے درس و تدریس کا کام شروع کیا تھا ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مضمون کی ماہیت اور اس کے طریقہ ہائے تدریس کے بارے میں تازہ ترین معلومات سے باخبر رہیں۔ بصورت دیگر وہ زندگی کے دھارے سے کٹ کر رہ جائیں گے اور ان کی تدریس غیر مؤثر بن جائے گی۔ جدید صنعت زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ وہ اپنے طریق کار اور اپنے کارندوں کے علم و مہارت کو زمانے کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لیے لگاتار تحقیق کرتی رہتی ہے۔ یہی چیز اس کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے ماہرین تعلیم اس بات کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ مدرسوں میں پڑھانے والے لوگ اپنے علم و فکر کو لگاتار تازہ رکھیں۔ ان ملکوں میں اساتذہ کی لگاتار بالیدگی کو بجا طور پر قومی ترقی بلکہ قومی بقا کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

استادوں کی دورانِ ملازمت تعلیم کو ہم نے ابھی وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ مستحق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے استادوں کو دورانِ ملازمت تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے۔ وجہ یہ کہ ان میں سے بہتوں نے تعلیم و تربیت کی تکمیل ایک ایسے دور میں کی تھی جب ملکی اور عالمی زندگی کے تقاضے آج سے سراپا مختلف تھے۔ اس وقت سے لے کر اب تک نہ صرف علوم و فنون نے بے حد ترقی کی ہے۔ بلکہ قومی اور بین الاقوامی زندگی کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ مدرسوں میں طلبہ کے بے پناہ ہجوم۔ لوازمات کی کمی اور بدلے ہوئے معاشرتی حالات نے تعلیم کے لیے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے ایک نئی نگاہ کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدرسوں میں تربیت یافتہ استادوں کی جو کمی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ تربیت یافتہ استاد زیادہ مؤثر کام کریں اور اس کی واحد صورت اساتذہ کی دوران ملازمت تعلیم ہے۔

غرض استادوں کی دوران ملازمت تعلیم کا ایک جامع منصوبہ اس وقت ہماری ایک اہم قومی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے :-

(۱) قبل از ملازمت تربیت ایسی ہو کہ نئے استاد تعلم، مطالعہ اور تجربے کرنے کا شوق ساتھ لے کر جائیں۔

(۲) جب استاد نیا نیا ملازمت میں داخل ہو تو اسے اس پیشے کے ساتھ ہمدردانہ اور معلومات بخش انداز سے متعارف کرایا جائے۔

(۳) دوران ملازمت تعلیم کے لیے جس محرک قسم کی ذہنی آب و ہوا کی ضرورت ہے وہ اسی صورت میں مہیا ہو سکتی ہے جب صدر معلم اور انتظامی افسر خود ذہنی بالیدگی کے شیدائی ہوں۔

(۴) پیمانہ تنخواہ اور ترقی کے مواقع اس طور پر مرتب کیے جائیں کہ وہ استادوں کو انفرادی طور پر علمی بالیدگی حاصل کرنے پر ابھاریں۔

بے شک ان شرائط کو پورا کرنے کے لیے قومی جیب پر اور بوجھ پڑے گا۔ لیکن روپے کا یہ مصرف بہترین نتائج پیدا کرے گا کیوں کہ عمل تدریس کا اصل محور استاد ہے۔ جس قدر پُر تاثیر استاد کی شخصیت ہوگی اسی قدر مؤثر اس کا کام ہوگا ۞

اخلاقی تعلیم

فضل احمد

اخلاق کیا ہے؟

اچھے کردار اور اچھی سیرت کو ہر زمانے میں ایک بلند مقصد قرار دیا گیا ہے۔ اور اس مقصد کا حصول تعلیم کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے معلموں نے اچھے اخلاق کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدر شمار کیا ہے اور اسے اپنی تعلیمات کا محور بنایا ہے۔ اخلاق سے مراد انسان کا عام طرز عمل ہے۔ انسان کے خیالات اور معتقدات خواہ کچھ بھی ہوں دوسرے انسانوں کو ان کے متعلق براہِ راست کچھ معلوم نہیں ہو سکتا ان کا اندازہ صرف اس ردِ عمل سے ہو سکتا ہے جس کا اظہار انسان زندگی کے مختلف عملی تقاضوں کے جواب میں کرتا رہتا ہے۔ اخلاق سے مراد انسان کا عام چلن ہے۔ اس میں نہ صرف یہ چیز شامل ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ زندگی میں جب آزمائش کی گھڑیاں آتی ہیں تو وہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔

غرض اخلاق محض زبانی دعووں کا نام نہیں کردار کا نام ہے۔ ایسا کردار جس کا مظاہرہ معاشرتی پس منظر میں کیا جائے۔ عمل اور معاشرتی پس منظر اخلاق کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ جہاں ان دو میں سے ایک غائب ہو وہاں "اخلاق" کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ اخلاق کا اظہار صرف اعمال کی شکل میں ہی ہو سکتا ہے اور یہ اعمال ایسے ہونے چاہئیں جن کا عملی نتیجہ دوسروں کی بھلائی ہو۔ اخلاق کی اس تعریف سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) زبانی دعوے یا خالی اعتقادات اچھے اخلاق کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص پسندیدہ قسم کے اعتقادات رکھتا ہو لیکن اس کا طرزِ عمل ان اعتقادات سے بہت مختلف

(۲) اخلاق کا اطلاق ایسے اعمال پر ہو گا جن کی بدولت دوسرے انسانوں کی بہبود میں اضافہ ہوتا ہو

اگر کوئی عمل اس قسم کا نتیجہ پیدا نہیں کرتا تو اس کا محرک خواہ کتنا ہی اچھا ہو وہ عمل اخلاق کے دائرے میں شامل نہ ہو سکے گا۔ محض اچھا ارادہ کسی فعل کو اخلاق کا درجہ نہیں دے سکتا۔

اخلاق کا یہ تصور انسانی ہستی کی ناقابل تقسیم وحدت پر مبنی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے جسم اور روح انسانی ہستی کے دو یکساں طور پر اہم ستون چلے آئے ہیں۔ مگر تاریخ کے مختلف دوروں میں زندگی کے متعلق جو نظریے اور فلسفے وضع ہوتے رہے ہیں ان میں سے اکثر نے ان دونوں میں سے کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو اولیت دی۔ نتیجہ ایسے اخلاقی ضابطوں کی شکل میں نکلتا رہا جو زندگی کی ہمہ گیر ضرورتوں کو پورا نہ کر سکتے تھے، چنانچہ ان ضابطوں نے انسانی زندگی کو اس کی پوری بہار سے محروم رکھا۔ جو معاشرتی زندگی ان ضابطوں کے تحت مرتب ہوئی وہ یا تو پھیکی اور بے کیف قسم کی رہی یا روح کش انسانی پندار اور رسوا کن تذلیل انسانیت کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

اکیلا یقین کافی نہیں

مخصوص تاریخی حالات یا وقتی تقاضوں کے زیر اثر دنیا میں ایسے فلسفہ ہائے حیات وجود میں آتے رہے ہیں جنہوں نے خالی یقین کو کافی سمجھا۔ دنیا میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی شاید نہ ہو جو ایمان و یقین کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ تاہم اخلاق کی بنیاد کے طور پر اس قسم کے فلسفے کی عدم کفایت کسی بھی لمبی چوڑی تشریح کی محتاج نہیں۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ ہر عمل کی بنیاد پہلے دل میں رکھی جاتی ہے۔ انسان اپنے مقصد حیات کے متعلق جو اعتقاد رکھتا ہو وہ اسی کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ جائزہ عام حالات میں کافی تردد پیدا کرتا ہے۔ انسان مجوزہ طریق کار اور اس کے نتائج کو بار بار تولتا اور بالآخر کوئی ایک فیصلہ کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی خندق کے پار چھلانگ لگانا چاہتا ہے۔ وہ خندق کی چوڑائی اور اپنی قوت کا بار بار جائزہ لیتا ہے۔ ممکن ہے وہ چند بار کچھ قدم بھاگ کر خندق کے کنارے تک آئے تاکہ اسے اس بات کا صحیح اندازہ ہو جائے کہ اس کی قوت اسے کہاں تک لے جائے گی۔ اس سارے تردد کے بعد وہ چھلانگنے یا نہ چھلانگنے کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے۔ یہ آخری فیصلہ اس کا کردار ہے مگر اس کردار کی بنیاد ان ذہنی کیفیتوں پر ہے جو دیر تک اس انسان پر طاری رہیں۔

اس تجزیے کی روشنی میں ذہنی کیفیت یعنی خیالات اور اعتقادات کو پہلے قدم کا درجہ ضرور ملتا ہے مگر ان ذہنی کیفیتوں کو سب کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ یہ کیفیتیں دوسرے انسانوں کی زندگی کو کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ عملی فائدے یا نقصان کا مدار آخری فیصلے یا فعل پر ہے جو ان کیفیتوں نے پیدا کیا ہے ممکن ہے خندق پھلانگ کر وہ شخص کسی زخمی یا بیمار کی مدد کرنا چاہتا تھا یا دشمن کے کیمپ سے اپنے ملک کے لیے کوئی مفید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیزیں دوسروں کی سود بہبود پر اثر ڈالنے والی تھیں مگر یہ اسی وقت صورت پذیر ہو سکتی تھیں جب متعلقہ انسان حالات کا جائزہ لینے کے بعد خندق پھلانگنے یا نہ پھلانگنے کا فیصلہ کر لیتا۔

تاریخ میں بارہا یوں ہوا ہے کہ کسی مذہبی یا مجلسی گروہ کو سخت ناموافق حالات سے سابقہ پڑا۔ یہ حالات ایسے تھے جو اس گروہ کے اعتقادات کو عملی شکل اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے ایسی صورت میں گروہ کے سامنے دو ہی راستے کھلے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ نامساعد حالات کے ساتھ ٹکر لے اور اس کوشش میں یا خود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے یا مخالف قوتوں کا خاتمہ کر دے۔ دوسرا راستہ جو نسبتاً آسانی کا راستہ تھا یہ تھا کہ اپنے اعتقادات کو اپنے دلوں تک محدود رکھا جائے اور مروجہ معاشرتی ماحول کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ دوسرا طریق کار تلقین و اعتقاد کو ہی نجات کا راستہ خیال کرتا ہے وہ صرف اتنا مطالبہ کرتا ہے کہ فرد اپنے دل کی دنیا کو ایک مخصوص شکل دے دے اور بس۔ اسے بیرونی دنیا سے کچھ سروکار نہیں۔

جب جسمانی اور روحانی دنیا کے درمیان یوں حد قائم کر دی جائے اور روحانی دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان دنیاوی علائق سے تنفر پیدا کر لیتا ہے۔ انسانی زندگی اور انسانی اخلاق کا معراج یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ دنیا پر لات مار دی جائے۔ دنیاوی لذات سے بہرہ ور ہونا گناہ بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی سیرت و کردار کا واحد محور اگلی دنیا بن جاتی ہے۔ اس دنیا کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مسیحی تعلیم کی کم و بیش یہی کیفیت رہی ہے۔ مسیح علیہ السلام اور ان کے پیروؤں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ان کی تعلیمات کو مخالف سیاسی قوتوں کے

زیر سایہ پروان چڑھنا پڑا۔ چنانچہ یہ تعلیمات رفتہ رفتہ اس دنیا سے بے تعلق ہوتی گئیں اور بالآخر وہ دنیا اور دنیاوی حقائق کی شدید ترین دشمن بن گئیں۔ صدیوں بعد جب مسیحی دنیا کو اپنے عقاید کی کوتاہیوں کا علم ہوا تو اسے ان میں انقلابی تبدیلیاں کرنی پڑیں تب کہیں جا کر مغرب ترقی کی طرف قدم بڑھانے کے قابل ہوا۔

اس فلسفے کے ردعمل کے طور پر مغرب میں ایک اور فلسفہ پیدا ہوا جس کی تعلیم یہ تھی کہ اعتقاد اور یقین بے معنی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسانی مفاد ہے۔ جو فعل اس مفاد کو ترقی دینے والا ہو وہ اخلاقی عمل ہے اور جو اسی مفاد کے منافی ہو وہ غیر اخلاقی۔ مفاد پرستی کا یہ فلسفہ جس آسانی سے تنگ نظری، خود غرضی اور نفس پرستی کے مترادف بن سکتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اعمال و افعال کی اچھائی برائی کا پیمانہ جب اصول و اعتقاد کی نگرانی سے بالکل آزاد ہو جائے تو وہ ایک ایسے ضابطہ حیات کی بنیاد رکھ دیتا ہے جس میں لطیف تر قدروں کا گذر نہیں ہو سکتا۔

اخلاق کا درست معیار

ظاہر ہے کہ اخلاق کا صحت مند ضابطہ وہ ہوگا جو نہ صرف یقین و اعتقاد کی درستی کا ضامن ہو بلکہ درست اعمال و افعال کا بھی۔ اس ترازو میں تولنے سے دین فطرت کا اخلاقی ضابطہ بالکل مثالی ثابت ہوتا ہے۔ اس ضابطے کا افتتاحی جملہ ملاحظہ ہو۔ "یہ ایسے ضابطہ حیات کی کتاب ہے جس کی صحت مندی کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ضابطہ ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جو اللہ کو بن دیکھے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ نمازیں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

کتاب ہدایت نے اپنے اس افتتاحی انتباہ کو بار بار دہرایا ہے۔ جہاں کہیں انسانی کامیابی و کامرانی کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ ہاں یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ انعام ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ اسی طرح جہاں جہاں ناکامی اور نامرادی کی عبرت ناک کہانیاں اور بداخلاقی کی خوفناک سزاؤں کا بیان ہوا ہے۔ وہاں ساتھ ہی یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیکوکاری کی راہ پر ثابت قدم رہے وہ اس ذلت سے بچے رہے۔

یہ ضابطہ اخلاق ایسا ہے جو انسان کی ساری ہستی کی نگہبانی کرتا ہے۔ وہ اس بات سے

کسی صورت میں مطمئن نہیں ہو جاتا کہ انسان اپنے یقین اور خیالات کو صحیح شکل دے۔ وہ اس سے آگے جاتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ انسان ان درست اعتقادات پر ثابت قدم بھی رہے۔ پھر یہ ثابت قدمی کوئی نظری شے قرار نہیں دی گئی، بلکہ اسے مقررہ اعمال اور افعال کی شکل دی گئی ہے۔ ان اعمال و افعال کے بغیر خالی ایمان کو ادھورا اور ناکافی قرار دیا گیا ہے۔ احادیث میں تفصیل کے ساتھ ایک ایسا واقعہ منقول ہے جو اس نکتے کی پوری کی صراحت کرتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرتؐ سے کہیں یہ بات سنی کہ "من قال لا إله الا الله دخل الجنة" اور آپ یہ خوشخبری دوسروں کو سنانے دوڑے۔ سیدنا حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو حضرت ابوہریرہؓ کو اس حدیث کی روایت سے ڈانٹا۔ جب یہ سارا ماجرا آں حضرت صلعم کی خدمت میں بیان کیا گیا تو آپؐ نے حضرت عمرؓ کے فعل کو پسند فرمایا۔

یہ واقعہ اپنی شرح خود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ توحید تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ انسانی زندگی کے ہر قسم کے مفاسد اس جادو اثر نسخہ کے طفیل دیکھتے ہی دیکھتے دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ صرف زبان سے دو لفظ کہہ کر توحید کا اقرار کر لینے سے اس کی قوم کی کایا پلٹ جائے گی تو وہ سخت غلطی میں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہا تھا۔ اور ہادی کاملؐ نے بھی حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔

خود غرضی اور اخلاق

مکارم اخلاق کے متعلق عالمی رائے عامہ میں کبھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ حق گوئی، پاک دامنی خوش معاملگی، مروت، رحم دلی اور انصاف پسندی کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ سراہا گیا ہے۔ یہ اخلاق کے بنیادی عناصر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ضمن میں کئی اور اخلاقی خوبیاں آ جاتی ہیں جن کے علحدہ ذکر کی ضرورت نہیں۔ کوئی معاشرہ خواہ کتنا گیا گذرا ہو۔ اور اس کی اجتماعی زندگی ان اخلاقی قدروں سے خواہ کتنی ہٹی ہوئی ہو۔ وہ ان قدروں کی عظمت کا اقرار کرنے میں کبھی تامل نہیں کر سکتا۔

جو لوگ اخلاق کو مفاد پرستی کا ہم معنی بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ حق گوئی، پاک دامنی، خوش معاملگی وغیرہ بھی مفاد پرستی کے تحت آ سکتے ہیں۔ مثلاً جو طبیب خوش خلق

اور پاک دامن ہے اس کا کاروبار خوب چمکے گا۔ جو دکاندار پورا تولتا اور درست قیمت بتاتا ہے اس کی دکان دوسرے کے مقابلے میں زیادہ چلے گی۔

اس استدلال میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ درست ہیں۔ مگر ان سے غلط نتیجے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ جو طبیب خلیق اور پاک باز ہوگا اس کا کام دوسرے کے مقابلے میں زیادہ چمکے گا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ اس لیے خوش خلق اور پاک دامن ہے کہ اس کا کاروبار زیادہ چلے۔ وجہ یہ کہ ایسے طبیب بھی موجود ہیں جو کج خلق اور اوباش مزاج ہیں انھیں خوب معلوم ہے کہ یہ اخلاقی معائب ان کے مفاد کو تباہ کر رہے ہیں مگر اس کے باوجود وہ خوش خلقی اور پاک دامنی کی راہ اختیار نہیں کرتے۔ اسی طرح ایسے دکاندار بھی موجود ہیں جو گاہکوں کو جائز و ناجائز طور پر لوٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہر چند کہ اس قسم کے لوگ کاروباری زندگی میں کامیاب نہیں ہوتے۔ پھر بھی وہ ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔

غرض اخلاق کو تنگ قسم کی خود غرضی کے مترادف قرار دینا صریحاً غلط ہے۔ ہاں اگر اخلاق کو خود غرضی کی بجائے خودی کے ہم معنی قرار دے دیا جائے تو بات بن جاتی ہے۔ خودی سے مراد اپنی ذات کی ان بلند ترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے جو فطرت نے ودیعت کر رکھی ہوں۔ ان صلاحیتوں کا بروئے کار آنا قلب و روح کو بڑی طمانیت بخشتا ہے۔ اگر مکارم اخلاق کا مقصد اس طمانیت کو قرار دے دیا جائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ اگرچہ یہ طمانیت بھی فرد کی ذات کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسے خود غرضی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس طمانیت کی تلاش میں فرد نہ صرف عموماً اپنی راحت و آسائش کو بھول جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اپنے آپ کو قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مثلاً ایک طبیب جو ہیضہ کی وبا کے خلاف جہاد کرنے نکلتا ہے وہ نہ صرف گھر کی آسائشوں سے کنارہ کش ہوتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس جہاد میں خود اس کے اپنے لقمۂ اجل بن جانے کا امکان بھی موجود ہے۔ لیکن اس کی ذہنی تربیت اسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ ان مشکلوں اور خطروں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے۔ وہ ایسا کرنے میں دلی راحت محسوس کرتا ہے۔ اس سے اس کی خودی کی تشفی ہوتی ہے۔ اس

جہاد میں اگر اس کی اپنی ہستی بھی فنا ہو جائے تو بھی اس کی خودی باقی رہتی ہے۔ خودی کا یہ جذبہ جہاں
موجود ہو، مکارم اخلاق پیدا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے۔

مذہب اور اخلاق

مذہب اور اخلاق کے درمیان بہت گہرا رشتہ موجود ہے۔ مذہب سہ گانہ عناصر پر مشتمل ہوتا ہے

(۱) اعتقادات (۲) عبادات (۳) اخلاق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اخلاق کے لیے بھی اعتقادات کا ہونا ضروری ہے۔ پس مذہب اخلاق کے مقابلہ
میں صرف ایک عنصر زائد رکھتا ہے اور وہ عنصر ہے عبادات۔ عبادات سے مراد وہ افعال و اعمال
جو ایک بالاتر ہستی کی خوشنودی مزاج کے لیے انجام دیے جائیں۔ یہاں کسی ذاتی مفاد کا سرے سے
کوئی سوال نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ عبادات جب اعلیٰ تر شکل اختیار کر جائیں تو وہ عابد کو بہت
سکون عطا کیا کرتی ہیں۔ مگر یہ سکون ایک ضمنی شے ہے۔ اصل مقصود اس بالاتر ہستی کی خوشنودی ا
رضا جوئی ہے جس نے عبادات کا حکم دیا اور ان کو ایک مخصوص شکل دی۔

ہر مذہب کی تعلیمات میں ایک اخلاقی ضابطہ بھی شامل رہا ہے۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ عبادات
اور اس کے خالق کے باہمی رشتے کو صحت مند بنیاد پر استوار کرنے کا ذریعہ ہیں۔ مگر خالق کے تصور کے سا
مخلوق کا تصور لازمی ہے۔ اگر خالق کے ساتھ صحت مند رشتہ استوار کرنا مطلوب ہے تو اس کا منطقی
یہ ہوگا کہ اس کی مخلوق کے ساتھ بھی صحت مند مراسم قائم کیے جائیں ورنہ خالق کو خوش کرنے کے در۔
ہونا اور اس کی مخلوق کو نظر انداز کر دینا، گڑ کھانے اور گلگلوں سے پرہیز کرنے کے مترادف ہو جائے
دوسرے الفاظ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ حقوق اللہ ادا کرنے
کے لیے حقوق العباد کا ادا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ایسا نہ کرنا حقوق اللہ کے ساتھ تمسخر کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ مذہب اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی مذہب اخلاق کو غیر باد کہہ کر زندہ
رہ سکتا، لیکن اس کا عکس درست نہیں۔ اخلاق مذہب کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے
کوئی فرد یا جماعت کسی بالاتر ہستی پر یقین نہ رکھے اور اس طرح عبادات کی ضرورت سے بے نیاز ہو

تاہم اسے اپنی اجتماعی زندگی کی صحت مندی کے لیے اخلاق کی ضرورت بدستور رہے گی۔ یہ خیال درست نہیں کہ جہاں مذہب نہیں وہاں اخلاق بھی نہیں رہ سکتا۔ انقلاب روس کے بعد جب مذہب کو روس سے دلیس نکالا ملا تو بیشتر نوجوانوں نے اسے مادر پدر آزادی کا پیش خیمہ سمجھا۔ اور طرح طرح کی اوباشیوں کو مباح خیال کرنا شروع کیا۔ اس پر لینن نے ان لوگوں کو سخت ڈانٹ پلائی اور کہا کہ لامذہبی کا مطلب اخلاقی پابندیوں کا خاتمہ ہرگز نہیں۔

طریق تربیت کا فرق

اخلاق کی ضرورت ہر معاشرے کو ہے۔ خواہ وہ مذہبی معاشرہ ہو یا لادینی معاشرہ۔ اخلاق کی مثال سیمنٹ کی ہے جو معاشرتی عمارت کی اینٹوں کو باندھے رکھتا ہے۔ عمارت کی بنیاد خواہ کسی قسم کی ہو اسے سیمنٹ کی ضرورت بہر نوع پیش آئے گی۔ اس کے بغیر اس کی پائداری اور استحکام کا خاتمہ ہو جائے گا اور آندھی کا کوئی بھی زور دار جھونکا اس عمارت کو زمین پر بٹھا دے گا۔

دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اخلاق کی بنیاد خواہ مذہب پر ہو خواہ لادینیت پر، دونوں صورتوں میں اس کی تربیت کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ یہ قیاس کرنا درست نہیں کہ انسانی فطرت میں سعید رجحانات اس قدر قوی ہیں کہ وہ خود بخود پرورش پا کر مکارم اخلاق کا مقام حاصل کر لیں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ انسانی خمیر میں بھلائی کی چاشنی رکھی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انسانی فطرت میں دنائیت بھی موجود ہے۔ "احضرت الانفس الشح" ایک ایسی سچائی ہے جس سے عمرانیات کا کوئی طالب علم بے خبر نہیں۔ بے شک نفس کے اس گھٹیا پن سے بلند ہونے میں ایک بہت بڑی راحت رکھی گئی ہے مگر اس راحت سے آشنا ہونے کے لیے پہلے نفس کی تنگی سے چھٹکارا پانا لازمی ہے۔ انسان کا پہلا میلان عموماً اپنے ذاتی مفاد کی نگہداشت ہوتی ہے۔ اس حیوانی جذبے کو لطافت اور وسعت عطا کرنے کے لیے موزوں معاشرتی ماحول میں عملی تربیت ضروری ہے۔ تاکہ فرد اپنے ذاتی مفاد کو جماعتی حدود تک وسعت دینا سیکھ جائے۔ اور اس لطیف جذباتی سرور سے آشنا ہو جائے جو اس طرح حاصل ہوتا ہے۔

مذہبی اور لادینی معاشرتی نظام اگرچہ یکساں طور پر اخلاقی ضابطے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

ذہب دونوں اخلاقی تربیت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ تاہم دونوں کی تربیت الگ الگ قسم کی ہے۔ مذہبی معاشرہ اخلاقی تربیت کے لیے عبادات کو ذریعہ بناتا ہے۔ وہ اپنے اخلاقی ضابطے کو اساسِ حیات بنانے کے لیے یہ اعلان کرتا ہے کہ خدا کی خوشنودی کا ذریعہ جس طرح عبادات ہیں بالکل اسی طرح مکارمِ اخلاق بھی۔ بس خالق نے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے خوش کرنے کے لیے یہ یہ عبادات کی جائیں۔ اسی نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ ہمیشہ سچ بولا جائے، پورا تولا جائے۔ چوری نہ کی جائے۔ ہمسائے اور اجنبی کے ساتھ مروت کا برتاؤ کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ان مکارمِ اخلاق کی تربیت کے لیے مذہب بعض مخصوص قسم کی عبادات مقرر کر دیتا ہے مثلاً یہ کہ آمدنی میں سے اتنا حصہ غریبوں کو دیا جائے۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے مذہبی احکام کی بجا آوری بشرطیکہ وہ سچے دل سے اللہ کی رضا جوئی کے لیے کی جائے اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کا بے حد موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

مذہب جس حد تک مکارمِ اخلاق کی مؤثر تربیت کر سکتا ہے اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک تاریخی واقعہ کا ذکر کافی ہو گا۔ حضرت امام جعفر صادق کا غلام کھولتے ہوئے پانی کا برتن اٹھائے کمرے میں سے گذر رہا تھا کہ اس نے ٹھوکر کھائی۔ برتن ہاتھ سے گر گیا اور گرم پانی کے چھینٹے امام صاحب پر پڑے۔ انھوں نے غصے کی نگاہ سے غلام کی طرف دیکھا۔ غلام نے جھٹ قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی "والکاظمین الغیظ" (مومن وہ ہیں جو غصے کو پی جاتے ہیں) امام صاحب نے فرمایا میں نے اپنے غصّے کو پی لیا۔ غلام نے جھٹ آیت کا اگلا حصہ پڑھا والعافین عن الناس (اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں) امام صاحب نے فرمایا میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اس پر غلام نے آیت کے باقی ماندہ الفاظ پڑھے۔ "وَاللہُ یُحِبُّ المحسنین" (اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے) ان الفاظ نے امام صاحب کی دلی رقت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ آپ نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور فرمایا:- یہ لے اور چلتا بن۔ میں نے تجھے اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔"

اخلاق کا مقصد انسان کو گھٹیا اور تنگ قسم کی خود غرضی سے نجات دلا کر اسے وسیع تر مفاد کا نگہبان بنانا ہے۔ مذہب چوں کہ خالق کائنات کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے

اس لیے لازمی طور پر غرض پرستی کا جو بدل وہ تجویز کرتا ہے اس کی وسعت آفاقی ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کے تصور کو بے حد محدود کر کے پیش کیا۔ مثلاً یہودیوں کا خدا صرف بنی اسرائیل کی بہبود کا حریص تھا۔ اس کے نزدیک دوسری قومیں اچھوتوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ اسی طرح برہمن مت کا خدا برہمنوں کا اس حد تک عاشق تھا کہ اس نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کا کام ہمیشہ کے لیے برہمنوں کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس کے برعکس اسے شودروں سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے یہ حکم دے دیا کہ ہر ے پوتر الفاظ کی آواز شودروں کے کان میں نہ پڑنے پائے۔ اور اگر کوئی بدبخت شودر یہ گستاخی کر گذرے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے۔ غرض مذہب فرد کی ذات کی بجائے جس مرکز وفاداری کو جگہ دینا چاہتا ہے اس کی وسعت کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہب نے خدا کا کیا تصوّر پیش کیا ہے جس قدر یہ تصوّر آفاقی ہوگا اسی قدر اس کا ضابطہ اخلاق آفاقی قدروں کا حامل ہوگا۔

پیچھے یہ دیکھا جا چکا ہے کہ اخلاقی تربیت لادینی بنیادوں پر بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم اس تربیت کیلیے ضروری ہوگا کہ فرد کی ذات کی بجائے کوئی دوسرا مرکز وفاداری پیش کرے۔ یہ مرکز وفاداری کوئی شے بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ پیشہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی ملک میں طب کا پیشہ بہت بلند روایات قائم کر لے تو اس پیشے میں شامل ہونا اور اس کی روایات کو جاری رکھنا ایک پسندیدہ شے بن سکتی ہے۔ اس ملک میں کئی ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو اس پیشے میں شمولیت حاصل کرنے کے لیے نہ صرف ذاتی آرام و آسائش کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر قربانی دینے پر بھی آمادہ ہوں۔ ملک و قوم کی محبت ایک اور مرکز وفاداری ہے جس نے جدید زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ملک و قوم کی خاطر لوگ بڑی سے بڑی قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ موجودہ صدی میں جو دو عالمی جنگیں لڑی گئی ہیں ان کی تاریخ اس قسم کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔

مکارم اخلاق کی تربیت کے لیے جن چیزوں کو وفاداری کا مرکز بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ آفاقی وسعت نہیں جو رب العالمین کے تصوّر میں ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی تربیت کو لادینی تربیت پر فوقیت حاصل ہے۔ مگر اس فوقیت کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ خدا کا تصوّر صحیح معنوں میں رب العالمین کا تصوّر ہو۔ ایک ایسی برتر ہستی کا تصور جو نہ صرف ہر قسم کی مخلوقات کو اس کے اعمال و افعال سے قطع

پدرانہ شفقت سے پالنے والی ہو۔ بلکہ ہر فرد کو اس کے چھوٹے سے چھوٹے کام کی پوری جزا اور سزا بھی دیتی ہو۔ جہاں خدا کی ربوبیت کا یہ تصور مؤثر طور پر موجود ہو وہاں مذہب کی دی ہوئی اخلاقی تربیت دوسری ہر قسم کی اخلاقی تربیت سے فائق ثابت ہو گی۔ لیکن جب خدا کی ربوبیت کا اقرار صرف زبان تک محدود ہو کر رہ جائے اور عملاً خدا پر ایمان لانے کو خدا پر ایک احسان سمجھا جائے تو پھر ایسے مذہبی ماحول میں دی گئی اخلاقی تربیت لادینی قسم کی تربیت سے بھی فروتر ثابت ہو گی۔

اجتماعی زندگی میں مؤثر حصّہ

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ اخلاقی تربیت ایک معاشرتی سرگرمی کا نام ہے۔ فرد کی اخلاقی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے۔ کوئی فرد دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر کوئی اخلاقی تربیت حاصل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس نکتے کو اپنے بلیغ پیرائے میں یوں واضح کیا ہے :۔

"ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیل اللہ صفاً کانھم بنیانٌ مرصوصٌ"

(ترجمہ) بے شک اللہ ایسے لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں یوں باہم مل کر جہاد کرتے ہیں جیسے وہ پگھلے ہوئے سیسے سے تیار شدہ دیوار ہوں۔

اخلاقی تربیت میں اجتماعی عمل کو جو دخل حاصل ہے اس کی اہمیت کو اسلام سے بڑھ کر دنیا کے کسی اور دین نے نہیں سمجھا۔ یہاں تمام کی تمام فرض عبادات اجتماعی تعاون اور باہمی ہمدردی کو ترقی دینے والی ہیں۔ عقیدۂ توحید کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلام کے چار بنیادی ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر عبادت اجتماعی روح کو ترقی دینے والی ہے۔ بے شک یہ عبادات ایسی ہیں کہ روح کو لطافت بخشتی اور انسان کو اس کے خالق کے قریب تر لاتی ہیں۔ لیکن اسلام صرف اتنی بات کو کافی نہیں سمجھتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے خدا سے جس قدر قریب ہوتا جائے وہ دوسرے انسانوں سے بھی اسی قدر قریب ہوتا جائے۔ اسلام تمام انسانی نیکیوں کو اس دوہرے پیمانے سے ناپتا ہے۔ اس کے مکارم اخلاق کی بلند و بالا عمارت ان دوگانہ ستونوں پر کھڑی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ستون باقی نہ رہے

تو یہ عمارت پل بھر کے لیے باقی نہیں رہ سکتی۔

اسلام نے مکارم اخلاق کی تربیت کے جو آفاقی اصول پیش کیے تھے تاریخ ان پر بڑا عبرانگیز تبصرہ پیش کرتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ خیر الامم کے افراد دنیا میں جدھر نکل جاتے تھے انھیں رحمت کے فرشتے سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ خود اپنے ان سے بیزار ہیں :-

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

غرض اجتماعی زندگی سے الگ اخلاقی تربیت کا کوئی وجود نہیں۔ اخلاقی تربیت کا اہتمام دینی بنیادوں پر کیا جائے یا لادینی بنیادوں پر، تربیت پانے والوں کو اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے بھرپور مواقع حاصل ہونے چاہئیں تاکہ وہ دوسروں کے ساتھ صحت مند مراسم قائم کرنا اور باقی رکھنا سیکھ جائیں۔

فہم اور ذمہ داری دو اہم عناصر

اخلاقی تربیت خواہ دینی قسم کی ہو یا لادینی قسم کی اس کی اجتماعی سرگرمیاں ذاتی فہم اور مشترکہ ذمہ داری کی پیداوار بھی ہو سکتی ہیں اور کسی بالاتر ہستی یا مرکزی قیادت کے حکم کا نتیجہ بھی۔ تاہم یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ دونوں صورتوں میں تربیت کی نوعیت ایک سی ہوگی۔ اخلاقی تربیت کی غرض سیرت سازی اور تشکیل کردار ہونی چاہیے۔ اس کے پیش نظر ایسی عادت پیدا کرنا ہونا چاہیے جو فرد کی مزاجی ساکت کا جزو بن جائیں اور آگے زندگی میں چل کر اس کے عام چلن کا فیصلہ کرنے والی قوت ثابت ہوں۔ اس قسم کی قوت وہی عادات ہو سکتی ہیں جن کی پشت پر فرد کی جذباتی طاقت کام کر رہی ہو۔ ظاہر ہے کہ انسان صرف ایسے افعال کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کر سکتا ہے جو اس نے سوچ سمجھ کر خود اپنی لپسند سے انجام دیے ہوں۔ جہاں یہ افعال کسی خارجی جبر کے تحت انجام دیے جائیں وہاں ان کی نوعیت رسمی حرکات و سکنات کی بن جائے گی جن کے پیچھے کوئی جذباتی قوت کام نہیں کر رہی۔ اس قسم کے افعال مستقل عادات کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ جونہی خارجی دباؤ ختم ہو جائے یہ افعال بھی ترک کر دیے جاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں ساری معاشرتی زندگی کی بنیاد مقررہ قاعدوں اور اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ ایسی صورت میں خارجی

زمانہ تربیت کے بعد بھی بدستور قائم رہتا ہے۔ اور اخلاقی تربیت نے جن ظواہر کی پابندی سکھا دی ہو ان پر مدت العمر عمل کو نا پڑتا ہے۔ لیکن جمہوریت کے موجودہ دور میں اس قسم کے معاشروں کا وجود بہت دشوار ہو گیا ہے۔

یہاں ایک اور نکتے کی وضاحت معلوم ہوتی ہے۔ اخلاقی تربیت جن اجتماعی سرگرمیوں سے کام لیتی ہے ان کی غرض و غایت کا فہم پیدا کرنا نسبتاً سہل ہے۔ لیکن ان کی ذمہ داری زیر تربیت لوگوں کو سونپ دینا اس قدر سہل نہیں۔ جہاں ضابطہ اخلاق دینی بنیادوں پر قائم ہو وہاں یہ دشواری زیادہ بدیہی نظر آتی ہے۔ وجہ یہ کہ دینی ضابطہ اخلاق میں قانون سازی کا اصل سرچشمہ ایک برتر ہستی ہوتی ہے اس کی طرف سے جو اخلاقی اور روحانی اصول و قواعد مقرر کر دیے جائیں ان میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔

دوسری طرف یہ بات بالکل مسلمہ ہے کہ اگر زیر تربیت لوگ ان سرگرمیوں کا فہم پیدا نہیں کرتے اور ان میں پوری سرگرمی سے حصہ نہیں لیتے تو تربیت کے نتائج سطحی رہیں گے۔ یہ بات نفسیاتی طور پر طے شدہ ہے کہ فہم اور سرگرمی ہمیشہ ذمہ داری کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ اگر مطلوبہ اعمال و افعال کا فیصلہ کوئی خارجی قوت کر دے اور زیر تربیت لوگوں کو بلا چون و چرا ان طے شدہ افعال اور سرگرمیوں میں سے گذرنا پڑے تو یہ صورت حالات نہ کوئی قابل ذکر فہم پیدا کر سکے گی اور نہ سرگرمی۔ اخلاقی تربیت کے نتائج زیادہ تر نمائشی اور غیر موثر ثابت ہوں گے اور یہ تربیت متوقع نتائج پیدا کرنے سے قاصر رہے گی۔

یہ نفسیاتی اصول اپنی جگہ درست ہے۔ مگر فہم اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ نصاب تربیت طے کر لینے کا کام بھی زیر تربیت کو سونپ دیا جائے۔ البتہ تربیت جس ماحول میں دی جا رہی ہے وہ جمہوری قسم کا ماحول ہونا چاہیے ایسا ماحول جس میں افراد کو رائے ظاہر کرنے کی پوری آزادی ہو اور ان کی رائے کا احترام کیا جائے۔ تاریخ ادیان اس امر کی گواہ ہے کہ جن مذاہب نے اپنے پیروؤں کو خود سوچنے کے مواقع دیے ان کی اخلاقی تربیت بہت موثر ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں اسلام کی مثال کلاسیکی درجہ رکھتی ہے۔ بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق وما ینطق عن الھوا کا فتویٰ دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی قرآن آپ کو وشاورھم فی الامر کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن کی ان

دونوں نصوص پر بیک وقت نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسری نص کا مقصد مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کو مکمل کرنا ہے اور بس. قرآن حکیم اس بنیادی نفسیاتی نکتے سے اچھی طرح واقف ہے کہ معاملات طے کرتے وقت قوم پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالے بغیر اس میں نہ دین کا گہرا فہم پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے دل میں دین اور دینی ضابطہ حیات کے لیے سرگرمی پیدا کی جا سکتی ہے. یہ اس ضابطہ اخلاق کی عملی تربیت کا حال ہے جس میں "اِنَّ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰه" اور من یطع الرسول فقد اطاع اللہ کی صراحت موجود ہے۔

غرض اسلام نے جس اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا وہ ایسے آفاقی اصولوں پر مشتمل تھی جن کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی. مگر یہ تربیت ایسے اجازت دہ جمہوری ماحول میں دی گئی کہ اس نے تربیت پانے والوں کی ساری صلاحیتوں میں کمال درجے کی پختگی اور ہیجان پیدا کر کے انھیں مشیت ایزدی کی تکمیل کی راہ پر لگا دیا. اس اخلاقی تربیت کے نتائج نے تاریخ عالم میں جو اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں. تاہم یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہ تھا بلکہ بیّن اسباب کی پیداوار تھا. اسلام کی اخلاقی تربیت نے جو فقید المثال کامیابی حاصل کی اس کی ایک وجہ آزادی اور مساوات کی وہ روح تھی جو اس تربیت کا سنگ بنیاد تھا. امتداد زمانہ سے جوں جوں یہ روح مٹتی گئی اس اخلاقی تربیت کی تاثیر بھی گھٹتی گئی. اس ضابطۂ اخلاق نے امامت اور رہنمائی کا مقام تقویٰ کے لیے مخصوص کیا تھا. بعد میں یہ مقام نسبت. وراثت اور دوسرے غیر متعلق عناصر کے حوالے ہو کر رہ گیا. "وشاورھم فی الامر" کی جگہ "بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" نے لے لی. پس جس طرح قرون اولیٰ میں اسلامی ضابطۂ اخلاق کی محیر العقول کامیابی واضح اسباب کی رہین منت تھی اسی طرح زمانہ مابعد میں اس کی بے اثری بھی بیّن اسباب کا نتیجہ تھی۔

یہاں تک دینی ضابطہ اخلاق کا ذکر تھا. لادینی ضابطہ اخلاق کی تاثیر اور بے تاثیری کے متعلق بھی یہی اصول کارفرما ہیں. لادینی ضابطہ اخلاق فرد کی وفاداری کو وہ آفاقی وسعت عطا نہیں کر سکتا جو دینی ضابطہ اخلاق کر سکتا ہے. تاہم وہ بھی فرد کو تنگ قسم کی ذاتی خودغرضی سے نجات دلا سکتا ہے

موجودہ دور میں مغربی جمہوریت اور روسی کمیونزم ہر دو کا ضابطہ اخلاق لادینی بنیادوں پر قائم ہے
یہ دونوں اخلاقی ضابطے اپنی اپنی جگہ خوب کامیاب ہیں اور چوں کہ ان کے مقابلے میں کوئی زیادہ آفاقی
ضابطۂ اخلاق عملی شکل میں موجود نہیں، یہ دونوں آج دنیا پر حکمران ہیں۔

مدرسے میں اخلاقی تربیت

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اب یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ مدرسے کی تمام سرگرمیوں کا
نچوڑ وہ اخلاقی تربیت ہے جو وہ اپنے طلبہ کو دیتا ہے۔ تعلیم سے مراد صرف معلومات اور مہارتوں کا
سکھانا نہیں بلکہ پسندیدہ اطوار پیدا کرنا ہے۔ یہ دیکھا جا چکا ہے کہ بعض مخصوص قسم کی حرکات و سکنات
میں سے بار بار گزرنے سے پسندیدہ عادات پیدا نہیں ہو سکتیں۔ عادات کے راسخ ہونے کے لیے
دو شرطیں ضروری ہیں :-

(۱) جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کی علت غائی اچھی طرح سمجھ لی جائے۔

(۲) عمل کو رسمی طور پر نہیں بلکہ دلی سرگرمی سے انجام دیا جائے۔

مدرسے کی عملی زندگی میں ان شرائط کے پورا ہونے کی صورت یہ ہے کہ مدرسے میں جو کچھ کیا جائے
وہ گرد و پیش کی زندگی سے مربوط ہو۔ یہ چیز مدرسے کے لائحہ عمل کو معنی عطا کرے گی اور طلبہ کے دلوں میں سرگرمی
پیدا کرنے کا موجب ہو گی۔ صاف تر الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مدرسے کی تعلیم زندگی سے غیر متعلق نہ ہونی
چاہیے۔ اس کا مقصد ذہن پر ایسی معلومات کا بوجھ لادنا نہ ہو جن کو عملی زندگی میں کوئی براہِ راست افادیت
حاصل نہیں۔ یہ کہنا کہ فلاں فلاں قسم کی معلومات کا اذبر کرنا امتحان پاس کرنے کے لیے ضروری ہے، ان معلومات
کو عملی افادیت عطا نہیں کر دیتا۔ امتحان کی حیثیت ایک خارجی قوت کی ہے اور یہ دیکھا جا چکا ہے کہ کسی
خارجی قوت کے تقاضے خواہ کتنے ہی جابرانہ کیوں نہ ہوں، ظاہری مطابقت اور نمائشی نتائج پیدا کر سکتے ہیں
پسندیدہ سیرت اور کردار پیدا نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ کہ وہ نہ فہم پیدا کرنے کا سامان کر سکتے ہیں نہ دلی سرگرمی
پیدا کرنے کا۔

پس مدرسے کی اخلاقی تربیت مقررہ اسباق کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔ اس کی نوعیت احساس

عام فضا کی ہونی چاہیے جو مدرسے کی تمام سرگرمیوں میں رسی بسی رہی ہو، اور جس سے مدرسے کی زندگی کا کوئی شعبہ خالی نہ ہو۔ اس سلسلے میں دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اخلاق سراپا ایک معاشرتی شے ہے، اخلاق کا تعلق اس رشتے سے ہے جو فرد اور معاشرے کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کی تمام سرگرمیاں خواہ وہ نصابی ہوں یا غیر نصابی زیادہ تر اجتماعی قسم کی سرگرمیاں ہونی چاہئیں۔ یہ سرگرمیاں ایسے اجازت دہ ماحول میں انجام پانی چاہئیں کہ طلبہ جو کچھ کریں اس میں ان کی اپنی ذمہ داری بھی شامل ہو۔ یہ سرگرمیاں انھیں نہ صرف خود سوچنے کی صلاحیت عطا کریں گی، بلکہ انھیں یہ سبق بھی دیں گی کہ وہ دوسروں کے ساتھ اچھے مراسم کس طرح پیدا کرنے اور نباہنے چاہئیں۔

غرض اخلاق کا دائرہ اسی قدر وسیع ہے جس قدر زندگی کا۔ انسانی زندگی ایک اجتماعی مسئلہ ہے اس لیے اخلاق اور اجتماعی زندگی دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ بے شک اخلاقی تربیت کو مدرسے کی کارگزاری کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن اس اہم ذمہ داری کی انجام دہی کی یہ صورت نہیں کہ مدرسہ اخلاق پہ تقریروں یا وعظوں کا اہتمام کر دے یا دینی تعلیم یا اجتماعی عبادت کے لیے اپنے نظم اوقات میں جگہ نکال لے۔ یہ چیزیں اخلاقی تربیت میں مدد دے سکتی ہیں۔ بذات خود اخلاقی تربیت کے مترادف نہیں ہو سکتیں۔

مدرسے کو بجا طور پہ ایک چھوٹا سا معاشرہ کہا گیا ہے۔ مدرسے کو اس وسیع تر معاشرے کا آئینہ ہونا چاہیے جس کے بننے والے شہریوں کی تربیت اس کے سپرد ہے۔ اپنے فرض کی مؤثر بجا آوری کے لیے مدرسے کو نہ صرف اس خلیج کو پاٹنا چاہیے جو اس کے اور وسیع تر معاشرے کے درمیان عموماً حائل رہتی ہے بلکہ اسے یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا نصاب ایسی عملی سرگرمیوں پہ مشتمل ہو جن میں طلبہ کو باہم مل کر کام کرنے کے مواقع ملیں۔ نیز انھیں اس بات کے مواقع بھی ملیں کہ کام کی منصوبہ بندی اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں وہ آزادانہ حصہ لیں۔ جس حد تک یہ مواقع بھرپور ہوں گے اسی حد تک طلبہ اور طالبات زندگی کی حقیقت سے قریب تر ہو جائیں گے، اور اسی حد تک ان کے اخلاق تربیت حاصل کریں گے۔

جو نظام تعلیم مدرسے کے نصاب کو زندگی کی عملی ضرورتوں سے بے تعلق رکھتا ہے وہ اخلاقی تربیت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔ وہ ننھے بچوں اور نوجوان طلبہ اور طالبات کو زندگی کی حقیقت سے یکسر بے خبر

دکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو اس کے قاہر تقاضوں کے مقابلے میں قطعاً بے بس پاتے ہیں۔ وہ ان سے فرار کی راہیں ڈھونڈنے لگتے ہیں، اور حقیقت سے فرار کا دوسرا نام بداخلاقی ہے۔ بس جو نظام تعلیم بچوں کو اپنی ذمہ داری پہ مل جل کر کام کرنے کا ڈھنگ نہیں سکھاتا وہ کسی قابل اعتماد اخلاقی تربیت دینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر مدرسہ کسی ایسے ضابطہ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے جس کی عملی کارفرمائی مدرسے کی زندگی میں نظر نہیں آتی تو اس کا قدرتی نتیجہ اس ضابطہ اخلاق کے خلاف ردِ عمل کی صورت میں نمودار ہوگا۔ بلبتہ طلبہ اسے فرسودہ اور ناقابل عمل سمجھنے لگیں گے۔ ایسی صورت میں اخلاقی تعلیم کا نصاب میں شامل نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا مسئلہ ہمارے نصاب کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ ملک مذہبی قدروں کے نام پہ وجود میں آیا ہے۔ اس چیز کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسے اسلامیہ جمہوریہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں یہ بات ناگزیر ہے کہ مذہبی تعلیم کو نصاب کا لازمی جزو بنایا جائے۔ مگر مذہبی تعلیم اسی صورت میں مؤثر نتائج پیدا کر سکتی ہے جب معاشرے میں مذہبی قدروں کی حقیقی حکم رانی ہو۔ بصورت دیگر یہ تعلیم الٹ قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کا حل ہمیں تلاش کرنا چاہیے ❖

توضیحی سامان

محمد عبدالعزیز

تدریسی مشق میں ایک متعلم مدرس تاریخ کا سبق پڑھانے کے لیے کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے پاس نہ کوئی چارٹ تھا، نہ کوئی خاکہ اور نہ کوئی تصویر۔ پڑھانا تھا، پڑھا دیا۔ طلبہ کی سمجھ میں آیا یا نہیں۔ سبق کے مختلف پہلو واضح ہوئے یا ہنوز مبہم ہیں۔ اس کی طرف نہ اس نے توجہ کی اور نہ توجہ کرنے کی ضرورت سمجھی۔ بڑے اطمینان سے ایک طالب علم کو بلا کر کلاس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ایک کتاب اس بچے کے ہاتھ میں، ایک خود متعلم مدرس کے۔ بچہ کتاب کی عبارت پڑھتا رہا، اور دوسرے طلبہ اپنی اپنی کتابوں میں اسی عبارت پر نظر دوڑاتے رہے۔ کبھی کبھی متعلم مدرس اصلاح تلفظ کے زعم میں ایک آدھ لفظ کے صحیح مخارج کے متعلق ضروری معلومات بہم پہونچاتا جو اکثر غلط ہوتے۔

میں تھوڑی دیر تک دم بخود، اس انوکھے انداز تدریس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ سبق کے اشارات دیکھے۔ طلبہ کے ذہنی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا۔ اور متعلم مدرس کی بے باکی اور اعتماد کی داد دی۔ لیکن جب نہ رہا گیا تو پوچھا کہ اس طریق تدریس سے بچوں کو کیا فائدہ پہونچے گا۔ یہ کتابیں تو ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں، بلکہ بعض ذہین بچوں نے اسے پڑھا بھی ہوگا۔ پھر اس میں لذت و چاشنی اور عمدگی بیان کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے اور ہاں آپ کے پاس توضیحی چارٹ بھی نہیں ہیں۔ میری یہ ان مل اور بے جوڑ تقریر سن کر متعلم مدرس متبسم ہوا، اور کہا کہ میں تو انھیں صحیح نام پڑھانے کی مشق کرا رہا ہوں باقی واقع تو وہ خود پڑھ لیں گے، اور توضیحی چارٹوں کے متعلق یہ گذارش ہے کہ ان کی ضرورت ان مدرسین کو ہوتی ہے جنھیں نہ نفس مضمون پر قدرت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس ایسا وافر ذخیرۂ الفاظ ہوتا ہے کہ وہ اچھے انداز میں اظہار بیان کر سکیں، اور بفضلہ تعالیٰ مجھے اس قسم کی کوئی دقت نہیں۔ میں زیر لب مسکرایا، اور ان کی کاہلی پر تاملقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے" لکھ کر باہر نکل آیا۔

سبق میں توضیحات کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ اگر متعلم مدرس کے بقول یہ محض اچھے انداز بیان کا بدل ہے

ان دونوں میں سے ایک ہی کی تحصیل کی کوشش تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مفید ہوگی۔ ایک ہی قسم کی دو چیزوں پر بے جا وقت اور طاقت صرف کرنا یوں بھی مستحسن نہیں لیکن متعلم مدرس کا مفروضہ درست نہیں۔ توضیحی چارٹوں اور قسموں کی حیثیت اضافی ہے، ایک دوسرے کے بدل کی نہیں۔ جہاں مدرس کی زبان نکات کی تشریح میں رکنے لگتی ہے۔ توضیحات اس کی مشکل کشائی کرتی ہیں، اور سبق کے بعض وہ پہلو جو تقریر کی دھوم دھام میں تشنۂ توضیح رہ جاتے ہیں ان کا ایک ایک نکتہ روشن ہو جاتا ہے۔

انسانی فکر کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مجرد اور دوسرا غیر مجرد۔ ایک ذہین آدمی کا انداز فکر نسبتاً کم ذہین سے مختلف ہوگا اور غبی کی قوت فکر میں تو اس وقت تک ارتعاش نہیں پیدا ہو سکتا جب تک اس کے سامنے مقرون اور ٹھوس چیزیں نہ ہوں وہ انھیں دیکھتا ہے، چھوتا ہے، محسوس کرتا ہے تو فکر کو تحریک ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ذہین آدمی اپنے خیالات کی فضا میں پھرتا رہتا ہے اسے ٹھوس مثالوں کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اس کا فکر مجرد مائل بہ پرواز رہتا ہے۔ اگرچہ ذہین اور غبی کی یہ فکری تقسیم ایک کلیے کی حیثیت نہیں رکھتی لیکن یہ درست ہے کہ ایک ایسا شخص جسے اللہ نے عقل و ذہن کی دولت عطا کی ہے، اس کا تخیل زیادہ بیدار ہوگا اور وہ زیادہ موثر انداز میں سوچ سکے گا۔

تجربات سے ہم جو کچھ سیکھتے ہیں اور جس عمدگی سے سیکھتے ہیں، اسے جدید تعلیم نے تسلیم کر لیا ہے، اور یہ تجربے بالعموم مشاہدی تخیل (Observa tian ul Iwaginati-on) پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا مشاہدے سے فکر کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہمارے سارے تجربے مشاہدی تخیل کے تابع ہوتے ہیں، صحیح نہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ ہمارے بیشتر تجربوں کی اساس ہمارے مشاہدات ہی ہوتے ہیں اسی لیے ثانوی مدارس میں بصری امدادوں کی افادیت اور واضح ہو جاتی ہے۔

بعض سبقوں میں توضیحی چارٹ اتنے ضروری ہو جاتے ہیں کہ صرف الفاظ کی شعبدہ بازی سے بات کی صراحت نہیں ہوتی۔ مثلاً کوہستان نمک کے سبق میں مدرس زمین کی ساخت، پہاڑوں کی بلندی، نالوں کی کثرت وغیرہ کی تشریح میں اپنی ساری قوت صرف کر دے گا۔ لیکن پھر بھی ممکن ہے اس کا

صحیح تصور طلبہ کے ذہنوں میں مرتسم نہ ہو سکے۔ اس کے برعکس اگر اس سلسلے کے بعض ضروری اور مخصوص حصوں کی تصویر دکھا دی جائے تو طلبہ اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکیں گے وہ مدرس کی تقریر سے ممکن نہیں ہے۔ سکر کی جھیل، جل دیے کی شکارگاہ، کھیوڑے اور ڈنڈوت کی کانیں، انہار کی بے آب گیا سطح مرتفع۔ کچی باڑی، ریوڑوں کی نگہداشت اور بعض علاقوں میں قلتِ آب — یہ ہے کوہستان تک جو تشبیہی ہالے سے چل کر دریائے جہلم کے کنارے کنارے کالا باغ تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر یہ سبق تصویروں اور چارٹوں کے ذریعہ پڑھایا جائے تو جو نقوش بچوں کے ذہنوں میں مرتسم ہوں گے، ان مٹ ہوں گے

مغربی ملکوں میں سمعی و بصری امداد کے استعمال نے سبقوں کو دلچسپ اور آسان بنا دیا ہے ہمارے یہاں یا تو ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اور اگر کہیں کوئی انفرادی کوشش ہوتی ہے تو اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ ٹریننگ کالج یا دوسرے تربیتی اداروں میں اگر ان کی افادیت پر زور دیا جاتا ہے تو وہ بھی تمام تر مصنوعی۔ متعلم مدرسین چارٹ اس لیے تیار کرتے ہیں کہ اپنے توضیحی سامان کی چمک دمک سے نگران کو مسحور کر لیں اور وہ اس کے زیر اثر انھیں زیادہ نمبر دے دے۔ اس کی ضرورت اور افادیت کو ملحوظ رکھنے کی بہت کم کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اب کوششیں بھی ہوتی آئی ہیں کہ توضیحی چارٹوں کو تدریس میں استعمال کیا جائے۔

ترقی یافتہ ممالک میں توضیحی چارٹوں کی تعداد اور ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ انھیں تقسیم کر کے علاحدہ علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو تقسیم کی جائے گی اس میں ترمیم و اضافے کی گنجائش رہ جائے گی۔ پھر کیا یہ توضیحات ناقابلِ تقسیم ہیں یا ان کی عمومی تقسیم ہو سکتی ہے۔ جو توضیحی سامان میں استعمال ہوتا ہے، اس کے استعمال کے پیش نظر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کلاس میں استعمال ہوتا ہے۔ یا جو اسکول میں دستیاب ہو سکتا ہے اور دوسرا وہ جس کا اسکول فراہم کیا جانا مشکل ہے۔ تدریس کے لیے کلاس میں جو توضیحی سامان مہیا کیا جا سکتا ہے ان میں تختہ فلم سلائڈ، متحرک فلم۔ نقشے، خاکے۔ چارٹ، تختہ تحریر۔ گلوب، ماڈل، نمونے، میجک لالٹین سامان اور عملی مظاہرے شامل ہیں۔ دوسری قسم کے توضیحی سامان کا تعلق مدرسے کے باہر سے ہے جو عجائب گھر

کارخانوں، تاریخی مقامات، قومی اداروں اور خوش منظر جگہوں کی سیاحت پر مشتمل ہے۔

سامان کے انتخاب کا اصول

کس قسم کا توضیحی سامان کس وقت اور کن حالات میں، استعمال کیا جائے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آسان نہیں۔ بے تکے پن سے اگر بچوں کو صرف تصویریں ہی دکھا دی گئیں تو اس سے تدریس کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ سبق کی نوعیت اور بچوں کے ذہن اور ماحول کے پیش نظر سامان کے انتخاب میں مدرس کو خود اپنی عقل و فراست سے کام لینا ہوگا۔ ممکن ہے ایک چارٹ جو شہری بچوں کے جذبۂ تعلیم کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو، دیہاتی بچے اس سے مرتعش نہ ہو سکیں۔ اسی طرح ایک تصویر دس سال کے بچے کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن پندرہ سال کی عمر کے بچے اس سے متمتع نہ ہو سکیں۔ اس الجھن کے پیش نظر سامان کے انتخاب میں چند اصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

۱۔ **توضیحی امداد کی ضرورت**:۔ توضیحی امداد کی ضرورت کے متعلق مبالغہ ہے کہ مدرس کو ہر وقت اور ہر سبق میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض سبق ایسے ہوتے ہیں جن میں نقشوں، خاکوں اور چارٹوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ صرف چاک، تختۂ تحریر اور مدرس کا ذہن رسا اور اس کی چابک دستی کافی ہوتی ہے جو سبق محض یاد کرنے کے ہیں ان میں بھی توضیحی شکلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کن سبقوں میں امدادی سامان کی ضرورت ہے اور کن سبقوں میں اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے متعلق کوئی اصول اور حتمی بات نہیں کہی جا سکتی مدرس خود ہی اس کی ضرورت اور عدم ضرورت کی تعیین کرتا ہے۔

۔ **سامان کی قیمت**:۔ سمعی و بصری امداد کے سلسلے میں جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا ہے، وہ مادی اصالی ہے۔ ملک اتنا غریب ہے کہ اس قسم کی چیزوں کے لیے پیسہ فراہم کرنا مشکل ہے۔ یہ اعتراضات بہ حالات میں درست ہوتے ہیں لیکن بعض حالات میں ایک قومی جرم۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ انھیں محدود وسائل کے تابع ہم اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ بعض توضیحی سامان یقیناً گراں ہیں جن کے ں ادارے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن بعض اتنے سستے کہ انھیں آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ یا تھوڑی سی نت اور کاوش سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ پروجیکٹر اور فلم سلائڈ کا عام مدارس میں مہیا کیا جانا مشکل ہے لیکن

تصویریں، خاکے، نقشے، گلوب اور اسی قسم کے دوسرے سامان کے اہتمام میں کوئی ایسی قباحت نہیں،
اس کے لیے محض ہمت اور ذوق کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارا سامان بہ یک وقت نہ خرید
جائے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک سال کچھ نقشے اور تصویریں خرید لی جائیں تو دوسرے
سال گلوب اور پھر کچھ رقم اس طرح پس انداز کی جائے کہ پروجیکٹر اور فلم سلائڈ کا بھی انتظام کیا جا سکے۔

۳۔ سامان کی فراہمی :- سامان کی قیمت اور سامان کی فراہمی لازم و ملزوم ہیں۔ جتنی چادر ہوگی
اتنا ہی پاؤں پھیلائے جا سکتے ہیں۔ ایک اسکول میں ایک گلوب ہے اور دوسرا گلوب خریدنا اسکول
کی استطاعت سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں اسکول کا وقت نامہ اس طرح مرتب ہونا چاہیے کہ ایک ہی
گلوب سے سارا اسکول فائدہ اٹھا سکے۔ یا یہ کہ اسکول میں ایک ہال یا ایک آڈیٹوریم ہے۔ اسے
ضرورتاً ایک وقت میں ایک ہی کلاس استعمال کر سکتی ہے۔ اس کے لیے مدرسے کے پروگرام میں معمولی
سی ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ وقت کی بچت :- پرانے طریق تدریس میں توضیحی سامان کی ضرورت نہ تھی۔ تدریس کی
بنیاد تعلیمی تھی۔ مدرس نے پڑھا دیا اور طلبہ نے پڑھ لیا۔ معمولی طریقے میں ایک ایک بات کی توضیح کے لیے
تجربہ کیا جاتا ہے۔ اول الذکر طریقے میں وقت کی بچت ہوتی ہے۔ لیکن موخر الذکر میں زیادہ وقت صرف
ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک توضیحی امداد سبق کے لیے موزوں بلکہ بہت ضروری ہوتی
ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے سبق کے بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں یہ طریقہ
طلبہ کے لیے مفید نہیں ہوتا۔

ہمارا نظام تدریس کچھ ایسے اصولوں پر قائم ہے کہ وقت کی بچت کا خیال ناگزیر ہو جاتا ہے اگر
سبق جدید تدریسی اصولوں کے مطابق پڑھایا جائے، اس کے اہم پہلوؤں کی تشریح کے لیے سمعی و بصری
امداد کا بھی استعمال کیا جائے تو اس سبق کا وقت معینہ پر ختم ہونا مشکل ہے۔ نصاب اور امتحان کی
کشمکش میں مدرس اور متعلم دونوں اس طرح پس جاتے ہیں کہ انھیں سبق کے بعض ضروری نکات کو
نظر انداز کر دینا پڑتا ہے۔ اس کے باوصف توضیحی سامان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے بہر صورت

استعمال کرنا چاہیے، بالخصوص تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے اسباق میں۔

۵۔ **سامان کا موثر ہونا** :- صحیح تعلیم کے لیے صرف مدرس کی کڑک دار آواز ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بعض اور چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک توضیحی سامان کا استعمال ہے۔ تدریس میں توضیحی سامان اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ تدریس کو زیادہ موثر بنایا جا سکے۔ لیکن ہر سامان موثر نہیں ہو سکتا اور نہ ہر سبق میں اس کا استعمال اسے موثر بنا سکتا ہے۔ صحیح توضیحی سامان کا انتخاب مدرس کا کام ہے۔ اور اسے اس میں تفحص اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مثلاً متحرک فلموں میں زندگی اتنی متحرک نہیں ہوتی جتنی دراصل وہ متحرک ہے۔ اس کے بعض گوشوں کی وضاحت کی پھر بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ توضیحی سامان اتنا جاذب ہوتا ہے کہ طلبہ اس کے دیکھنے ہی میں مسحور ہو جاتے ہیں اور اسی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیم کا صحیح مقصد حل نہیں ہوتا بلکہ انکی توجہ بھی منعطف ہو جاتی ہے۔ اور انھیں اصل سبق کی طرف لانے کے لیے مدرس کو از سرِ نو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ایک ہوشیار مدرس کے سامنے یہ سارے امکانات ہوتے ہیں اور وہ طلبہ کے مفاد اور تدریس کے مقصد کے پیش نظر ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

۶۔ **سامان کی افادی مطابقت** :- اسکول کے لیے عمومی طور پر کون سا سامان مفید ہے اور کون سا غیر مفید۔ بعض توضیحی سامان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انھیں ایک سے زیادہ سبق میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور بعض ایسے کہ ان کا عمل محدود ہوتا ہے۔ ایسا سامان جو ایک سے زیادہ سبق میں استعمال کیا جا سکے۔ اسکول کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

۷۔ **سامان کا دوامی ہونا** :- اصولاً یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ سمعی و بصری امدادیں طلبہ کے لیے مفید ہوتی ہیں اور ان کا اہتمام ہر اسکول میں ضروری ہے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جو سامان خریدا جائے وہ دیرپا ہو اور خاصی مدت تک چل سکے۔ یہ نہیں کہ آج خریدا اور پھلجھڑی کی طرح لذت دید کا سامان فراہم کیا اور بس ختم۔ اس کی حیثیت مستقل اور دوامی ہونی چاہیے۔ بعض سامان گراں ہوتے ہیں لیکن ان کی افادیت کو دیکھا جائے تو بالآخر وہ سستے ثابت ہوتے ہیں کہ ان سے طلبہ کی کئی نسلیں متمتع ہو سکیں گی۔

تدریس کی تکنیک

جدید طریق تدریس میں سمعی و بصری امداد کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے اس کی افادیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ جغرافیہ۔ سائنس حتیٰ کہ ادب کی تدریس میں بھی امدادی سامان کی ضرورت ہوتی ہے اور جدید نظریات کا تقاضہ یہی ہے کہ انھیں استعمال بھی کیا جائے۔ لیکن استعمال میں حسن انتخاب کے ساتھ ساتھ طریق استعمال پر بھی نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ سامان کے اس انبار میں ضرورت کی چیزوں کا تلاش کرنا اور پھر انھیں صحیح طور پر استعمال کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر مدرس کو روزانہ، بلکہ دن میں کئی مرتبہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کا صحیح استعمال ہی اس کی تدریس کو دلچسپ، واضح اور نتیجہ خیز بنا سکتا ہے۔

۱۔ **روزمرہ کا منصوبہ :-** مدرسے میں روزانہ ایک مخصوص قسم کا کام ہوتا ہے۔ مختلف مضامین روزانہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ان مضامین کی تدریس میں توضیحی سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مدرسے میں یہ سامان موجود ہے تو اس کے بے ترتیبی سے پڑے رہنے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ عین وقت پر نہ مدرس انھیں ترتیب دے سکتا ہے اور نہ انھیں اپنے مصرف میں لا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہی سامان ترتیب وار رکھا ہو تو حسب ضرورت اس کے استعمال میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔ سائنس کے سبق میں بالخصوص بعض میکانکی آلات کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کی وقت سے پہلے ترتیب ضروری ہے۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھ لینا بھی ضروری ہے کہ یہ میکانکی آلات خراب تو نہیں ہیں، ان کی مشین میں کوئی نقص تو نہیں ہے۔ مظاہرے کے وقت ان کے بے کار ہو جانے کا اندیشہ تو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ امدادی سامان اس ترتیب سے رکھا ہو کہ سبق میں اسے سلسلہ وار استعمال کیا جا سکے۔ مثلاً دل کی حرکت اور دورانِ خون کے سبق میں دل کا ماڈل، فلم اور دورانِ خون کے چارٹ دکھائے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ماڈل کو کھول کر طلبہ کے سامنے دل کے چاروں حصے پیش کیے جائیں۔ اس سے انھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ دل کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے۔ بلکہ اندر سے کھوکھلا ہے اور ان چاروں خانوں میں صاف اور گندہ خون آتا جاتا رہتا ہے۔ دورانِ خون کو فلم کی مدد سے دکھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مختلف چارٹوں سے اس کی مزید توضیح ہو سکتی ہے۔ اب اگر یہ سامان مدرس کے پاس

ترتیب وار نہ رکھا ہو تو وہ اس سلیقے سے اس سبق کو نہیں پڑھا سکے گا کہ اس کی ایک کڑی دوسری کڑی سے منسلک ہو۔

۲۔ **طلبہ کی تیاری** :۔ توضیحی سامان کے استعمال کا مقصد طلبہ کے سامنے سبق کا توضیحی خاکہ پیش کرنا ہوتا ہے کہ اس کے بعض مشکل اور منفرد پہلوؤں کی وضاحت ہو جائے۔ لیکن اگر ان کے استعمال سے گنجلک پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو، یا یہ کہ خود توضیحی سامان کے متعلق بعض توضیحات کی ضرورت ناگزیر ہو تو اس کی افادیت کم ہو جائے گی، اس لیے جو توضیحی سامان استعمال کیا جائے۔ اس کے متعلق استعمال سے پہلے تھوڑی بہت معلومات کا بہم پہونچانا مفید ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ سامان معرف میں لایا جائے طلبہ کو سمجھا دیا جائے کہ اس کا مقصد یہ ہے اور اس کی مدد سے ہم اس کی وضاحت اس طرح کریں گے۔ ماڈل تصویریں نقشے اور خاکے جن میں کوئی ایسی پیچیدگی نہ ہو، ایک دو معمولی اشاروں سے واضح ہو جاتے ہیں لیکن بعض فلموں کی توضیح کے لیے وافر معلومات کا فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً پاکستان کی صنعت کے متعلق سیالکوٹ کے کھیل کی مصنوعات کی فلم دکھانے سے پہلے طلبہ کو یہ بتا دیا جائے کہ کس طرح لکڑی فراہم کی جاتی اور کس طرح یہ لکڑی مختلف عمل سے گذرتی ہوئی ہاکی۔ بلا اور وکٹ بن جاتی ہے۔ یا کس طرح چمڑے سے گیند اور پیڈ تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر سبق کے بعض حصے اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھے ہوں اور اس کی تشریح فلم میں کر دی گئی ہے تو حسب موقع اس کے انوکھے پن کی طرف اشارہ کر دینا مفید ہوتا ہے۔

۳۔ **سامان کی مقصدیت** :۔ جو توضیحی سامان تدریس میں استعمال کیا جائے، اس کا حالات کے مطابق موزوں اور بامقصد ہونا ضروری ہے۔ استعمال برائے استعمال بہت بڑی بھول ہے۔ جو مدرس اور طلبہ دونوں کو بے راہ کر سکتی ہے۔ مثلاً اورنگ زیب کی مہمات دکن ہیں، اس کی سیاسی بصیرت اور عسکری عظمت کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اگر مغلوں کے شجرۂ نسب یا ساموگڑھ کی لڑائی کے چارٹ دکھائے جائیں تو یہ اس سبق سے بے تعلق اور غیر مربوط ہوں گے کہ ان کی بنیاد پر اس کی دکنی حکمت عملی کے کسی گوشے کو روشن نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس دکن کا نقشہ، سلاطین بہمنی کی سیاسی ابتری، مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے متعلق جو چارٹ اور خاکے پیش کیے جائیں گے، ان سے سبق میں جان پیدا کی جا سکتی ہے۔

۴ ۔ **صحیح استعمال** :- ہو سکتا ہے کہ وہ سمعی چارٹوں کی افادیت کے پیش نظر ایک مدرس ان کے کثرت استعمال کو جائز سمجھ لے اور جا و بے جا ، موقع اور بے موقع ان کی نمائش کرے ، یہ ایک صحت مند نظریہ نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں اندیشہ یہ بھی ہے کہ جو توضیحی سامان استعمال کیا جا رہا ہے اس سے سبق میں اور گنجلک پیدا ہو جائے ۔ مقصد تو موضوع کی وضاحت ہوتی ہے ۔ اگر سبق کی تدریس میں یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو ایسے امدادی سامان کو یقیناً کارآمد نہیں کہا جا سکتا ۔ سامان کا ضرورت کے مطابق استعمال ہی صحیح استعمال ہو سکتا ہے ۔ ایک سبق میں بعض اوقات ایک یا دو چارٹ کافی ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایک یا دو سے زیادہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے ۔ مدرس خود سبق کی ضروریات اور بچوں کے ذہنی تقاضوں کے تابع ایسی راہ اختیار کر سکتا ہے کہ افراط و تفریط کا مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے ۔

۵ ۔ **طلبہ کا ردعمل** :- توضیحی سامان کے استعمال کا مقصد طلبہ کے عمل تعلم کو بڑھانا اور اس میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے کہ ان کی مدد سے ان کے بعض مجرد تصورات واضح ہو جائیں ہو سکتا ہے کہ مدرس جس مقصد کے لیے یہ سامان استعمال کرتا ہے پورا نہ ہو ۔ طلبہ اس کی طرف توجہ ہی نہ کریں اور اگر کریں تو ایسے اکھڑے اکھڑے کہ اس سے وہ خود کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکیں ، یا یہ بھی ممکن ہے کہ طلبہ سکون و اطمینان سے ایک متحرک فلم دیکھتے رہیں ۔ اس کے عمدہ مناظر اور بعض دلچسپ سین انھیں یاد رہ جائیں ، لیکن غور و فکر کرنے کی بجائے اس پر سرسری سی نگاہ دوڑا کر کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں ۔ اس ان توضیحات کی عملی افادیت ختم ہو جاتی ہے ۔

اس ضمن میں طلبہ کے ردعمل کا مطالعہ ضروری ہے ۔ آیا ایک تصویر یا چارٹ ، یا فلم انھیں آمادہ کار کر سکی ہے یا نہیں ۔ یا ان کے ذہن میں اس حد تک ارتعاش پیدا کیا جا سکا ہے کہ وہ اس سے قرار واقعی فائدہ اٹھا سکیں ، اور اگر ان کی خاموشی عدم تفہیم کی غمازی کرتی ہے تو اس جگہ تدریس توقف کی ضرورت ہے ۔ ایسا کیوں ہوا ، یہ سامان کے انتخاب کی غلطی ہے ۔ یا تدریس میں ان کا صحیح استعمال نہیں ہو سکا ۔ دونوں صورتوں میں طلبہ کے ردعمل کو دیکھنا اور اس کے مطابق اس میں ترمیم کرنا ، ضروری ہے کہ تدریس کا صحیح طریق یہی ہے ۔

۶) **توضیحی سامان کا سب کو نظر آنا:**۔ ایک کلاس میں بالعموم ۳۵ سے ۴۰ طالب علم ہوتے
ہیں، لیکن ہمارے ملک کے حالات اس قسم کے ہیں کہ بیشتر اسکولوں میں ایک کلاس میں یہی تعداد ۱۰۰
اور بعض حالات میں ۱۵۰ ہوتی ہے۔ اتنی بڑی جماعت میں جو چارٹ یا خاکہ طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے
اتنا بڑا ہو کہ آخری نشستوں پر بیٹھنے والے طلبہ بھی اسے دیکھ سکیں۔ سو اور ڈیڑھ سو کی تعداد غیر معمولی
ہے، اور چوں کہ اصولاً غلط ہے، اس لیے اس کے مطابق توضیحی سامان کا بھی کوئی سائز مقرر نہیں کیا جا سکتا
چالیس کی تعداد مناسب ہے۔ اس کے لیے اس قسم کا سامان تیار کیا جا سکتا ہے کہ ہر طالب علم اس سے فائدہ
اٹھا سکے۔ یہ سامان نمایاں، واضح اور صاف ستھرا ہو، اور جو عبارت ہو، ایسے جلی حروف میں لکھی گئی ہو کہ
اس کے پڑھنے میں پچھلی نشست والوں کو بھی دقت نہ ہو۔ مثلاً گلوب اگر اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں ملکوں
کی حدود بھی نظر نہ آتی ہوں، تو گلوب کا میز پر رکھا ہونا اور مدرس کا اسے گھما گھما کر دکھانا ایسا ہی ہے جیسے
پتنگ کا شش پہلو ستارہ، جو معمولی سی لکڑی میں ایک چھوٹی سی چرخی پر نصب ہوتا ہے اور بچے اسے
دھاگے کی مدد سے ہوا میں اس تیزی سے لہراتے رہتے ہیں کہ اس کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

۷) **مختلف النوع سامان کا استعمال:**۔ ایک سبق کی تدریس میں اگر ایک ہی قسم کا سامان
استعمال کیا جائے تو اس کا ذہن پر ایک عجیب سا بار پڑتا ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے اور بعض اوقات
سبق سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تدریس کی بہت بڑی خامی ہے اور توضیحی سامان کے استعمال کا
بہت بڑا نقص۔ ایسی صورت میں مدرس کی فراست ہی اس کے کام آسکتی ہے۔ ایک سبق میں جو سامان
تدریس استعمال کیا جائے، اس کی نوعیت ایک نہ ہو، بلکہ مختلف ہو۔ خاکے، نقشے، چارٹ، فلم سلائڈ وغیرہ
مغربی ملکوں میں ہر مدرسے کے پاس مختلف قسم کا سامان ہوتا ہے، جسے مدرس استعمال کر سکتا ہے
اور بعض سامان کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جو ایک باذوق مدرس ہی فراہم کر سکتا ہے، اور اس میں مشرق و مغرب
کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہینڈن ٹکنیکل کالج، لندن میں تاریخ کا ایک سبق دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چارلس اول
اور خانہ جنگی، چند چارٹ مدرس کے اپنے تیار کردہ تھے۔ کچھ فلم سلائڈ تھیں، کچھ توضیحی نقشے تھے اور چند
معروف شخصیتوں کی تصویریں۔ سبق پڑھاتے وقت مدرس نے اپنے اس سامان کو اس طرح استعمال کیا کہ

جنگی کا مکمل نقشہ طلبہ کے سامنے تھا۔ جہاں مزید زبانی توضیح کی ضرورت ہوتی تو مدرس سادے سادے
ود میں حالات کی تشریح کر دیتا۔

میں نے یہ سبق تمام و کمال دیکھا۔ جی چاہتا تھا کہ ختم نہ ہو۔ طلبہ کی محویت کا یہ عالم کہ انتہائی
انہماک سے کام کرتے رہے۔ انھیں متحرک رکھنے کے لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مدرس ان سے دو چار
سوال بھی پوچھ لیتا ۔ اور یہ سلسلہ تا دیر جاری رہا۔

تعلّم

ڈاکٹر عبدالرؤف

تجربہ اور تربیت کے ذریعہ سے انسانی فکر اور کردار میں مختلف اور متنوع تغیرات رونما ہوتے ہیں یہ تغیرات انسان میں عادات و اطوار۔ رجحانات۔ مہارت و کمال۔ علم و ہنر۔ سمجھ بوجھ اور بصیرت وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان تمام تغیرات کے پیدا ہونے کے عمل کو تعلّم، آموزش، یا سیکھنا کہتے ہیں۔

تعلم محض درسی تعلیم تک ہی محدود نہیں ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ میں تجربہ اور تربیت کی وجہ سے کسی قسم کے تغیر رونما ہونے کو تعلّم کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلّم محض تغیر کا رونما ہونا یا کچھ سیکھنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس جامع تصوّر میں سیکھے ہوئے مواد کا روزمرّہ زندگی میں بروئے کار لانا بھی شامل ہے، ایک شخص نے متعدد کتابیں پڑھی ہوں یا چند ایک ہنر سیکھ رکھے ہوں وہ اُس وقت تک تعلیم یافتہ قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک وہ اپنے علم و ہنر کو زندگی میں بروئے کار نہ لائے۔

تعلّم کی بنیادی خصوصیات

تعلّم کے بنیادی اجزا دو ہیں (۱) شعور ——— (۲) قوّتیت

تعلّم ایک شعوری عمل ہے۔ تجربہ اور تربیت کی بنا پر جو تغیرات متعلّم میں رونما ہو رہے ہوں متعلّم کے لیے ان کا شعور رکھنا، یعنی ان سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ مثلاً کمرۂ جماعت میں پڑھتے ہوئے طالب علم کا عمل شعوری ہے۔ اگر طالب علم جماعت کے درس و تدریس کی طرف شعوری طور پر متوجہ نہ ہو تو اس کا عمل تعلّم نہیں کہلا سکتا۔

تعلّم ایک قوتیاتی یا حرکیاتی تصور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلّم شدہ مواد متعلّم کی شخصیت کا ایک متحرک حصّہ اور زندگی کا جو دائنیمک بن جاتا ہے۔ کوئی بھی سیکھی ہوئی بات سیکھنے والے فرد کی شخصیت میں بے جان مردہ اور غیر متحرک صورت میں نہیں رہ سکتی۔ ہر تعلّم شدہ بات زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں کسی نہ کسی صورت

ضرور نمودار ہوتی ہے۔ تعلم سے متعلم کی زندگی میں طرح طرح کے تغیر، ترمیم و اصلاح وغیرہ رونما ہوتے ہیں، بلکہ اس سے ان لوگوں کی شخصیت پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے جو متعلم سے ارتباط میں آتے ہیں۔

یہ جانچنے کے لیے کہ کسی فرد کی زندگی میں تعلم واقعی طور پر اثر انداز ہوا ہے یا نہیں۔ ماہرین تعلیم نے پیمائش کے مختلف طریقے وضع کیے ہیں جنھیں عام اصطلاح میں امتحان کہا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے امتحان اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ متعلم نے تعلم سے کس حد تک استفادہ کیا ہے۔ مدرسوں میں مختلف مضامین کے امتحانات منعقد کرنے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ بچوں نے ان مضامین میں کیا کچھ سیکھا ہے۔

تعلم کے عناصر

تعلم کے عمل پر متعدد عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اساتذہ اور والدین اور خود طلبہ کے لیے ان عناصر کا علم بہت ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ چند اہم عناصر جو تعلم پر اثر اندازی کرتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) آمادگی (۲) دل چسپی (۳) مشق (۴) تکان اور بوریت
(۵) ذہانت (۶) جذبات (۷) خاندان اور تمدن (۸) عمل اور تکمیل۔

تعلم اور آمادگی

جب تک بچہ تعلم کے لیے آمادہ یعنی تیار نہ ہو کوئی تعلیم اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ مختلف طلبہ میں آمادگی کی صلاحیت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ آمادگی میں ان انفرادی اختلافات کے لیے متعدد اسباب ذمہ دار ہیں۔ جسمانی، معاشرتی اور جذباتی نشو و نما، تجربہ وغیرہ کو اس سمت میں کافی دخل ہے۔

آمادگی کے عمل کی سمجھ بوجھ سے معلم کو درس و تدریس میں بہت مدد ملتی ہے۔ بچوں میں آمادگی کے علم سے معلم مندرجہ ذیل فوائد حاصل کر سکتا ہے:۔

(ا) مختلف طلبہ میں آمادگی کے معیار کے علم کی وجہ سے معلم اپنے طریق تدریس میں ہر قسم کے طلبہ کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

(ب) وہ ان میں آمادگی بڑھانے کے لیے موثر طریقے اختیار کر سکتا ہے

(ج) وہ اُن طلبہ کو مدرسہ کے تعلیمی مشاغل میں مناسب شرکت کے لیے آمادہ کرسکتا ہے جن پر مُردنی اور بےحسی سی چھائی رہتی ہو، اور جو کسی قسم کے تعلم کے لیے قطعی آمادہ نظر نہ آتے ہوں۔

تعلم اور دل چسپی

تعلم میں دل چسپی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اگر طلبہ مدرسہ کے تعلیمی مشاغل میں دل چسپی محسوس کریں تو وہ کافی کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس پڑھائی میں عدم دل چسپی، بھسڈی پن، بگھوڑا پن، غلط معاشرت اور مجرمانہ مشاغل کی صورت نمودار ہوسکتی ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ ہر سبق میں زیادہ سے زیادہ دل چسپی کے سامان مہیا کرنے کی کوشش کرے۔ تاکہ بچے تعلم کے عمل سے بخوبی مستفیض ہوسکیں۔

تعلم میں بچوں کی دل چسپی پیدا کرنے کے لیے معلم کو مندرجہ ذیل امور کی اہمیت کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے :-

(ا) دل چسپ طریق تدریس (ب) بامقصد درس و تدریس (ج) طلبہ کی شارکت

اگر طریق تدریس دل چسپ ہو یعنی معلم دل چسپ مثالوں، نقشوں، تصویروں اور جدید بصری اعانتوں کی مدد سے مواد کو آسان، جاذب اور مربوط انداز میں پیش کرے تو اس میں طلبہ کی دل چسپی بہت بڑھ جاتی ہے۔

طلبہ جب یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کی تعلیم و تدریس کا کوئی دل چسپ، واضح اور قابل حصول مقصد بھی ہے تو بھی اس میں ان کی دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم کا منصوبی طریقہ اس امر کو بہت اچھی طرح پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی تعلیم جس کا کوئی مقصد ہی نظر نہ آتا ہو، طلبہ کی فطری دل چسپی کا باعث نہیں بن سکتی۔

درس و تدریس ایک گورکن وعظ کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کمرۂ جماعت میں فقط معلم ہی بولتا ہو اور باقی سب بچے سُنتے رہنے پر مجبور کردیے جاتے ہوں تو بھی ایسی پڑھائی میں طلبہ کی دل چسپی گھٹ جاتی ہے۔ جماعت کا عمومی ماحول خوش گوار اور درس و تدریس ایسے رفیقانہ انداز میں ہونی چاہیے کہ بچے معلم سے سوال و جواب، بحث و تمحیص وغیرہ کے لیے فطری رغبت محسوس کریں اور معلم بھی جماعت کے مشاغل میں بچوں کی مسلسل شمولیت کو درس و تدریس کا ایک ضروری جزو خیال کرے۔ اس قسم کے خوش گوار تعلیمی ماحول میں

بچوں کی دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے اور ان کے تعلم کی رفتار اور نوعیت بہت ترقی کر جاتی ہے ۔

تعلم اور مشق

آسان فہم مواد تو عموماً بغیر کسی دقت کے سمجھ آ جاتا ہے اور آسانی سے یاد بھی ہو جاتا ہے۔ مگر مشکل مواد کے لیے مشق اور تکرار کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مختلف قسم کے مشکل مواد کے لیے تکرار اور مشق کی مختلف نوعیت اور مقدار درکار ہے۔ مشق کو تعلم میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اکثر اوقات اچھی طرح سمجھی ہوئی باتیں بھی طلبہ اس لیے بھول جاتے ہیں کہ ان کو باقاعدہ مشق کے مواقع میسر نہیں آئے تھے۔

مشق کا مطلب مواد کو طوطے کی طرح رٹنا نہیں ہے۔ مشق سے مراد کسی مواد کو اچھی طرح سمجھ کر اسے بار بار دہرانا ہے۔ تاکہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ ہمارے اکثر مدرسوں میں مشق کے تصور کو بہت غلط سمجھا گیا ہے۔ اکثر حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ مواد خواہ طلبہ کو سمجھ آئے یا نہ آئے وہ اس کی برابر رٹائی کیے جاتے ہیں۔ اس سے تعلم کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ طلبہ کی ذہنی صحت پر بھی اس قسم کی رٹائی کا بہت ناگوار اثر پڑتا ہے۔ یہ امر نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ ہمارا مروجہ نظام امتحان رٹائی کے اس مریضانہ طریق کو ختم کرنے کی بجائے اس کی ترویج کرتا ہے۔ ہماری تعلیم کا یہ پہلو ماہر تعلیمات کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے ۔

تعلم میں تکان اور بوریت کا دخل

تعلم میں تکان اور بوریت بھی بہت اہم حصہ لیتے ہیں۔ تھکی ہوئی حالت میں تعلم کی اثر پذیری بہت گھٹ جاتی ہے۔ اسی طرح بوریت کے عالم میں بھی کچھ لکھا پڑھا نہیں جا سکتا۔ تکان اور بوریت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر ذہن اور جسمانی صلاحیت میں فی الواقع کمی آ جانے سے رونما ہوتی ہے اور آخر الذکر کسی عمل سے نفرت یا بیزاری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں تعلم پر ناگوار اثر ڈالنے میں تکان کی بجائے بوریت زیادہ نمایاں حصہ لیتی ہے۔ تکان اور بوریت کے چند اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں :-

(ا) تعلیم و تدریس کے ناقص طریقے

(ب) مدرسہ کا ناقص طبعی ماحول ۔

(ج) متعلم کی ناسازگار جسمانی یا ذہنی کیفیات

(د) متعلّم کی ناساز گار جذباتی زندگی

معلّم اور متعلّم دونوں کے لیے ان سب اسباب کو سمجھنے اور ان کے مناسب حل کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ تعلّم کی فضا سے ہیجان اور بوریت کے عناصر کو حتی الوسع دور رکھا جا سکے۔

ذہانت اور تعلّم

تعلّم کا دار و مدار بیشتر بچوں کے معیار ذہانت پر مبنی ہے۔ مندرجہ ذیل قسم کے مختلف ذہانتوں کے بچوں پر تعلّم کا اثر مختلف ہوتا ہے۔

(۱) ادنیٰ ذہانت کے بچے (۲) متوسط ذہانت کے بچے (۳) اعلیٰ ذہانت کے بچے (۴) فطین بچے۔

ادنیٰ ذہانت کے گروہ میں وہ تمام بچے آجاتے ہیں جن کی مقیاس ذہانت صفر سے ۸۹ تک ہوتی ہے اس گروہ میں ذیل کی پانچ اقسام کے بچے ہیں۔

(i) مخبوط العقل بچے جن کی ذہانت صفر سے ۱۹ تک ہوتی ہے۔

(ii) فاترالعقل بچے جن کی ذہانت ۲۰ سے ۴۹ تک ہوتی ہے۔

(iii) ضعیف العقل بچے جن کی ذہانت ۵۰ سے ۶۹ تک ہوتی ہے۔

(iv) احمق بچے جن کی ذہانت ۷۰ سے ۷۹ تک ہوتی ہے۔

(v) کند ذہن بچے جن کی ذہانت ۸۰ سے ۸۹ تک ہوتی ہے۔

ادنیٰ ذہانت کی مذکورہ بالا اقسام میں سے پہلی تین قسمیں ایسے بچوں کی ہیں جو کسی قسم کے تعلّم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

مخبوط العقل بچے بہت نایاب ہیں۔ اس قسم کے بچے اس قدر کم عقل ہوتے ہیں کہ انھیں قطعی کچھ بھی لکھایا پڑھایا نہیں جا سکتا۔ فاترالعقل بچے تھوڑا بہت سیکھ سکتے ہیں۔ مگر انھیں پڑھائی، ہجے کرنا اور ریاضی وغیرہ سکھانا ناممکن ہے۔ ضعیف العقل بچوں کو مسلسل محنت اور انفرادی توجہ سے آسان آسان باتیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ احمق بچے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انھیں اسی قسم کے بچوں کے خصوصی اداروں میں تعلیم دی جائے۔ کند ذہن بچے عام مدرسوں کی تعلیم سے اسی صورت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب معلّم

انھیں باقی بچوں کی نسبت آسان آسان کام کرنے کو دیے اور ان کی طرف خصوصی توجہ دیتا ہے ۔

متوسط ذہانت کے بچوں کی مقیاس ذہانت ۹۰ سے ۱۰۹ کے درمیان ہوتی ہے۔ یعنی اس گروہ کے بچوں کی اوسط مقیاس ذہانت ۱۰۰ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس قسم کے بچے مدرسے کی تعلیم سے کافی تسلی بخش استفادہ کرتے ہیں۔ انھیں فقط پڑھائی کے چند غیر اہم پہلوؤں سے متعلق ہی دقت پیش آتی ہے۔ معلّم کی مناسب توجہ اور رہنمائی سے وہ اپنی اکثر تعلیمی مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اعلیٰ ذہانت کے بچوں کی مقیاس ذہانت ۱۱۰ اور ۱۱۹ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس قسم کے بچے معلّم کی مسلسل رہنمائی اور دیکھ بھال کے بغیر بھی تعلّم سے کافی نمایاں استفادہ کر لیتے ہیں۔ ۱۲۰ اور ۱۳۹ کے درمیان ذہانت والے بچوں کو ذہین اعلیٰ کہتے ہیں۔ ان بچوں میں غیر معمولی خود اعتمادی، تخلیقی استعداد اور غور و فکر ہوتا ہے۔ وہ مدرسہ کی پڑھائی کے مشکل سے مشکل امور بھی آسانی سے اور بہت جلد سمجھ لیتے ہیں۔

فطین بچوں کی مقیاس ذہانت ۱۴۰ یا اس سے اوپر ہوتی ہے۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق فطین بچوں کو ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے شروع بچپن ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ایسے بچوں کی چند موٹی موٹی نشانیاں درج ذیل ہیں -

(ا) غیر معمولی علمی تجسّس

(ب) غیر معمولی قوتِ مشاہدہ

(ج) غیر معمولی واقفیتِ عامہ

(د) مطالعہ کا بے حد شدید شوق

فطین بچے اپنی علمی اور تمدنی صلاحیتوں کی وجہ سے لوگوں کو ابتدائی عمر ہی سے متاثر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جوان ہو کر یہی بچے زندگی کے مختلف شعبوں میں قائد بنتے ہیں اور سارا معاشرہ ان کے تخلیقی فکر و عمل سے مستفید ہوتا ہے۔

ذہانت اور تعلّم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی ذہانت کا جائزہ لیں۔ اور انھیں ان کی ذہانت کے عین مناسب تعلیمی کام دیں۔ تاکہ وہ تعلیمی مشاغل سے حتی المقدور استفادہ

کرکے معاشرے کے مفید افراد بن سکیں۔

تعلم اور جذبات

خوش گوار اور سازگار جذباتی کیفیات تعلّم کے عمل میں بہت ممد ثابت ہوتی ہیں۔ فرحت مسرت اور طمانیت سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ناسازگار جذباتی عناصر سے تعلّم پر بہت غیر مناسب اثر پڑتا ہے۔ نفسیاتی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جذباتی کھچاؤ، تناؤ، اضطراب پریشانیاں وغیرہ تعلّم کی اثر پذیری کو فنا کر دیتی ہیں۔

بچوں کی جذباتی زندگی کو برانگیختہ کرنے اور تعلّم پر غیر خوشگوار اثر ڈالنے والے چند عناصر درج ذیل ہیں۔

(۱) حسرتیں: ناتمام خواہشیں۔ ولولے اور جذبے۔

(۲) بچوں کے والدین کا بے جا لاڈ پیار۔ یا تغافل شعاری۔

(۳) ناسازگار گھریلو حالات۔

(۴) احساس کمتری اور محرومیت

(۵) مدرسہ کی زندگی میں سابقہ ناکامیوں کا خیال۔

(۶) اساتذہ اور ہمجولیوں کی تضحیک و تحقیر۔

اساتذہ اور والدین کو جذباتی زندگی کے ان ناتمام ناسازگار عناصر کو سمجھنے اور ان کا مناسب حل ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بچوں کی جذباتی تعلیم و تربیت اور بروقت رہنمائی سے ان کے تعلّم کی استعداد میں بہت ترقی ہوتی ہے۔

خاندان اور تمدن

تعلّم میں بچوں کے خاندانی حالات اور تمدنی عناصر کو بھی بہت دخل ہے۔ بچوں سے متعلق والدین کے تعلیمی عزائم کا بچوں کے تعلّم پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مختلف اقتصادی اور معاشرتی معیار کے خاندانوں میں بچوں سے متعلق والدین کے تعلیمی عزائم مختلف ہوتے ہیں۔ غریب گھرانوں میں روٹی اور بقاءِ حیات کا مسئلہ

اس قدر شدید ہوتا ہے کہ تعلیم تو درکنار بچوں کو پیٹ بھر کھانا بھی میسر نہیں آتا۔ اس لیے افلاس زدہ گھرانوں کے بچے مدرسہ اور اس کے تعلیمی مشاغل کی نعمتوں سے اکثر محروم رہتے ہیں۔

متوسط خاندانوں میں والدین کی عموماً یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اس قسم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، جو انھیں جلد از جلد اعلیٰ منصب پر پہنچا دے۔ چناں چہ اکثر متوسط گھرانوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال جنوں انگیز حد تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ کتاب زدہ، سکون نا آشنا، مضطرب، اور متوحش قسم کے بچے اکثر متوسط طبقہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بالائی طبقہ کے والدین خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے بچے عام بچوں سے الگ تھلگ رہیں اور اس قسم کے خصوصی اداروں میں تعلیم حاصل کریں، جہاں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ ان کے احساس برتری کی پوری تشفی بھی ہوتی ہو۔ گھر کی ناز و نعمت بھری زندگی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا مخصوص ماحول بسا اوقات ایسے طلبہ میں محنت سے نفرت اور عیش و عشرت کی چاٹ پیدا کر دیتا ہے جس سے ان میں تعلّم کی اثر پذیری بہت کم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تمدنی عناصر بھی بچوں کے تعلم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تمدنی اقدار و معیار ہر خطے اور ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی عام زندگی اور ادارے اس کے تمدن کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ صنعتی تمدن میکانکی اور صنعتی اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ ایسے تمدن میں بچوں کو سائنس، انجینئری اور مشینی کاموں میں کمال پیدا کرنے کی رغبت ہوتی ہے۔ زراعتی تمدن میں نظام تعلیم کھیتی باڑی اور کاشت کاری کے فنون کو اہمیت دیتا ہے۔ ہر ملک میں بچے اپنے مخصوص تمدن کی پسندیدہ اقدار میں کسی نہ کسی طرح ضرور رنگ جاتے ہیں۔

تمدن کے فلسفیانہ عناصر بھی بچوں کے تعلم کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ جمہوری تمدن میں بچے مساوات، عدل، خود مختاری اور آزادی فکر و عمل کی قدروں سے روشناس ہوتے ہیں۔ آمرانہ یا جاگیری تمدن میں بچے استبداد اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے معیار و اقدار پاتے ہیں۔

تعلم میں کھیل اور کام کا مقام | بچے فطری طور پر حرکت، عمل اور کھیل کو پسند کرتے ہیں

لیا مدرسہ جس میں معلم پیریڈ کے اوّل سے آخر تک بولتا رہے اور بچوں کو عمل اور کھیل کود کا کوئی موقع نہ دے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

تعلیم کے جدید طریقے عمل اور کھیل کود کو مقدم اہمیت دیتے ہیں۔ یہ طریقے کام کاج اور کھیل کود کے ذریعہ بچوں کو ہر قسم کے مضامین نہایت خوش گوار اور آسان انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسیاتی تجربوں اور تحقیقوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تعلیم کے ان عملی اور تفریحی طریقوں سے بچے جو باتیں سیکھتے ہیں وہ زیادہ دیر تک یاد بھی رکھتے ہیں اور زندگی بھر ان سے عملی فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔

ان جدید تدریسی طریقوں کی مختلف اقسام یہ ہیں :-

منصوبی طریقہ۔ انکشافی طریقہ۔ ڈالٹن پلان۔ مانٹسوری طریقہ۔ ڈرامائی طریقہ وغیرہ۔

تعلّم انسانی اور حیوانی

تعلّم کی صلاحیت انسان ہی کا خاصہ نہیں ہے۔ جانوروں میں بھی تعلّم کی تھوڑی بہت صلاحیت ضرور موجود ہوتی ہے۔ جانوروں میں تعلّم مشاہدہ کرنے کے لیے متعدد نفسیاتی تجربے کیے گئے ہیں۔ یہ تجربے عموماً سفید چوہوں اور بندروں پر ہوئے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ لنگوروں کا انسانی تعلّم سے بہت مشابہ ہے۔

بہرکیف انسانی تعلّم کو حیوانی تعلّم پر مجموعی طور پر فوقیت حاصل ہے۔ جانوروں کے مقابلہ میں انسانی تعلّم کی چند امتیازی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بہتر قوت مشاہدہ

(۲) بہتر طریق تعلّم

(۳) زبان کا فائدہ

(۴) قوت تخیلہ کا استعمال

انسانوں کی قوت مشاہدہ جانوروں کی نسبت بہت قوی، شدید اور جامع ہے۔ بہتر قوت مشاہدہ تعلّم میں بہت ممد ثابت ہوتی ہے۔ انسانوں کا طریق تعلّم بھی جانوروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ کسی بات کو

سیکھتے وقت انسان تکرار، مشق، غور و فکر، تجزیہ، مقابلہ اور موازنہ ضبط و تحمل وغیرہ سے کام لیتا ہے جانوروں کے طریق تعلم یہ مخصوص انسانی محاسن موجود نہیں ہو سکتے۔ زبان کے استعمال کی وجہ سے بھی انسانی تعلّم جانوروں کے تعلم پر فضیلت رکھتا ہے

اسی طرح قوت تخیلہ کا استعمال بھی تعلّم میں انسان کی بہت بیش بہا معاونت کرتا ہے۔ افراد اور اشیاء کی عدم موجودگی اور واقعات و حوادث کے عمل وقوع سے پہلے اور بعد میں بھی انسان ان سے متعلق سوچ بچار کر سکتا ہے۔ مگر حیوان اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ اس لیے ان کے تعلم کا عمل اس اعتبار سے بھی انسانی تعلم سے بدرجہا ادنیٰ ہے۔

ایک سمندری خندق کی سیاحت

شاہد اشرف

اتفاقیہ دریافت

بحرِ اوقیانوس کی طوفانی لہروں نے ایک تلاطم برپا کر رکھا تھا۔ زور کی آندھی چل رہی تھی۔ "کالیپسو" نامی سیاحتی جہاز کو مغربی افریقہ کے ساحل سے چلے تین روز گذر چکے تھے اور اب وہ بحرِ اوقیانوس کے وسط میں تھا۔ تھوڑی دیر میں جہاز رُک گیا۔ اس نے اپنا لنگر گرایا۔ چھوٹی انگلی برابر موٹی نائلون کی رسّی کے ساتھ بندھا ہوا لنگر اوقیانوس کی برف کی سی سرد تہ پر جا ٹکا۔ لنگر کی پتلی رسّی سمندر کے سرد فرش سے تقریباً پانچ میل اوپر "کالیپسو" کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ اور یہ جہاز طوفانی لہروں پر یوں ناچ رہا تھا جیسے کنول کا کوئی پھول تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ محوِ رقص ہو۔ "کالیپسو" اس جگہ اس لیے لنگر انداز ہوا تھا کہ کیمرے کی مدد سے بحرِ اوقیانوس کے اس غیر معمولی گہرے گڑھے کے راز معلوم کرے۔ اس گڑھے کی اوسط گہرائی ۲۵۳۵۴ فٹ ہے۔ کیمرے کی عقابی نگاہ اب تک سمندر کے سینے کو اتنی گہرائی تک نہ چیر سکی تھی۔ "کالیپسو" یہ عزم لے کر روانہ ہوا تھا کہ اوقیانوس کی اس چکرا دینے والی گہرائی کے خدوخال انسانی نگاہ کے سامنے پیش کرے۔

اوقیانوس کے اس خوفناک گڑھے کا علم ۱۸۸۳ء تک کسی کو نہ تھا۔ اس سال فرانس کا سیاحتی جہاز "لاروماننسی" ادھر آنکلا اور دنیا کو پہلی بار یہ علم ہوا کہ اوسط اقیانوس میں ایک بے حد گہری خندق موجود ہے جس کی چوڑائی چند میل سے زیادہ نہیں۔ بعد میں دوسرے جہازیوں نے اس خندق کا رُخ کیا۔ مگر خطِ استوا کو بادلوں کی جو چادر مستقل طور پر لپیٹے رہتی ہے، اس کے سبب جہاز رانوں کو اس خندق کا سراغ لگانے میں ہمیشہ مشکلات پیش آئیں۔

گہرائی کی پیمائش | سائنس نے انسان کو جو عجیب و غریب آلے عطا کیے ہیں ان میں سے ایک

سمندری گہرائی ناپنے والا آلہ بھی ہے۔ یہ آلہ جہاز کے ایک خاص کمرے میں نصب ہوتا ہے جسے "چارٹ روم" پکارا جاتا ہے۔ جب جہاز سمندر کی آبی چادر کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے سمندر کے فرش سے اٹھنے والی آواز کی لہریں اس کے پیندے کے ساتھ ٹکراتی ہیں۔ گہرائی ناپنے والا آلہ ان لہروں سے متاثر ہوتا ہے اور ایک پردے پر سمندری گہرائی کا گراف تیار کرتا چلا جاتا ہے۔ گراف پر ایک نگاہ ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ جہاز کس قسم کی سمندری تہ پر سے گذر کر آیا ہے۔ آیا اس کی آبی گذرگاہ کے نیچے کا فرش بالکل ہموار میدان تھا یا نشیب و فراز سے بھرا ہوا تھا۔ گراف سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آیا جہاز زیادہ گہرے پانی کی طرف بڑھ رہا ہے یا کم گہرے پانی کی طرف۔

تاریخ جہازرانی کا تجربہ

۲۹ جولائی ۱۹۵۶ء کو جب "کالپسو" نے ۲۵۰۰۰ فٹ گہرے سمندر میں لنگر گرایا تو اس نے تاریخ جہازرانی میں ایک نئے سنگ میل کا اضافہ کیا۔ اس سے پہلے کوئی جہاز اتنے گہرے سمندر میں کبھی لنگر انداز نہ ہوا تھا۔ ۳۶۰ ٹن بھاری جہاز کو ایک پتلی سی رسّی کے ساتھ پانچ ساڑھے پانچ میل کے فاصلہ سے تھامے رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ "کالپسو" کے اس کارنامے کا اندازہ کچھ جہازران ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے کوئی سال بھر پہلے جب یونان کے ساحل سے ذرا ہٹ کر ایک دخانی کشتی چودہ ہزار فٹ گہرے پانی میں لنگر انداز ہوئی تھی تو مقامی ملاحوں میں اس خبر سے سنسنی پھیل گئی تھی۔

اس فرانسیسی جہاز کے نام کی مناسبت سے جو ۱۸۸۳ء میں اوقیانوس کے اس خوفناک گڑھے میں آنکلا تھا اس کا نام "رومانش خندق" پڑ گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں اس کے حالات معلوم کرنے کا منصوبہ امریکہ کی نیشنل جیاگرافیکل سوسائٹی، فرانس کی وزارت تعلیم اور پیرس کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری نے مل کر تیار کیا تھا۔ کالپسو ایک فرانسیسی جہاز تھا۔ رومانش خندق کے شرقی کنارے پر ایک زیرآب پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ فرانسیسی مغربی افریقہ سے روانہ ہونے کے بعد جب سے کالپسو کھلے سمندر میں داخل ہوا تھا۔ پانی کی گہرائی کوئی ۱۳۰۰۰ فٹ چلی آتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

سمندر کا فرش ہتھیلی کی طرح صاف میدان ہو. تیسرے دن گہرائی ماپنے والے آلے نے نو ہزار فٹ گہرائی ظاہر کی. اس سے کالیپسو کے ملاحوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک لپیٹ پہاڑی سلسلے کے اوپر سے گذر رہے ہیں. کچھ دیر بعد گہرائی یک دم بڑھ گئی. آلے نے خبر دی کہ جہاز نو ہزار فٹ سے یک دم ۵۰،۵۰۰ فٹ گہرے سمندر میں داخل ہو چکا ہے. گہرائی ہر قدم بڑھتی جا رہی تھی. اب اس بات میں کچھ شک باقی نہ تھا کہ جہاز رومانشی خندق میں داخل ہو چکا ہے۔

جہاز لگاتار مغرب کو بڑھتا گیا تا آں کہ وہ ۲۵ ہزار فٹ گہرے پانی پر سے گذرنے لگا۔ یہ گہرائی میلوں تک چلتی رہی. تاہم اہل جہاز کو یہ معلوم نہ تھا کہ آیا وہ خندق کی لمبائی کو طے کر رہے ہیں یا چوڑائی کو. اس پر کپتان نے حکم دیا کہ جہاز کو نوّے درجے کے زاویے پر گھما کر اس کا رخ شمال کو کر دیا جائے. جہاز ابھی تھوڑی دور شمال کو بڑھا تھا کہ گہرائی تیزی سے گھٹنے لگی اور بہت جلد خندق کا کنارہ آ گیا. اب کپتان نے حکم دیا کہ جہاز آگے پاؤں جنوب کی طرف بڑھے. ایسا کرنے پر پانی کی گہرائی پھر یک دم بڑھنے لگی اور دو اڑھائی میل پیچھے ہٹ کر دوبارہ تیزی سے گھٹنے لگی اور خندق کا جنوبی کنارا آن پہنچا. اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ خندق کی لمبائی شرقاً غرباً واقع ہے اور چوڑائی شمالاً جنوباً. اس انکشاف کے بعد کالیپسو پھر مغرب کی طرف چل دیا. آخر خندق کے مشرقی کنارے سے کوئی ستر میل دور اس کا مغربی کنارہ آ گیا۔

لنگر اندازی کی مشکلات

رومانشی خندق کے طول و عرض کا پتہ کر لینے کے بعد کالیپسو کے لیے اگلا کام اس کے فرش کے فوٹو لینا تھا. اس کے لیے ضروری تھا کہ جہاز لنگر انداز ہو. جدید لنگر آہنی زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں. لیکن اگر کالیپسو بھی جدید لنگر استعمال کرتا تو نہ صرف پانچ میل لمبی لوہے کی زنجیر کا وزن ایک مسئلہ پیدا کر دیتا، بلکہ آہنی لمبی زنجیر کے نچلے حصے پر اس کے اپنے بالائی حصے کا بوجھ پڑتا وہ اس کے لیے ناقابل برداشت بن جاتا. یہ دقت رفع کرنے کے لیے زنجیر کا نچلا حصہ بہت زیادہ موٹا بنانا پڑتا. اس طرح زنجیر کا وزن اور بھی بڑھ جاتا۔

اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے کالیپسو کے کپتان نے پرانے زمانے کے جہاز رانوں سے سبق سیکھا۔ پرانے وقتوں میں جہازوں کے لنگر پٹ سن یا کتان کے مضبوط رسوں سے بندھے ہوتے تھے۔ اس لیے ان لنگروں کی وضع قطع ایسی رکھی جاتی تھی کہ وہ سمندر کی تہ پر پہنچ کر لنگر تہ کے ساتھ یوں پیوست ہو جائیں کہ جہاز کو سہارا مل جائے۔ موجودہ زمانے کے لنگر آہنی زنجیر کے بوجھ کے طفیل جہاز کو سہارا دیتے ہیں "کالیپسو" کا ۲۰۰ پونڈ وزنی لنگر نائلون کی رسی سے بندھا تھا جس کا قطر صرف ۱/۲ تھا۔ اس رسی کا وزن خصوصی سمندر کے پانی کے بالکل برابر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پانی کے اندر یہ رسہ بالکل بے وزن تھا۔ ظاہر ہے کہ نائلون کا یہ بے وزن رسہ جہاز کو سہارا نہیں دے سکتا تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے کپتان نے قدیم زمانوں کا بنا ہوا لنگر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ یونان کے ساحل کے قریب سمندر میں سے ایک ایسا لنگر ہاتھ لگا تھا جو ۲۰۰۰ سال پہلے بنا تھا۔ کالیپسو نے یہی لنگر استعمال کیا۔

غرض ماہرین کی پیش بینی نے کالیپسو کو پہلے سے ہر قسم کی مشکلات کے مقابلے کے لیے تیار کر دیا۔ آخر جہاز لنگر گرانے لگا۔ ہر ۱۰۰۰ فٹ کے بعد نائلون کے رسے کا رنگ سمندری پانی کے رنگ کے باعث تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ اس سے یہ معلوم کرنا آسان ہو گیا کہ لنگر کتنی گہرائی تک گیا ہے۔ آخر پورے اڑھائی گھنٹے تک چرخی پر سے چمکیلے نائلون رسے کے گذرنے کے بعد لنگر نے سمندر کی تہ کو چھوا۔ اور اہل جہاز نے چین کا سانس لیا۔ تاہم ابھی اور رسہ نیچے گرانا ضروری تھا۔ چناں چہ چرخی بدستور کھٹا کھٹ گھومتی رہی۔ آخرالامر پورے چار گھنٹے بعد یہ کام ختم ہوا۔

کیمرے کا کام

کالیپسو رات بھر او تیانوس کے وسط میں طوفانی تھپیڑوں کے درمیان جارہا۔ صبح ہوئی تو کپتان اور اہل جہاز کو یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ کہیں راتوں رات جہاز اپنی جگہ سے آگے تو نہیں دھکیل دیا گیا۔ یہ معلوم کر کے سب کو اطمینان ہوا کہ جہاز اپنی جگہ ڈٹا کھڑا ہے۔ تاہم سمندری لہر جنوب سے شمال کو بہ رہی تھی اور اپنے جلو میں ہر قسم کے آبی جانداروں کو بہائے لیے جارہی تھی۔ بہتا ہوا پانی جہاز کے ساتھ یوں ٹکرا رہا تھا جیسے جہاز کسی دریا میں کھڑا ہو۔

عجیب وغریب آبی جانوروں اور مچھلیوں کے تماشے سے سیر ہو کر اہل جہاز زیادہ اہم کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ کپتان نے فوٹوگرافر کو حکم دیا کہ اپنا کام شروع کرے۔ ایک بہت بڑی ریل پر نائلون کی ایک اور رسی لپٹی پڑی تھی۔ کیمرے کو اس رسی کے سرے کے ساتھ باندھا گیا اور چرخی نے اسے سمندر میں نیچے گرانا شروع کیا۔

فوٹوگرافر ایک نیا کیمرہ ساتھ لایا تھا۔ کیمرہ بے داغ فولاد کے ایک خاص طور پر تیار کیے گئے ڈبے میں بند تھا۔ سائنس دانوں کو علم تھا کہ رومانشی خندق کی ½ ۵ میل گہری تہ پر کیمرے کے ہر مربع انچ پر سمندری پانی کا ½ ۵ ٹن وزنی دباؤ پڑے گا۔ فولادی ڈبہ اس قدر مضبوط بنایا گیا تھا کہ اس دباؤ کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ کیمرے کے ساتھ ایک اور آلہ بندھا تھا جو اس بات کی اطلاع دینے والا تھا کہ اب سمندری فرش کتنا قریب ہے۔ اس اطلاع کے موصول ہوتے پر کیمرے کو سمندری فرش سے ۹ فٹ اوپر رکھ کر برقی روشنی کی مدد سے خندق کی تہ کے فوٹو لیے جانے والے تھے۔ کیمرہ خود بخود چلنے والا تھا۔ اسے اس طور پر سیٹ کیا گیا تھا کہ دو گھنٹے بعد از خود کام کرنے لگے اور ہر منٹ میں چار تصویریں لے۔

آخر کیمرہ سمندری فرش پر جا پہنچا اور اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تاہم اہل جہاز لپدرے تین گھنٹے تک بڑے صبر کے ساتھ کیمرے کو جہاز کے چاروں طرف آگے پیچھے گھماتے رہے اور یہ امید باندھے رہے کہ پانچ میل نیچے کیمرے کی برقی آنکھ گھپ اندھیرے میں اس سمندری فرش کی تصویریں لے رہی ہے جسے ابتدائے آفرینش سے پانی کی میلوں موٹی چادر نے ڈھانپ رکھا ہے، اور جس پر آج تک انسانی نگاہ کی رسائی نہیں ہوئی۔ تین گھنٹے کے اس عرصے میں کیمرہ تقریباً آٹھ سو تصویریں تیار کرنے والا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے تین گھنٹے کا یہ انتظار ختم ہوا۔ کیمرے کو اوپر کھینچا گیا۔ ہر ایک کو پہلی فکر یہ تھی کہ آیا کیمرہ سمندر کی پیس ڈالنے والی گرفت سے صحیح سلامت واپس آیا ہے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کے فولادی ڈھانچے کو کوئی آنچ نہ آئی تھی مگر اس کی شیشے کی آنکھ میں ستارے کی شکل کا بال آ چکا تھا۔ فوٹوگرافر نے لپک کر کیمرے کو پکڑ لیا اور یہ اطمینان کرنا چاہا کہ آیا پانی نے فلم کو تو نقصان نہیں دیا۔ یارے یہ معلوم کر کے سب کو تسلی ہوئی کہ کیمرے کے اندر پانی کی بوند تک نہیں گئی

سائنس دانوں کی طرف سے مبارک باد

"سالپسو" کو اپنے مقصد میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے کیمرے نے "رومانشی خندق" کی تہ کی دو نہایت اچھی تصویریں تیار کرلیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے گہرے میں تصویریں لینے کے ریکارڈ کو بھی آدھ میل سے زیادہ فاصلہ سے توڑ دیا۔ بہت جلد یہ تصویریں دنیا بھر کے ماہرین ارضیات۔ بحریات اور علم الحیات کے ہاتھوں میں جا پہنچیں۔ عام لوگوں کو ان تصویروں میں کوئی جاذبیت نظر آئے نہ آئے مگر سائنس دانوں نے ان کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ ان تصویروں نے سائنسی معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

ان فوٹو گرافوں نے سمندری فرش کے متعلق جن حقائق پر روشنی ڈالی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ پانی کی پانچ ساڑھے پانچ میل موٹی چادر کے نیچے ایسی کنکریاں بھی چھپی ہیں جو استبداد زمانہ کے باعث گھس چکی ہیں۔ مگر ساتھ ہی پتھر کے ایسے ٹکڑے بھی موجود ہیں جن کے کنارے خوب تیز ہیں۔ اسی طرح سمندری فرش پر جگہ جگہ پتھریلی چٹانیں اور ان کے دراڑ نظر آتے ہیں۔

سمندری فرش کے یہ خدوخال ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا کرتے ہیں۔ اتنی گہرائی میں چٹانوں کے یہ نشیب و فراز کس طرح پیدا ہوئے؟ سمندر کے فرش پر مٹی کی جو تہ جمع ہوتی رہتی ہے وہ اس جگہ کیوں موجود نہیں؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ تیز پانی کی رویں اس فرش کو دھوتی رہتی ہیں اتنی گہرائی پر سمندری روؤں کا اثر انداز ہونا ویسے ناقابل نہیں ہے۔ بہر حال کیمرے کی لی ہوئی تصویروں نے علم الارض کے ماہرین کے لیے بہت سے دلچسپ سوال پیدا کردیے ہیں۔

بعض سائنس دانوں کا قیاس ہے کہ ہوسکتا ہے کہ "رومانشی خندق" نسبتاً بعد کی پیداوار ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہو تو اس سے سمندروں اور براعظموں کی ساخت کے متعلق کئی اور دلچسپ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ان تصویروں میں علم الحیات کے ماہروں کے لیے بھی دلچسپ نکتے موجود ہیں۔ پانچ ساڑھے پانچ میل گہرے سمندری فرش کے عین اوپر زندگی کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ تصویر میں چار

سفید رنگ کے ننھے ننھے جانور تیرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی بدنی ساخت اور دوسرے خصائص کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ مگر "کالپسو" سے حاصل کی گئی تصویروں نے ایک حقیقت اچھی طرح ثابت کر دی ہے۔ اب تک خیال کیا جاتا تھا کہ سمندر کی ایسی گہرائی پر جہاں اوپر کا پانی ہر مربع انچ پر ۵ ٹن بوجھ ڈال رہا ہو کسی جاندار کا زندہ رہنا محال ہے، مگر فوٹوگرافوں نے اس خیال کو غلط ثابت کیا ہے۔ ان کی بدولت یہ بات پہلی بار پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ اس گہرائی پر بھی آبی جانداروں کی ایک دنیا بستی ہے۔

دوسری کوشش

کالپسو کو فوٹو لینے میں پہلے دن جو کامیابی ہوئی تھی اس سے حوصلہ پا کر اگلے دن پھر کیمرہ سمندر کی تہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ حسب سابق گہرائی کی خبر دینے والا آلہ اس کے ساتھ ملحق تھا۔ بدقسمتی سے یہ آلہ چند میل نیچے جا کر پانی کے بوجھ کے باعث ناکارہ ہو گیا۔ اب اہل جہاز کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے یہ معلوم ہو کہ آیا کیمرہ سمندری فرش پر جا پہنچا ہے یا نہیں۔ چنانچہ کیمرے کو اندازاً ایک جگہ روک دیا گیا۔ ابھی نائلون کی چرخی پر کچھ رسی ایسی باقی تھی جس کا رنگ سمندر کے پانی سے بدل چکا تھا۔ مگر ایک شخص کے غلط اندازے کے باعث کیمرے کو اسی جگہ روک لیا گیا۔

اب کیمرہ پھر چار فوٹوگراف فی منٹ کی رفتار سے تصویریں لینے لگا۔ اہل جہاز یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کل کی طرح آج بھی رومانشی خندق کے فرش کی تصویریں حاصل ہو جائیں گی۔ مگر جب یہ فلم تیار ہوئی تو اہل جہاز کا قیاس غلط ثابت ہوا۔ کیمرہ سمندری فرش سے کوئی چھ سو فٹ اوپر رہا تھا۔ تاہم یہ تصویریں بھی بے کار نہیں گئیں۔ پیرس کے ماہرین بحریات ان کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کی مدد سے آبی زندگی پر جو سفید روشنی پڑتی ہے اس سے کارآمد نتائج اخذ کر رہے ہیں۔

سائنسی معلومات کی پیاس

کالپسو کی سیاحت دراصل ایک وسیع تر علمی منصوبے کا جزو تھی۔ یہ منصوبہ پیرس میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فارسٹ کی زیر ہدایت پورا کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر فارسٹ کے آدمی نہ صرف کالپسو پر بیٹھ کر اوقیانوس کی عمیق ترین گہرائیوں کے راز معلوم کر رہے تھے۔ بلکہ ان کی ایک بڑی تعداد

مغربی افریقہ کے استوائی جنگلوں اور پہاڑوں کو جیپ کاروں میں بیٹھی چھان رہی تھی۔ یہ لوگ طرح طرح کے جانور۔ کیڑے۔ مکوڑے۔ پودے اور قسم قسم کی چٹانوں کے نمونے جمع کر رہے تھے۔

سائنسی معلومات جمع کرنے کی یہ مہم پورے دو مہینے تک جاری رہی، اس عرصے میں یہ علمی مجاہد سات روز فی ہفتہ کام کرتے رہے۔ مگر یہ کام از خود تفریح کا سامان بھی پیدا کر دیتا تھا۔ کالیپسو کا عرشہ طرح طرح کے آبی جانداروں یعنی مچھلیوں۔ کیڑوں۔ مکوڑوں۔ اسفنجوں اور سونگوں سے اٹا پڑا تھا۔ مچھلیوں میں ایسی بھی تھیں جو کھانے میں بڑی لذیذ تھیں۔ اس قسم کی مچھلیاں اہل جہاز کی غذائی ضرورتیں پوری کرتی رہیں۔

دو مہینے کے بعد ڈاکٹر نارسٹ نے کہا:- یہ دو مہینے بہت جلد گذر گئے تاہم اس مختصر عرصے میں ہم نے خلیج گی آنا کے متعلق بہت سی کام کی باتیں معلوم کی ہیں۔ ماہرین بحریات نے اندرون کے درجۂ حرارت کے متعلق تمام ضروری باتیں معلوم کر لی ہیں اور ماہرین علم الحیات کو جو معلومات ہاتھ لگی ہیں ان کی قدر و قیمت اندازے سے باہر ہے۔

سائنس دانوں کا استعجاب

تصویریں لینے کا کام ختم ہوا تو کالیپسو از سر نو ایک اور کام میں لگ گیا۔ اسے رومانشی خندق کا درست جغرافیائی محل و قوع معین کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ جہاز خندق کو پوری طرح کھنگالے۔ یہ ممکن بنانے کے لیے المونیم کی ایک ہلکی سی کشتی کو خندق میں لنگر کے ساتھ باندھا گیا۔ اس نشان کے حوالے سے اب خندق کی چھان بین ممکن ہو گئی۔

کافی محنت کے بعد رومانشی خندق کا جغرافیائی محل و قوع پورے طور پر متعین ہو گیا۔ اس کی چوڑائی ۷ سے ۵ میل تک ثابت ہوئی۔ اس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی ۲۵۰۵۷ فٹ نکلی۔ اس کی شکل انگریزی لفظ V کی طرح ثابت ہوئی۔ خندق کا فرش ہموار نہیں بلکہ جگہ جگہ سے ابھرا ہوا ہے۔ یہ ابھار ۲۰۰ سے ۳۰۰ فٹ تک بلند ہیں۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود سائنس دان اب تک رومانشی خندق کے وجود کے متعلق سخت

حیرانی میں ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اسے اس جگہ نہ ہونا چاہیے جہاں یہ ہے۔ دنیا کے باقی سمندروں میں سب سے گہرے نشیب براعظموں یا جزیروں کی قطاروں کے قریب واقع ہیں۔ زمین کی جس اندرونی قوت نے دفعتاً جزیروں یا براعظمی کناروں کو ابھارا اس نے یہ نشیب بھی پیدا کیے۔ مگر رومانشی خندق کے آس پاس نہ کوئی جزیروں کی قطار ہے نہ براعظمی کنارہ۔ ممکن ہے یہ خندق اس زیر زمین آتش فشانی کا نتیجہ ہو جو وسط اوقیانوس میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

سمندر کے سربستہ راز

"کالپسو" رومانشی خندق کی چند جھلکیاں حاصل کرنے کے بعد واپس مغربی افریقہ کے ساحل پر جا پہنچا۔ کچھ دنوں بعد یہ جہاز پرتگیزی جزیرہ مڈیرا میں لنگر انداز تھا۔ اہل جہاز ریتیلے ساحل پر سمندر میں غوطے لگا رہے تھے۔ دفعتہً ان میں سے ایک نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اس نے سمندر کے ریتیلے کنارے پر بانسی گھاس کی قسم کے خمدار پودوں کو اگے ہوئے دیکھا ہے۔ اس پر چند اور لوگ اس بات کی تحقیق کے لیے سمندر کے کنارے کی طرف غوطہ زن ہوئے مگر یہ پودے چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے۔ دور سے وہ صاف باہر کی طرف جھکے ہوئے نظر آتے تھے مگر جوں ہی ان کے قریب جاؤ وہ سمندر کے ریتیلے کنارے میں دھنس جاتے تھے۔ سب حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ساحل کی ریتیلی دیوار کو کھودا گیا مگر ان عجیب و غریب پودوں کا کچھ سراغ نہ ملا۔ مڈیرا کے عجائب گھر کے ڈائرکٹر سے اس معاملے میں رجوع کیا گیا مگر وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ آخر ساحل کی ریتیلی دیوار کا کچھ حصہ بارود سے اڑایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ حیرت انگیز پودے فی الحقیقت دو فٹ لمبی اور انگلی بھر موٹی بھورے رنگ کی مچھلیاں ہیں جو اپنی دم ریتیلے ساحل میں گاڑے رکھتی ہیں اور منہ پانی میں کھولے رہتی ہیں، خطرے کی آمد پر وہ فوراً ریتیلی دیوار میں دھنس جاتی ہیں۔ عجائب خانے کے ڈائرکٹر نے بتایا کہ یہ مچھلیاں بہت شاذ پانی میں نکلتی ہیں۔ اس نے پچیس سال کے عرصے میں اس مچھلی کے صرف دو نمونے دیکھے ہیں جو بندرگاہ میں پکڑے گئے تھے۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے کالپسو کے جہازیوں کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اگرچہ انھوں نے پانچ میل گہرے سمندر کے سربستہ رازوں پر سے پردہ سرکانے کی کوشش کی ہے، لیکن سمندر کی خاموش دنیا اپنے بالائی حصوں میں بھی کئی ایسے راز چھپائے ہوئے ہے جن کے متعلق ابھی

ابتدائی جماعتوں میں اُردو کی تدریس

نور علی قریشی

اُردو تعلیم:- طلبا کی تعلیمی حالت میں جو کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں خواہ وہ پرائمری حصہ
کے طلبا ہوں، یا ہائی حصہ کے ان کی وہ کمزوریاں ابتدا سے شروع ہوتی ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے جو تجرباتی
طور سے ثابت ہوئی ہے کہ بچوں کو پرائمری میں تعلیم دلچسپ طریقہ سے نہیں دی جاتی، جس کی وجہ سے اکثر بچے بددل
ہو جاتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے سے اکتا جاتے ہیں کیوں کہ چھوٹے بچے جب پہلے پہل اسکول میں آتے ہیں تو وہ
بیت یافتہ نہیں ہوتے اور نہ ہی ابھی ان کے دماغ نے نشوونما پائی ہے۔ جس کی وجہ سے بچوں کا دماغ غیر دلچسپ
طریقہ تعلیم کو قبول نہیں کرتا، اور نہ ہی اسے اپنے دماغ میں جگہ دیتا ہے، بلکہ اسے جبری بیگار تصور کرتا ہے
کیوں کہ حروف کی اشکال بچے کی قوت باصرہ کو بھیانک اور بری معلوم ہوتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بچوں نے
اسکول میں داخل ہونے سے پہلے اپنے گھروں میں کبھی دیکھی نہ تھیں اور نہ ہی بچوں نے ان الفاظ کی آوازیں
اپنے گھروں میں کبھی سنی تھیں۔ اس لیے بچوں کی قوت سامع بھی ان آوازوں سے مانوس نہیں ہوتی۔ جس کی
وجہ سے بچے سکول اور گھر میں فرق محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ استاد بچوں کو تعلیم دیتے
وقت طریقہ تعلیم کو دلچسپ اور مؤثر بنائے تاکہ بچے تعلیم کو شوق سے حاصل کریں۔

طریقہ مین گو:- یہ طریقہ شروع شروع میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے مفت مفید ثابت ہوا ہے
اس کی تعلیم مندرجہ ذیل طریقہ سے دی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کوٹ ہے کا فقرہ بچوں کو پڑھانا ہے تو پہلے "یہ"
اور "ہے" کا لفظ جو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے چورس ٹکڑوں پر لکھا ہوا ہو، بچوں کے ذہن نشین کرا دیا جائے
کہ بچے "یہ" اور "ہے" کے لفظ کی اچھی طرح شناخت کر سکیں۔ جب یہ اور ہے کے لفظ بچوں کو ذہن نشین
ہو جائیں تو بعد میں استاد یہ اور ہے کے لفظوں کے درمیان اصل کوٹ (جو کپڑے کا بنا ہوا ہو) زمین پر
رکھ دے اور بچوں سے فقرہ مکمل کرائے تو وہ خود بخود پڑھیں گے یہ کوٹ ہے۔ اس کے بعد کوٹ کو

"یہ ہے" کے پہلے زمین پر رکھ دیا جائے اور بچوں کو پڑھنے کے لیے کہا جائے تو وہ پڑھیں گے "کوٹ" یہ ہے۔
اس کے بعد "یہ ہے" کے ٹکڑے زمین پر پہلے رکھے جائیں اور کوٹ کو بعد میں زمین پر رکھا جائے تو بچے
خود بخود اسے پڑھیں گے "یہ ہے کوٹ"۔ اب بچے کوٹ کے متعلق تین فقرے بنانے سیکھ چکے ہیں۔

کوٹ کے الفاظ کی شناخت :- استاد سفید کاغذ کے ٹکڑے پر کوٹ کا لفظ موٹی قلم سے خوش خط لکھا
ہوا اصلی کوٹ پر چسپاں کردے اور بچوں کو بتائے کہ یہ کوٹ کا نام لکھا ہوا ہے اور وہی فقرات ادل بدل
کرکے بچوں سے بنوانا جائے۔ مثلاً یہ کوٹ ہے۔ کوٹ یہ ہے۔ یہ ہے کوٹ۔ اس کے بعد استاد اصلی کوٹ کو
وہاں سے اٹھالے اور کوٹ کا لفظ جو کاغذ پر لکھا ہوا ہے وہاں رہنے دے اور پھر بچوں سے یہ کوٹ ہے۔
کوٹ یہ ہے۔ یہ ہے کوٹ کے فقرے بنوائے جائیں۔ اب بچوں کے دماغ میں کوٹ کے لفظ کا تصور
اچھی طرح ذہن نشین ہو چکا ہے۔ مگر کوٹ کے لفظ کی پختگی کے لیے بچوں کو کوٹ کا لفظ انگلی سے ہوا میں لکھوانے
کی مشق کرائی جائے۔ بعد میں زمین پر انگلی سے کوٹ کا لفظ لکھوانے کی مشق کرائی جائے۔ تاکہ بچوں کو
کوٹ کا لفظ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

چارٹ :- جب بچوں کو کوٹ کا لفظ پڑھانے کی مشق کرائی جا چکے تو استاد بچوں کے سامنے
ایک ایسا چارٹ پیش کرے جس میں کم از کم دس مختلف فقرات موٹی قلم سے لکھے ہوئے ہوں۔ اور ہر فقرہ
میں کوٹ کا لفظ بہت موٹا اور خوش خط لکھا ہوا ہو۔ تو بچوں کو کہا جائے کہ پہلے فقرہ میں کوٹ کا لفظ جہاں
لکھا ہوا ہے کیا تم وہاں اس پر انگلی رکھ سکتے ہو۔ جب بچے اس کا جواب دے چکیں تو کسی ایک لڑکے کو
کوٹ کے لفظ پر انگلی رکھنے کے لیے کہا جائے تو فوراً کوٹ کے لفظ پر انگلی رکھ دے گا۔ کیوں کہ کوٹ کا
لفظ بچوں کو اچھی طرح ذہن نشین ہو چکا ہے اور وہ کوٹ کے لفظ کو اچھی طرح پہچان سکتے ہیں۔ بعد میں استاد
بچوں سے دوسرے فقرے کوٹ کا لفظ شناخت کرائے۔ بعد میں تیسرے فقرے سے، اسی طرح سب بچوں کو
تمام فقرات سے کوٹ کے لفظ کی شناخت کرائی جائے۔

اسی طریقہ سے بہت سے لفظ بچوں کو پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ بوٹ ہے۔ یہ ٹوپی ہے وغیرہ
اور ان کے کئی کئی فقرات بنوائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر طریقہ میں بتایا گیا ہے۔ اس طریقہ سے بچے تعلیم لیا

دل چسپی لیں گے اور ان کی توجہ بھی سبق کی طرف لگی رہے گی۔ جب بچے اس میں کامیاب ہو جائیں اور پڑھنے میں چل نکلیں تو بعد میں صرف طریقۂ تجسی کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جائے۔ کیوں کہ جب تک بچے طریقۂ تجسی سے تعلیم حاصل نہیں کریں گے وہ املا نہیں لکھ سکیں گے۔ کیوں کہ طریقۂ بین دگر سے بچوں کو تعلیم دے کر اسکول سے مانوس کرنا مقصود تھا۔ بچے گھر سے کھیلتے ہوئے آئے تھے اور ان کی دل لگی کا اسکول میں ہونا ضروری تھا۔ تاکہ وہ تعلیم سے بد دل نہ ہو جائیں۔ اور اسکول کو ڈراؤنا خیال نہ کریں۔

اب بچے چوں کہ اسکول میں کچھ وقت گذار چکے ہیں۔ تعلیم کے طریقہ سے مانوس ہو چکے ہیں۔ وہ اسکول سے بھاگنا پسند نہیں کریں گے، بلکہ تعلیم حاصل کرنا اپنے لیے مفید خیال کریں گے۔ اس لیے استاد کے لیے ضروری ہے کہ جوں جوں بچے تعلیم میں ترقی کرتے جائیں اور اگلی جماعتوں میں پہنچتے جائیں وہ ہر مضمون کے طریقۂ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ بناتا جائے۔

اگر استاد اپنے طریقۂ تعلیم کو دل چسپ نہیں بنائے گا تو بچے تعلیم سے بد دل ہو جائیں گے۔ اور اسکول و استاد انھیں ڈراؤنا معلوم ہوگا۔ جس کی وجہ سے بچے اسکول سے غیر حاضر رہنا شروع کر دیں گے۔ اور بچوں میں تعلیمی کمزوریاں اور خامیاں بڑی تیزی سے بڑھنی شروع ہو جائیں گی اور بچے تعلیم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیں گے۔ جہاں تعلیم اچھے طریقے سے دینا ضروری ہے وہاں بچوں کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لیے مکمل سامان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ نامکمل سامان کی حالت میں خاطر خواہ تعلیم نہیں ہو سکتی۔

سامان:۔ جب بچے سکول میں آتے ہیں تو انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے لیے کونسا سامان ضروری ہے جو ہم نے اپنے ہمراہ سکول میں لانا ہے۔ اس لیے استاد کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ بچوں کے تمام سامان کی ہر روز صبح کو آتے ہی دیکھ بھال کرے اور جس لڑکے کا سامان مکمل نہ ہو اس کا پہلے سامان مکمل کرائے بعد میں سبق سکھانا شروع کرے۔ کیوں کہ اگر بچے کا سامان مکمل نہیں تو وہ صحیح طریقہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا اور باقی لڑکوں کے پاس سامان بھی ڈبل نہیں ہے جو کسی ایسے طالب علم کی مدد کر سکیں جس کا سامان نامکمل ہے۔ اگر کسی بچے کے پاس قلمیں یا پنسلیں زیادہ بھی ہیں اور کسی بچے کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں تو اسے اگر دی بھی جائیں تو وہ لڑکا اگلے روز پھر بھی اپنا تمام سامان نہیں لائے گا۔ بلکہ ایک دو اور چیزیں

اپنے گھر میں لاپرواہی کی وجہ سے چھوڑ آئے گا۔ اس خیال پر کہ اسکول میں کسی طالب سے مل جائیں گی۔ اور اسے یہ بھی خیال رہے گا کہ استاد نے تو سامان دیکھنا ہی نہیں جس کی وجہ سے ایسے طالب علموں میں لاپرواہی بڑھتی چلی جائے گی اور ان کے تعلیمی کام میں کافی نقصان ہوتا چلا جائے گا۔

لباس :- اکثر بچوں کا لباس اسکول میں مناسب اور درست نہیں ہوتا۔ کوئی لڑکا دھوتی باندھے سکول میں آرہا ہے۔ کوئی شلوار پہنے ہوئے ہے۔ کوئی لنگوٹی پہنے سکول میں پھر رہا ہے۔ کسی طالب علم کے قمیص کے گلے کا بٹن کھلا ہے کسی کا گریبان بند ہے جو بہت برے معلوم ہو رہے ہیں۔ اگر استاد اس طرف بھی دیکھ بھال رکھے تو جماعت کے تمام طلبا ایک اچھی صورت میں دکھائی دیں گے۔ اس کے لیے بچوں کا مناسب ایک لباس ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اسکول میں صفائی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے جو مندرجہ ذیل سطور میں نقائص اور فوائد اور تجرباتی لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں۔

صفائی :-

اسکول کی صفائی	سامان کی صفائی
لباس کی صفائی	تختیاں دھونے کی صفائی
جسم کی صفائی	بچوں کے بستوں کی صفائی

سکول کی صفائی :- سکول کے صحن اور کمروں کے فرش پر جا بجا ردی کاغذوں کے پرزے اور ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ قلمیں اور پنسلیں بناتے وقت ان کے چھلکے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں۔ سکول کے کمروں کی چھتوں میں اکثر جگہ جالا لگا ہوا ہے۔ روشندانوں اور الماریوں یا صندوقوں پر گرد و غبار پڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے سکول کے کمرے اور صحن اور کمروں کا فرش گندہ اور خراب دکھائی دیتا ہے۔

کمروں کی چھتوں اور الماریوں یا صندوقوں کی صفائی ہفتہ میں نہیں تو ہر دوسرے ہفتے میں ایک بار ضرور ہونی چاہیے۔ کاغذوں کے ردی اور خراب ٹکڑے قلموں اور پنسلوں کے تنکے ٹین کے ڈبوں میں ہر روز ڈلوائے جائیں۔ جو سکول کے صحن میں مناسب جگہوں پر رکھے جا سکتے ہیں۔

لباس کی صفائی :- بعض بچوں کا لباس ایسا میلا اور کچیلا ہوتا ہے کہ ان کے پاس کھڑا رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ ان کے لباس سے پسینے کی بو آرہی ہے۔ بچوں کو لباس صاف ستھرا رکھنے کے

تاکید کی جائے۔ اور ہر ہفتہ کے بعد لباس کی صفائی استاد خود دیکھے۔

جسم کی صفائی :- کئی بچوں کا جسم اتنا گندہ اور میلا ہوتا ہے کہ وہ بھوت بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سر کے بالوں کی یہ حالت ہے کہ جب بچہ پیدا ہوا، اس وقت سے لے کر کئی سالوں تک اس کی حجامت ہی نہیں بنوائی گئی اور وہ بھالو بنا ہوا اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ بچوں کو ہر ہفتہ نہیں تو کم از کم نہیں تو دوسرے ہفتے کے بعد حجامت بنوانے کے لیے تاکید کر دی جائے اور اس کی جانچ پڑتال کی جائے ہاتھوں کے ناخن وغیرہ بھی اتروانے کے لیے کہا جائے۔ اس کے علاوہ ہر روز صبح بچے نہا کر سکول میں آئیں اور سکول لگتے ہی صبح کو دعا کے بعد بچوں کو دیکھا جائے کیوں کہ اکثر بچے نہانا تو درکنار صبح کو اٹھ کر منہ ہاتھ دھونا گوارا نہیں کرتے اور بلا منہ دھوئے اسکول آجاتے ہیں۔ انہیں بغیر ہاتھ منہ دھوئے کھانے کے مضرات سے آگاہ کرنا چاہیے۔

بچوں کے سامان کی صفائی :- کاپیوں، کتابوں اور تختیوں پر جا بجا سیاہی اور گندے ہاتھوں کی انگلیوں کے دھبے اس قدر لگے ہوتے ہیں کہ کتاب یا کاپی یا تختی کو ہاتھ لگانے کو دل نہیں چاہتا بچوں کو صاف سامان رکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

تختیاں دھونے کی جگہ :- تختیاں دھونے کے لیے ایک جگہ مقرر ہونی چاہیے اور وہاں ایک چھوٹا سا حوض بنوانا چاہیے۔ تاکہ لڑکے اسی جگہ پر اپنی تختیاں اسکول میں دھو سکیں۔ کیوں کہ اکثر دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی لڑکا نلکے پر تختی دھو رہا ہے اور کوئی بہتے ہوئے گندے پانی سے۔ اس طرح نلکے کے ارد گرد کیچڑ اور تختیوں کی دُھلی ہوئی گاچنی پھیلی ہوتی ہے جہاں کئی طلبا بے احتیاطی سے اپنے کپڑوں کو میلا اور گندا کر لیتے ہیں کر جماعت میں آکر دوسرے طلبا کے ساتھ بیٹھ کر ان کے کپڑوں کو بھی گندہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے استاد کو ہر قسم کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے۔

بچوں کے بستوں کی صفائی :- اول تو بچوں کے بستے یا تھیلے ایک قسم کے نہیں ہوتے اور جو ہوتے بھی ہیں وہ اس قدر گندے اور خراب کہ دوات کی سیاہی سے لت پت دکھائی دے رہے ہیں کہ دیکھنے والے کا دل بے زار ہوتا ہے۔ تمام بچوں کے بستے ایک قسم کے ہونے چاہئیں زیادہ اچھا ہے تمام

طلبا کے بستوں کا رنگ سیاہ ہو، تاکہ اگر کہیں سیاہی کا رنگ لگ بھی جائے تو بستہ گندہ دکھائی نہ دے اور ہر اتوار کو بستے دھونے کے لیے تاکید کی جائے۔ کیوں کہ جب تک صفائی کا خیال نہ رکھا جائے گا تعلیم کا اصل مقصد پورا نہ ہوگا۔ کیوں کہ اکثر بچے صاف ستھرا نہ رہنے کی وجہ سے کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ جس کی وجہ سے تعلیم خاطر خواہ نہیں ہو سکے گی۔

طلبا کی بے قاعدہ حاضری: ۔ اکثر بچے سکول میں دیر سے آتے ہیں۔ بے قاعدہ حاضری کی وجہ سے تعلیمی کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ دیر سے آنے والے طلبا اپنے ساتھیوں سے اسباق میں پیچھے رہ رہ کر کافی دور تک پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور تعلیمی حالت میں کمزور ہو کر اسکول سے بھاگ کے (اسکول چھوڑنے) پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جو طلبا غیر حاضر رہتے ہیں ان کی تعلیمی حالت تو بالکل ہی خراب اور بدتر ہو جاتی ہے۔ جو بچے دیر سے آنے کے عادی ہوتے ہیں یا اسکول سے غیر حاضر رہتے ہیں وہی طلبا پڑھنے میں کمزور بھی ہوتے ہیں۔ ان کے دیر سے آنے اور غیر حاضر رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے جس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ ایسے طلبا کو وقت پر حاضر کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کی تعلیمی کمی کو پورا کر کے ان کے ساتھیوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پھر وہ کبھی بھی دیر سے نہیں آئیں گے اور نہ ہی غیر حاضر رہیں گے استاد کو بھی زیادہ کوفت نہیں ہوگی اور اسکول میں تعلیمی کام بھی اچھی طرح ہونے لگے گا۔ طلبا کی حاضری درست کرنے کے لیے استاد کو اسکول میں اسکول لگنے سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا ضروری ہے تاکہ وہ حاضر باش طلبا کو جو سکول لگنے سے پہلے آئے ہوئے ہیں غیر حاضر رہنے والے طلبا یا دیر سے آنے والے طلبا کے پاس بھیج کر طلبا کو اسکول لگنے سے پہلے اکٹھا کر لے۔

میرا تجربہ ہے کہ جن ایسے بچوں کی تعلیم و تربیت کا استاد اچھی طرح انتظام نہیں کرتا وہ تعلیمی کمزوریوں میں مبتلا ہو کر اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ جانے کے علاوہ غیر حاضر رہنے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہ ہائی اسکول میں بھی پہنچ کر اپنی عادت کو نہیں بدل سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے جس مضمون میں کمزور ہوتے ہیں اس مضمون کے پیریڈ میں غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے طلبا میں سے کوئی لڑکا اسکول میں حاضر بھی ہے تو وہ تعلیمی حالت کمزور ہونے کے باعث اپنے اسباق کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ کیوں کہ

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آسکتا اور وہ اپنے پاس بیٹھنے والے ساتھیوں کے ساتھ شرارتیں کرکے ان کی توجہ بھی ادھر ادھر کرتا رہتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اچھے لکھنے پڑھنے والوں میں سے چند اور ساتھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہے جس کی وجہ بالکل عیاں ہے کہ کوئی کمزور طالب علم ہوشیار طالب علموں کے پاس بیٹھتا رہے گا تو وہ کسی روز ضرور پڑھنے لکھنے میں اچھا ہو جائے گا۔ اسی طرح جب کوئی ہوشیار طالب علم کمزور طالب علم کے ساتھ رہنے لگے گا تو وہ بھی ضرور کسی روز ان کی طرح کمزور ہو جائے گا۔

ایک اچھا اور تجربہ کار استاد ایسے بچوں کے نقائص کو بڑی آسانی سے دور کر لیتا ہے اور اپنے اصلی مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ طالب علم جو تعلیمی کمزوریوں میں پڑ کر اپنا ستیاناس کر رہا تھا وہ اپنے استاد کی ہدایت پر عمل کرکے اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے علاوہ استاد کا وفادار شاگرد ثابت ہوگا۔

استاد کی ڈائری:- اس کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب یا انسپکٹر صاحب کو دکھانے کے لیے ہی لکھنی چاہیے بلکہ اس کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ استاد کو گھر پر اپنے کام کی اچھی طرح تیاری کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جو کام اس نے اگلے روز اسکول میں آکر کروانا ہوتا ہے تجرباتی لحاظ سے ڈائری استاد کے کام میں کافی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ جو کئی طریقوں سے لکھی جا سکتی ہے۔ راقم نے جو کئی سالوں سے ڈائری لکھنے کا تجربہ کیا ہے وہ نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ جس کے لکھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ استاد جتنی جماعتوں کے جو جو مضامین پڑھاتا ہے۔ ڈائری کے صفحوں کی کل تعداد کو مضامین کی تعداد پر تقسیم کر دیا جائے اور پھر ہر مضمون کی علیحدہ علیحدہ ڈائری تاریخ وار یا ہفتہ وار لکھی جائے تو اس طرح ہر مضامین بدہ علیحدہ نوٹس تیار ہو جائیں گے۔ جو طلبا اور استاد دونوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

ڈائری لکھنے کا طریقہ دوسری طرف صفحہ ۵۹، ۶۰ پر درج ہے ملاحظہ فرمایئے۔

تاریخ	نام جماعت	مضمون	موضوع	صحتِ تلفظ	الفاظ	معنی	الفاظ	معنی	گرامر: واحد	گرامر: جمع	اردو فقرات کو آسان عبارت میں لکھنا	مضامین
۲ ۷/۵۸	ہشتم اے	اُردو	عید کی صوم	طیور۔ اہلِ صوم بلال۔ مسرت دہر فلک۔ افق وصال۔	طیور بلال وصال	جمع طائر کی پرندے چاند ملنا جمع وصل کی	اہلِ صوم مسرت دہر فلک	روزہ دار خوشی زمانہ آسمان	طائر مسجد قوم وصف خلیفہ	طیور مساجد اقوام اوصاف خلفاء	فقرہ ۱:- تم نادان ہو، اصولِ سیاست کی خبر نہیں، امورِ مملکت سمجھنے سے عاری ہو۔ آسان عبارت:- تمہیں سمجھ نہیں نہ تم حکمرانی جانتے ہو۔ تم حکومت کی باریکیاں نہیں سمجھ سکتے۔ فقرہ ۲:- بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ سینکڑوں کھیت رہے۔ آسان عبارت:- ایسی لڑائی ہوئی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا اور سینکڑوں آدمی مارے گئے	ترمس کی خرابیوں پر ایک مضمون لکھو جو بیس سطروں سے کم نہ ہو۔

تاریخ	نام جماعت	مضمون	موضوع	مختصراً سبق	گھر کا کام
۲ ۷/۵۸	ہشتم بی	تاریخ ہند	انگریزوں کا زمانہ	یورپی اقوام ع۱ پرتگیز ۲ ولندیز ع۳ انگریز ع۱ پرتگیز:- ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے افریقہ کے گرد گھوم کر اس امر کا بحری سفر کر کے راستہ دریافت کیا تھا۔ انہوں نے پرتگیزوں کے لیے کالی کٹ کے راجہ زمورن سے تجارتی حقوق حاصل کیے۔ اس طرح یورپی اقوام میں سے سب سے پہلے پرتگیزی ہی تجارت کے لیے آئے اور انہوں نے مغربی ساحل پر تجارتی کوٹھیاں کھولیں۔ آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے۔ سو سال تک ان کا اقتدار قائم رہا۔ ان کا قبضہ گوا، دمن اور ڈیو (پر تھا) ع۲ ولندیزی:- پرتگیزوں کی دیکھا دیکھی ۱۶۰۲ء میں ولندیزوں نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر تجارت شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پرتگیزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا۔ جزائر کو اپنا مرکز بنایا۔ اور جزائر شرق الہند پر قابض ہو گئے ع۳ انگریز:- دوسری قوموں کو ہاتھ رنگتے دیکھ کر انگریزوں کے منہ بھی پانی بھر آیا اور ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ کی اجازت سے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے ہندوستان میں قائم کی۔ ۱۷۵۹ء میں جنگ [illegible] فتح کر کے ولندیزوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا وغیرہ۔	انگریزوں کے زمانہ سے کیا مراد ہے۔ یوروپی اقوام کا حال لکھو۔ تم ولندیزوں کے متعلق کیا جانتے ہو۔

حساب ششم کے ۲.۷.۵۸ تا ۷.۷.۵۸

تاریخ	نام جماعت	مضمون	موضوع	مختصرات	مشقی سوالات	گھر کا کام
۲/۷/۵۸	ششم	حساب	کسور اعشاریہ کی ضرب کسور اعشاریہ سے	مثال نمبر1 2.2 کو 3.4 سے ضرب دو حل نمبر1 $3.4 \times 2.2 = \frac{34}{10} \times \frac{22}{10} = \frac{748}{100} = 7.48$ جواب حل نمبر2 2.2 3.4 88 66 7.48 جواب	4.75×1.35 1.35 4.75 675 945 540 6.4125 جواب مشق نمبر 8 سوال نمبر1 تا سوال نمبر5 سوال نمبر6 تا سوال نمبر10 سوال نمبر11 تا سوال نمبر15 سوال نمبر21 تا سوال نمبر25 متوازی خطوط	مشق نمبر 8 سوال نمبر1 تا سوال نمبر5 ۲/۷/۵۸ 〃 نمبر6 تا 〃 نمبر10 ۳/۷/۵۸ 〃 نمبر16 تا 〃 نمبر20 ۴/۷/۵۸ 〃 نمبر26 تا 〃 نمبر30 ۵/۷/۵۸
۲/۷/۵۸ ۳/۷/۵۸ ۴/۷/۵۸ ۵/۷/۵۸				مندرجہ بالا مثال سے یہ قاعدہ حاصل ہوا ۔ قاعدہ: ۔ کسر اعشاریہ کو کسر اعشاریہ سے ضرب دینا ہو تو پہلے نقطہ اعشاریہ کا خیال رکھے بغیر سادہ ضرب دو۔ پھر حاصل ضرب میں دائیں طرف سے گن کر اتنے درجے کے بعد اعشاریہ لگاؤ جتنے مضروب اور مضروب فیہ دونوں میں مل کر مراتب اعشاریہ ہوں ۔		مشق نمبر6 سوال نمبر1 تا سوال نمبر5 سوال نمبر6 تا سوال نمبر10
۶/۷/۵۸ ۷/۷/۵۸		جیومیٹری	متوازی خطوط	تعریف: ۔ متوازی خطوط وہ ہیں جو ایک ہی مستوی سطح میں ہوں ۔ اور جن کو ہم خواہ کتنی ہی دور تک بڑھائیں وہ کبھی آپس میں نہ ملیں اور ان کا درمیانی فاصلہ بھی ہر جگہ یکساں رہے ۔	متوازی خطوط مشق نمبر6 سوال نمبر1 تا سوال نمبر5 سوال نمبر6 تا سوال نمبر10	

ایسے طریقہ سے تمام مضامین کی ڈائری ہر جماعت کے متعلق لکھی جاسکتی ہے اور اس کے مطابق ہر روز کام بھی کرایا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی استاد کسی وقت پڑھائی کے علاوہ اور کسی کام میں مصروف بھی ہو مثلاً رجسٹر کی تکمیل کر رہا ہے یا کسی اور ضروری کام میں مصروف ہے تو جماعت کا مانیٹر یا کسی اہل و محنت کے ڈائری سے دیکھ کر جماعت کے تمام طلبا کو کام میں مصروف رکھے گا اور اس روز کے پیریڈ کا کام بغیر استاد کے بخوبی ہوتا چلا جائے گا۔

اگر استاد خود کام کر رہا ہے تو کسی کام کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں۔ ڈائری پر سے ہی دیکھ کر استاد کام کرا سکتا ہے۔

تاریخ جغرافیہ کے نوٹ اگر استاد کسی وجہ سے نہیں لکھ رہا تو جماعت کا مانیٹر بھی ڈائری سے پڑھ کر جماعت کے تمام طلبا کو لکھوا سکتا ہے جس میں کسی سوال کے غلط جواب ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا اس کے علاوہ استاد کسی جماعت کا ٹیسٹ بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ ڈائری پر سے طلبا کو سوال لکھوائے اور ان کا امتحان لے لیا۔ ہر جماعت کا ٹیسٹ ایک ماہ میں ضرور ہونا چاہیے جس سے ہر لڑکے کی تعلیمی حالت کا پتہ چلتا رہے گا۔

سارجنٹ کوان کا سکول

اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر ایک عام آدمی صحیح عزم کے ساتھ کام کرنا چاہے تو حکومت کی امداد کے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے۔ پاکستان میں بھی کام کرنے کے لیے ایک وسیع میدان ہے اور اس مضمون کے ہیرو کا کردار کام کرنے والوں کو دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔

اوائل مارچ ۱۹۵۵ء کی ایک خوشگوار صبح کا ذکر ہے جنوبی کوریا کی پولیس کا ایک اکیس سالہ سپاہی سیول کی ایک معروف لیکن گرد آلود سڑک پر کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ اس سپاہی کا نام کوآن انگ پال ہے وہ چند روز قبل تک ایک فوجی سپاہی کی حیثیت سے محاذ جنگ پر خدمات انجام دے رہا تھا لیکن اب اس کا یونٹ توڑ دیا گیا ہے اور وہ فوج سے پولیس میں منتقل ہو گیا ہے۔ کوآن کا کام امریکیوں کی ایک کینٹین کے قریب پہرہ دینا اور بھک منگے لڑکوں کی اس فوج کو منتشر کرنا ہے جو چوبیس گھنٹے اس کینٹین کے گرد منڈلاتی اور امریکی فوجیوں کو دق کرتی ہے۔ یہ فاقہ زدہ لیکن چمکتی ہوئی آنکھوں والے لڑکے جن کے بدن پر چند چیتھڑوں کے سوا کچھ نہیں پرلے درجے کے شیطان اور لومڑی کی طرح مکار ہیں وہ اس کینٹین سے چیزیں چرانے کے ایسے ایسے انوکھے طریقے جانتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دن میں جب تک انھیں بڑا ہاتھ مارنے کا موقع نہیں ملتا وہ کینٹین سے کچھ فاصلے پر کوڑے کے ڈھیر کریدتے رہتے ہیں اور وہاں سے جو کچھ مل جاتا ہے اس سے پیٹ کا دوزخ بھر لیتے ہیں۔ رات کو وہ ایک قریبی پل کے نیچے پڑے رہتے ہیں، ان کا کوئی گھر بار نہیں۔ ان میں سے بیشتر یتیم ہیں کیونکہ ان کے ماں باپ کمیونسٹوں کے ساتھ لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔

کوآن انگ پال ابھی ابھی تین مسخرے لڑکوں کو دور تک بھگا کر واپس آیا ہے اور پریشانی کے عالم میں سوچ رہا ہے کہ ان مجرم بچوں کی زبردست فوج پر کس طرح قابو پایا جائے۔ اتنے میں ایک طرف شور مچ جاتا ہے اور کوآن کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کینٹین کے سامنے ایک فوجی ٹرک آ کر رکا ہے جس پر سے اقوام متحدہ کے کچھ سپاہی اتر رہے ہیں، ان کی وردیاں میلی کچیلی، داڑھیاں بڑھی ہوئی اور بوٹ کیچڑ میں لت پت ہیں وہ

غالباً ابھی ابھی محاذ سے لوٹے ہیں۔ ابھی یہ فوجی ٹھیک اترنے بھی نہ پائے تھے کہ بھکاری لڑکوں کا غول ان پہ جھپٹ پڑا، اور ہر ایک نے ان کے آگے دست سوال دراز کر دیا — کوآن کو فوراً اپنا فرض یاد آ جاتا ہے اور وہ پھر ان شیطانوں سے نمٹنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن دفعتاً اس کے قدم رک جاتے ہیں وہ دیکھتا ہے کہ فوجی ان چھوکروں کو اپنے بوٹ کی ٹھوکروں سے پرے ہٹانے کی بجائے ان کے لیے اپنی جیبیں خالی کر رہے ہیں اور بسکٹ، چاکلیٹ، چیونگ گم اور دوسری چیزیں ان میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی ایک چھوٹے سے لڑکے کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کوآن کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آتا — وہ اور آگے بڑھتا ہے — اب اسے اپنی سماعت پر بھی شک ہونے لگتا ہے — وہی سپاہی اس چھوٹے لڑکے سے کہہ رہا ہے۔ "میرے بچے تمہیں بھیک نہیں مانگنی چاہیے۔ ہم تمہارے لیے ایک سکول بنا رہے ہیں۔ جہاں تم پڑھنا لکھنا سیکھ کر اچھے انسان بن جاؤ گے"

کوآن کے دل میں ٹیسیس سی اٹھتی ہے اور وہ سوچتا ہے "اگر یہ غیر ملکی میرے ہم وطنوں کے لیے اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتا"

کوآن کی اسی سوچ نے سیول میں ایک ایسے سکول کی بنیاد ڈال دی جو غالباً دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا سب سے انوکھا ادارہ ہے۔ یہ سکول کوریائی عوام خود چلا رہے ہیں اور اس میں کسی کی امداد یا عطیہ کا کوئی دخل نہیں۔ یہ سکول سارجنٹ کوآن کا شوشائن سکول کہلاتا ہے۔ اسے نہ تو حکومت کی طرف سے کوئی امداد ملتی ہے اور نہ اس کے تینتیس رضاکار استاد کوئی تنخواہ لیتے ہیں۔ سکول کے تمام طالب علم دن میں کام کرتے ہیں۔ کلاسیں شام کے ے پانچ بجے شروع ہوتی ہیں اور ساڑھے نو بجے ختم ہوتی ہیں۔ نصاب تعلیم چھ سے سولہ سال تک کی عمر کے ں اور لڑکیوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور اس کے تحت چھ سال تک ابتدائی اور تین سال تک ، یا ثانوی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب تک اس سکول سے آٹھ سو سولہ بھکاری لڑکے "فارغ التحصیل" ہو کر نکلے ہیں با عزت طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس وقت سکول میں پانچ سو بیس لڑکے اور ایک سو اکیاون لڑکیاں سلیم ہیں۔ ان سب کو مختلف علوم کے علاوہ مفید کاروبار کی یا پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔

آج کوآن کے اس سکول کا تمام سیول میں چرچا ہے لیکن خود کوآن کا کہنا ہے کہ ابتدا میں جب میں نے

اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا تو مجھے اتنی بڑی کامیابی کا گمان تک نہ تھا اور میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں قوم کے ان بچوں کو بہتر زندگی گذارنے میں تھوڑی بہت مدد دے سکوں۔

کوآن کو یہ کامیابی کیوں کر نصیب ہوئی؟ یہ ایک بڑی صبر آزما داستان ہے — بہتر ہوگا اگر آپ اسے کوآن کی زبانی ہی سنیں۔

میرے لیے سب سے پہلی اور بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان لڑکوں کے قریب کیوں کر جاؤں اور انھیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں واقعی ان کا بہی خواہ ہوں۔ پولیس کی وردی سے ان کا خوفزدہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ابتدا میں میری تمام کوششیں رائگاں گئیں کیوں کہ وہ میری بات سننا تو درکنار میری شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ ایک دن مجھے ایک تدبیر سوجھی اور میں نے سڑک پر ایک سیاہ تختہ نصب کر کے اس پر چاک سے بعض آسان الفاظ اور حروف لکھ دیے۔ کچھ بھکاری لڑکے محض اپنے جذبۂ تجسس کی تسکین کی خاطر میرے قریب آ گئے۔ لیکن اب بھی انھوں نے "احتیاطاً" میرے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ میں اگر انھیں پکڑنا چاہوں تو نہ پکڑ سکوں۔ میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ان کی طرف مڑے بغیر کوریائی جنگ کے بعض سورماؤں کی کہانیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ لڑکے کہانی سننے کے شوق میں کچھ اور قریب آ گئے۔ چند کہانیاں سنانے کے بعد میں نے اچانک ان سے پوچھا کہ بورڈ پر کیا لکھا ہے۔ ان میں سے کچھ بھاگ گئے اور کچھ دور ہٹ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پڑھ نہیں سکتا۔

میں نے پوچھا — کیا تم پڑھنا لکھنا پسند کرتے ہو؟ میں تمھیں ایسا کاروبار بھی سکھا دوں گا جس کے بعد تمھیں بھیک مانگنے یا چوری کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان میں سے بعض نے سر ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔ میں ان سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ آج شام مجھ سے بڑے ڈاک خانے میں ملنا (یہ عمارت جنگ میں تباہ ہو کر کھنڈر بن چکی تھی)

شام کو سات لڑکے کوآن کی بتائی ہوئی جگہ پر موجود تھے۔ کوآن نے کھنڈر میں آگ جلائی اور ایک کونے میں تختہ سیاہ جا دیا۔ یہ کوآن کے سکول کی ابتدا تھی۔ اس کے ابتدائی اسباق ا، ب، ج کی شناخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی جنگی کہانیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ چند روز کے اندر بات پھیل گئی اور کوآن کے

ہیں ساٹھ سے زیادہ لڑکے داخل ہو چکے تھے۔

کوآن ان لڑکوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی مسلسل کوشش کرتا رہا کہ دنیا میں کوئی چیز کام کیے بغیر
ں سکتی اور دیانت داری کے ساتھ کام میں جو مزہ ہے وہ بھیک مانگنے یا چوریاں کرنے میں نہیں، کوآن
ں بتایا کہ ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے کارآمد اشیا کس طرح بنائی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی چیز بازار سے
نے کی ضرورت بھی پڑتی تو کوآن اپنی قلیل تنخواہ کے باوجود اس سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان
ں کی وحشی اور بھوکی نظروں میں خود اعتمادی جھلکنے لگی اور وہ کوآن کو حقیقی معنوں میں اپنا دوست اور
د سمجھنے لگے۔

پہلے سال کے خاتمے پر کوآن کے سکول میں طلبہ کی تعداد ایک سو تین تک پہنچ گئی اور اس میں برابر
ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں سے بیشتر دن میں بوٹ، پالش کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ اب ان طلبہ کے لیے
استادوں کا مسئلہ درپیش تھا۔ کوآن نے ہمت نہ ہاری اور سیول کے کالجوں کے پروفیسروں کے پاس پہنچا۔
کے پاس دلیل بڑی موثر تھی اور وہ یہ کہ جب غیر ملکی ہماری مدد کر سکتے ہیں تو کیا ہم اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔

ابتدائی دنوں میں کوآن کا سکول آئے دن ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا، بالآخر دو سال
سے سیول کے وسط میں ایک مستقل جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ جگہ خونریز جنگ کا میدان بنی رہی تھی
لیے تباہی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ کوآن اور اس کے طلبہ نے ملبہ صاف کیا۔ پرانے فوجی خیمے حاصل کیے
ہیں بسیا۔ لکڑیاں سہارے کے لیے تیار کیں اور اس طرح سکول بنا لیا گیا۔ تیسرے سال کے اختتام پر سکول میں
لڑکے داخل ہو چکے تھے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کوآن نے شادی کر لی اور اس طرح کوآن کو اپنی غیر سرکاری
ی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹانے کے لیے ایک اور ہمدرد رفیق مل گیا۔ اس کی بیوی نے کوآن کو سکول میں مخلوط
تعلیم رائج کرنے پر آمادہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یتیم لڑکیوں کو سینا پرونا سکھا دیا جائے تو وہ معصیت کی راہ اختیار
ور طوائف کی زندگی گزارنے سے بچ سکتی ہیں۔ اب کوآن کے سکول میں سات استانیاں بھی ہیں اور کوآن کی بیوی
ب کی سربراہ ہے۔

پولیس کے محکمہ میں کوآن کے افسر ابتدا میں اس کی ان سرگرمیوں کے متعلق چنداں پرامید نہیں تھے۔ لیکن جلد ہی

اس کے کام سے اتنے متاثر ہوئے کہ کوآن کو ترقی دے کر سارجنٹ بنا دیا گیا اور اسے سکول پر پوری توجہ دینے کے لیے دوسرے تمام فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا۔ سکول کے متعلق رپورٹوں سے جنوبی کوریا کے صدر سنگمین ری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے سکول کے بے گھر بچوں کے لیے ہوسٹل بنانے کا حکم دیدیا۔ وزارت معاشرتی بہبود نے ہوسٹل میں رہنے والوں کے لیے چاول مہیا کرنے کی پیش کش کی اور پولیس ہسپتال نے لڑکوں کی صحت کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لیا۔ امریکی نوجیوں نے سکول میں بوائے سکاؤٹ کی تحریک شروع کرنے میں مدد دی، اور اب تک وہاں چار ٹروپ قائم ہو چکے ہیں، جن کے ارکان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔

اس سکول کے لڑکے نظم و ضبط کے اتنے پابند ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ لڑکے اپنے لیڈروں کا خود انتخاب کرتے ہیں اپنے لیے قوانین تیار و نافذ کرتے ہیں اور قانون کا انتہائی سختی سے احترام کرتے ہیں غالباً اس لیے کہ ان کا سرپرست ایک پولیس والا ہے۔

کوآن کا عقیدہ ہے کہ کردار کی تعمیر کا کوئی منصوبہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد مذہب پر نہ رکھی جائے۔ اسی لیے وہ تمام لڑکوں کو ہفتے میں دو بار گرجے لے جاتا ہے۔

سکول کے ابتدائی پانچ سالوں میں کوآن اپنے طلبہ کو بوٹ پالش کے سوا اور کوئی تربیت نہ دے سکا۔ اگرچہ وہ اسے روزی کمانے کا ایک باعزت طریقہ کہتا ہے۔ لیکن اس کی دلی خواہش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ ان لڑکوں کے لیے دوسرے پیشوں مثلاً بڑھئی۔ الیکٹریشن۔ پینٹر اور درزی وغیرہ کے کام کی بھی تربیت کا انتظام کر سکے کوآن کی یہ خواہش ۱۹۵۷ء میں پوری ہوئی جب کوریا کی تعمیر نو کے مشن کے سربراہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے لفٹنٹ جنرل جے بی کوٹر سیول پہنچے۔ انہوں نے کوآن کے سکول میں ورکشاپ قائم کرنے کے لیے مشینیں فراہم کرنے کے لیے پانچ ہزار ڈالر کا عطیہ دیا۔ اور پھر ورکشاپ کے لیے مشینیں فراہم کرنے کے لیے نیویارک کے رفاہی اداروں سے بھی روپیہ دلایا۔ اس وقت سکول کے دو سو لڑکے مختلف پیشے سیکھ رہے ہیں۔ انھیں تربیت دینے والے کوریائی کاریگر ہیں جو کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔

صدر سنگمین ری نے جنھیں کوآن کے اس سکول پر فخر ہے حکم دیا ہے کہ ملک میں اسی قسم کے اور سکول قائم کیے جائیں۔

...مات عامہ

...میں خواتین کے ادارے

...طانیہ کی دس لاکھ سے زائد عورتیں، خواتین کے تقریباً ایک ہزار اداروں سے تعلق رکھتی ہیں جو ملک کے ...ں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ذیل میں وینڈی ہال نے ان اداروں کے بارے روشنی ڈالتے ہوئے ...یہ ادارے کیا کرتے ہیں اور عورتیں کیوں اس قدر ذوق و شوق کے ساتھ ان میں شامل ہوتی ہیں۔

...ادارۂ خواتین حقیقت میں دیہاتی عورتوں کے لیے ایک قسم کا کلب ہوتا ہے۔ اگر آپ انگریزی ...یں رہنے کے لیے جائیں اور آپ کو لوگوں کے متعلق جاننے، تقریریں سننے، دستانے بنانے، ڈراموں ...ادا کرنے یا اسی قسم کے دوسرے مشاغل کا شوق ہو تو آپ مقامی ادارۂ خواتین میں شامل ہو جائیں ...ضا کارانہ انجمن ہے۔ جسے مقامی خواتین اپنے فاضل اوقات میں چلاتی ہیں اور یہ قومی فیڈریشن کا ایک جزو ہے۔

...ن اداروں کا مقصد دیہاتی زندگی کے حالات کو ترقی دینا ہے۔ یہ بات بڑی سنجیدہ معلوم ہوتی ہے لیکن ...کو باور کرا سکتی ہوں کہ عورتوں کے یہ ادارے سنجیدہ اور خشک ذرا بھی نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے ...روں کے زیر اہتمام جو اجتماع ہوتے ہیں ان میں خواتین جس قدر خوش و خرم اور پُر مذاق نظر آتی ...ہی کسی دوسرے اجتماع میں نظر آتی ہوں۔

ان خواتین میں سے اکثر و بیشتر کاشتکاروں کی بیویاں اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کو ...کے مختلف پیشہ وروں کی رشتہ دار ملیں گی۔ مثلاً ڈاکٹر کی بیوی۔ قصائی کی بہن۔ اسکول کی معلمہ، نرس ...کی اہلیہ وغیرہ۔ یہاں ہر عمر کی عورتیں آتی ہیں۔ ان میں آپ ۷۰ سالہ توانا بوڑھی خاتون کو بھی دیکھیں گی ...ڈرامہ گروپ کی مدوح رواں ہیں اور جوں ہی ان کی پوتی ۱۶ سال کی ہو جائے گی یہ اسے بھی اداکی ...نے کے لیے لے آئیں گی۔

ادارہ کا ہر ماہ ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں ادارہ کے بارے میں اراکین بحث و مباحثہ کرتی ہیں مستقبل کے منصوبے بناتی ہیں اور مالیات پر رپورٹ سنتی ہیں۔ یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ادارہ کی رکنیت کے لیے سالانہ چندہ صرف تین شلنگ چھے پنس مقرر ہے۔ جو بیس سگریٹ کے ایک پیکٹ کی قیمت سے بھی کم ہے۔ بنابریں ادارہ کو روپیہ صرف کرنے کے سلسلے میں بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ متعلقہ امور پر بحث و مباحثہ کے بعد عام دل چسپی کے موضوع پر تقریریں ہوتی ہیں۔ مثلاً آرٹ موسیقی یا امور خارجہ۔ کبھی کبھی کپڑا سینے اور کھانا پکانے کے بھی مظاہرے ہوتے ہیں۔ چائے نوشی کے دوران میں ممبر آپس میں خوش گپیاں کرتے ہیں اور چائے کے بعد آدھا گھنٹہ کھیلوں اور موسیقی کے لیے مخصوص ہے۔

ماہانہ اجتماع کے ساتھ ساتھ باقاعدہ کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ ہر سال ادارہ کی ممبر یہ طے کرتی ہیں کہ آیا وہ کیا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں اور اسی کے مطابق کلاسیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ اگر وہ طے کرلیں کہ علمی مضمون سیکھیں گی۔ مثلاً کھانا پکانا۔ گھریلو دستکاریاں یا نرسنگ وغیرہ تو اسی کا بندوبست کردیا جاتا ہے۔ قومی یا بین الاقوامی دل چسپی کے کسی موضوع کا بھی وہ انتخاب کرسکتی ہیں۔ پھر بہت سے اداروں کے پاس ان کا اپنا سماع خانہ۔ ڈرامہ گروپ اور لوک ناچ گروپ ہیں۔ اوپر کے مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خواتین کے یہ ادارے کس طرح دیہاتی زندگی کو سنوارنے میں اپنے ممبروں کی مدد کرتے ہیں۔

چارلز ڈارون

"چارلز ڈارون نے قدرتی انتخاب کے ذریعے ارتقا کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس کی اشاعت کی صد سالہ سالگرہ جولائی ۱۹۵۸ء میں منائی گئی۔ اس موقعہ پر چارلز ڈارون کے پوتے سر چارلز ڈارون سے جو خود بھی ایک ممتاز سائنسدان اور فیلو آف دی رائل سوسائٹی (لندن) ہیں۔ درج ذیل مضمون لکھنے کی بطور خاص درخواست کی گئی۔"

نظریہ ارتقا کی پہلی بار اشاعت آج سے سو برس پہلے عمل میں آئی تھی۔ اب یہ بات عام طور پر

تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہماری زمین پر زندگی کی ترقی کا صحیح اندازہ اسی نظریہ کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے یہ نظریہ سب سے پہلے ان مقالوں کی صورت میں شائع ہوا جو لِن نائن سوسائٹی میں پڑھے گئے۔ ان مقالوں کے مصنف چارلز ڈارون اور الفریڈ رسل ویلیس تھے۔ ان مقالوں کی تاریخ خاصی عجیب و غریب ہے۔

ڈارون کے ذہن میں سب سے پہلے اس نظریہ کا خاکہ ۱۸۳۵ء میں، اشاعت سے تقریباً بیس برس قبل مرتب ہوا۔ اس وقت وہ شاہی بحریہ کے سروے کرنے والے جہاز بیگل میں مطالعہ قدرت کے ایک ماہر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس جہاز نے کم و بیش پانچ برس جنوبی امریکہ کے ساحل کے ارد گرد گذارے۔

ان دنوں نظریہ کا تصور ایک انقلابی خیال تھا جن میں بہت سی مشکلات مضمر تھیں۔ اس لیے ڈارون اس نظریہ کو دنیا کے روبرو پیش کرنے کے سلسلے میں بڑے محتاط رہے۔

دو تحریریں :- اس نظریہ کے متعلق ۱۸۴۲ء میں ڈارون نے ایک مختصر سا نوٹ لکھا تھا جو اب بھی محفوظ ہے۔ اس کے بعد ۱۸۴۴ء میں انھوں نے پھر اسی موضوع پر ایک نوٹ لکھا جو پہلے کی نسبت زیادہ جامع اور مبسوط ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے درخواست کی تھی کہ اگر ان کا انتقال ہو جائے تو اس نوٹ کو شائع کر دیا جائے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے خاموشی اور دل جمعی کے ساتھ اس نظریہ پر کام شروع کر دیا اور سترہ برس تک اس کی تفاصیل اور جزئیات مرتب کرتے رہے اس دوران میں بھی وہ نظریہ کی تکمیل سے قبل اس کی اشاعت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

ان دنوں لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ جانوروں یا پودوں کی تمام اقسام الگ الگ تخلیق کی گئی ہیں۔ لیکن اس بارے میں کسی کا ذہن صاف نہ تھا کہ یہ تخلیق کس طرح عمل میں آئی۔ اس کے باوجود مختلف پیش رو مصنفین کی تحریروں سے ان کے اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ مختلف قسم کے جانوروں کے درمیان مشابہت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایک ہی ہوں۔ اور بعد ازاں یہ جانور مختلف عوامل کے باعث اپنے آباؤ اجداد سے بدل گئے ہوں۔

یہ خیال پیش کرنے والوں میں خود چارلز ڈارون کے دادا اراسمس پیش پیش تھے۔ وہ

اٹھارھویں صدی کے ایک ممتاز ڈاکٹر تھے. اور انھیں اپنے وقت میں خاصہ اچھا شاعر بھی تصور کیا جاتا تھا (ویسے ان کی شاعری کو آج کچھ زیادہ درجۂ اقتدا نہیں سمجھا جاتا) ابتدائی مصنفین اور چارلز کے نظریات میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ ان مصنفین نے اس امر کی وضاحت نہیں کی تھی کہ آخر جانور اپنے آباؤ اجداد سے کیوں بدل گئے۔ چارلز کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تبدیلی کی وضاحت بھی پیش کی انھوں نے بتایا کہ اس کا سبب بقا کی وہ ازلی جدوجہد ہے جس سے تمام جانوروں اور پودوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے. ان میں سے صرف وہی باقی رہ جاتے ہیں جو اس جدوجہد میں پورے اترتے ہیں اور کمزوروں اور ناکاموں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔

اس نظریہ کی صحت ثابت کرنے کے لیے ڈارون کو بہت کچھ کام کرنا تھا. کیوں کہ اسے تسلیم صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا تھا جب ہر جانور اور اس کے آباؤ اجداد کے درمیان ترقی کے تدریجی مراحل موجود ہوں اور یہ ظاہر کیا جا سکے کہ ہر مرحلے میں ہر جانور کی خصوصیات اپنے والدین کی خصوصیات سے قدرے مختلف ہیں۔ اگر ایک بھی جانور ایسا نکل آتا جس کی ترقی کے تدریجی مراحل کا تعین نہ کیا جا سکتا تو پھر یہ نظریہ ناکام ہو جاتا۔

مزید برآں ڈارون کو جہد فی البقا کا بھی مطالعہ کرنا تھا کیوں کہ اسی سے یہ پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ والدین کی خصوصیات سے کسی قسم کا اختلاف کامیاب ثابت ہو سکتا ہے. یہ کام چارلز ڈارون نے زیادہ تر دوسرے سائنسدانوں کی تصانیف کے تفصیلی مطالعے کے ذریعہ انجام دیا. لیکن انھوں نے اس سلسلے میں خود بھی بہت کچھ کیا اور اپنے مکان ڈاؤن ہاؤس کے باغ میں کئی تجربات کیے۔

میں اس باغ سے اچھی طرح واقف ہوں، کیوں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ میرے دادا میری ولادت سے پانچ سال قبل انتقال کر گئے تھے، میری دادی اپنی وفات تک اسی مکان میں رہیں۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر دس برس تھی۔ ڈاؤن ہاؤس، کینٹ میں ہے اور سنٹرل لندن سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے. لیکن اس کے باوجود یہ اب تک خالص دیہاتی علاقہ ہے. گذشتہ برسوں میں اس مکان یا باغ میں شاید ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہو۔ اب اس کے چند کمرے میوزیم کے طور

محفوظ کردیے گئے ہیں۔

چارلز ڈارون نے اس باغ میں ایک جگہ رہنے والے مختلف جانوروں یا پودوں کے درمیان بقا کی جدوجہد کا مطالعہ کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے تجربہ کے طور پر چھ مربع فٹ کے ایک قطعہ اراضی قطعہ سے گھاس بالکل نکلوا دی اور اس کے بعد اس امر کے مشاہدے میں مصروف ہو گئے کہ اب کس قسم کی روئیدگی زمین سے سر نکالتی ہے۔ اس قطعہ میں تین سو ساٹھ جنگلی جھاڑیاں پھوٹیں لیکن ان میں سے دو سو بچانوے کو کیڑے مکوڑوں نے تباہ کر دیا اور اس سے ظاہر ہوا کہ پودوں کی شرح اموات کتنی خوفناک حد تک زیادہ ہے۔ ایک اور نتیجہ چارلز ڈارون نے اس طرح اخذ کیا کہ انھوں نے ایک شدید موسم سرما کے بعد باغ میں چڑیوں کے تمام گھونسلے گن لیے اس وقت انھیں پتہ چلا کہ باغ کی پانچ چوتھائی چڑیاں ہلاک ہو چکی ہیں، یہ مشاہدات قدرت کی جس سنگ دلی کے مظہر ہیں ان دنوں بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوتا تھا۔

چارلز ڈارون نے یہ کام بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ برسوں جاری رکھا اور اس دوران میں وہ اشاعت کے لیے معلومات کا بھاری ذخیرہ جمع کرتے رہے۔ اچانک انھی دنوں ایک بحران پیدا ہو گیا ۱۸۵۸ء میں انھیں ویلیس کا ایک خط موصول ہوا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھے اور ان دنوں ملایا میں جانوروں اور پودوں کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ویلیس نے لکھا تھا کہ انھوں نے ایک نظریہ ارتقا مرتب کیا ہے اور وہ اسے اشاعت کی غرض سے منگوالیں۔ یہ نظریہ بالکل ویسا ہی تھا جس پر خود چارلس ڈارون گذشتہ بیس برس سے کام کر رہے تھے۔ اب کیا کیا جاتا، چارلز ڈارون نے پہلے تو یہ سوچا کہ وہ ویلیس کا مقالہ اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ لیکن بالآخر انھوں نے اس سوال کا فیصلہ حیاتیات کے دو ماہروں لی آیل اور ہوکر پر چھوڑ دیا۔ لی آیل اس وقت کے سب سے بڑے جیولوجسٹ تھے اور ہوکر ایک مشہور ماہر نباتات تھے۔ ان دونوں نے بلاشبہ یہ درست فیصلہ دیا کہ یہ دونوں (چارلز ڈارون اور ویلیس) یعنی نائن سوسائٹی کی ایک ہی نشست میں اپنے اپنے مختصر مقالے پڑھ دیں اور اس کے بعد دونوں کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ اپنے نظریات اشاعت کے لیے دے دیں۔ اس سال انھی دونوں مقالات کی بیس

سالگرہ منائی گئی ہے۔ اس کے بعد ڈارون نے وہ تمام معلومات یکجا کرنی شروع کر دیں جو وہ ایک طویل عرصے ذخیرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ معلومات کتابی صورت میں شائع کر دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کتاب اس عظیم کتاب کا صرف اقتباس ہے جو وہ بعد ازاں اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ ان کی کتاب ہی تھی جس نے کرۂ ارض پر زندگی کے متعلق ہر شخص کے خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔

لندن میں زراعتی نمائش

آج ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ لندن میں اسمتھ فیلڈ نامی نمائش منعقد ہوئی تھی۔ اس کی ابتدا مویشیوں کی نمائش سے ہوئی تھی اور اب اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین نمائشوں میں ہوتا ہے۔ اب یہ نمائش صرف مویشیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کی زراعتی مشینری اور دوسرے ساز و سامان کی بھی نمائش کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۷ء کی نمائش گذشتہ تمام سالوں سے بڑھ گئی تھی۔ لندن کے زراعتی نامہ نگار مسٹر پیٹر گائلز کی ذیل کی رپورٹ اسی نمائش کے بارے میں ہے۔

مقامی زراعتی نمائشیں عام طور پر بڑے شہروں کے باہر ہوتی ہیں۔ اور ایسے ہی مقامات کئی اعتبار سے بڑے موزوں ہوتے ہیں، کیوں کہ منشا یہی ہوتا ہے کہ دیہات سے متعلق اشیا وہاں کے باشندوں کو دکھائی جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اہم زراعتی نمائشیں شہروں کے مستقل نمائشی کمروں میں جاڑے کے موسم میں منعقد ہوتی ہیں۔ چناں چہ عظیم ترین زراعتی نمائش اسمتھ فیلڈ مویشی و زراعتی نمائش کے نام سے مشہور ہے اور یہ لندن کے مرکزی علاقہ میں ارلس کورٹ کے نمائشی کمروں میں منعقد ہوتی ہے۔ چناں چہ عظیم ترین زراعتی نمائش اسمتھ فیلڈ مویشی و زراعتی نمائش کے نام سے مشہور ہے اور یہ لندن کے مرکزی علاقہ میں ارلس کورٹ کے نمائشی کمروں میں منعقد ہوتی ہے۔

۱۹۵۶ء کی نمائش میں اکہتر ہزار پانچسو افراد نے شرکت کی تھی جن میں غیر ممالک سے آئے ہوئے ڈیڑھ ہزار کے قریب مہمان بھی شامل ہیں۔ ۱۹۵۷ء کی نمائش جو ۲ دسمبر سے ۷ دسمبر تک رہی سابقہ سال کی نمائش سے بڑھ گئی تھی۔ یقینی طور پر یہ سب سے شاندار نمائش تھی۔ اسمتھ فیلڈ کی نمائش ۱۷۹۸ء سے ہو رہی ہے۔ یعنی ٹھیک ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ سے۔ نمائش کا علاقہ ڈھائی لاکھ مربع فٹ کے

رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سب علاقہ چھت دار ہے۔ اور اس ایک عظیم سائبان کے نیچے ڈیڑھ ہزار سے کہیں زیادہ بھیڑیں اور گائیں اکٹھے ہوتے ہیں اور زراعتی کل پرزے اور دوسرا زراعتی سامان علیحدہ۔

برطانیہ اچھی نسل کے مویشیوں، بھیڑوں اور دیگر جانوروں کے گلوں کی صدیوں سے مشفقت آمیز غور و پرداخت کی جا رہی ہے۔ ہیرفورڈ کے مویشیوں اور سفوک کی بھیڑوں کی مخصوص نسل نے ایک خاص علاقہ میں نشوونما پائی ہے۔ برطانوی نسل کے مویشیوں میں جبلتی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اسی لیے مویشیوں کی اعلیٰ نسل کی افزائش کے لیے دنیا بھر میں یہ نسلیں استعمال ہوتی ہیں۔ اسمتھ فیلڈ نمائش کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ایک سہ پہر کو آپ ان مشہور نسل کے تنومند مویشیوں کو بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ دس ہزار پونڈ کی مالیت کے دنیا کے بہترین گوشت دار جانور کو آپ قریب سے دیکھ سکتے ہیں اس کو تھپک سکتے ہیں۔ باہر کے مہمانوں کے لیے نمائش میں کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا وہ منتظمین نمائش کے خصوصی مہمان ہوتے ہیں۔

شاید یہ امر باعث حیرت ہو کہ یہ نمائش اسمتھ فیلڈ کے نام سے کیوں مشہور ہے جبکہ فی الحقیقت یہ ارلس کورٹ میں منعقد ہوتی ہے۔

جارج سوم کے دور حکومت میں پہلی اسمتھ فیلڈ نمائش لندن کے عظیم گوشت کے بازار اسمتھ فیلڈ میں ہوئی تھی لیکن کافی عرصہ ہوا کہ یہ نمائش وہاں سے منتقل ہو کر مختلف دوسرے مقامات پر ہوتی رہی اور آج کل ارلس کورٹ میں منعقد ہوتی ہے۔

جب سے جارج سوئم نے بعض اپنے مویشی نمائش میں بھیجنے کی طرح ڈالی ہے اسمتھ فیلڈ کی نمائش سے شاہی دلچسپی بھی اسی وقت سے وابستہ چلی آئی ہے۔

نادر اشیا کا گھر

برٹش میوزیم لندن یونیورسٹی کے مرکزی علاقہ میں واقع ہے اور اپنے قیمتی خزانوں اور نادر اشیا کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ برطانوی حکومت نے ۱۷۵۳ء میں اسے قائم کیا تھا۔ آج کل یہ دنیا بھر سے حاصل کی ہوئی نایاب اور نادر اشیا کا مخزن ہے۔

اس میوزیم پر ۵ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا ہے جن لوگوں کو میوزیم کے دیکھنے کا اتفاق

ہوا ہے وہ اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی پر روپیہ جائز اور صحیح طور پر صرف ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک مشرقی باشندہ کے مجھے ان آثار سے زیادہ دلچسپی تھی جو ہمارے خطہ سے یا ان تہذیبوں سے متعلق ہیں جن کا میری تہذیب سے واسطہ رہا ہے۔ میں نے میوزیم میں چند ایسی دستاویز اور نادر اشیا بھی دیکھی ہیں جن کا ثانی ملنا مشکل ہے۔

قرآن پاک :- یہاں ایک خوبصورت گیلری میں کچھ ایسی کتابیں موجود ہیں جو جارج چہارم نے میوزیم کو پیش کی تھیں۔ وہیں شیشے کے خانہ میں سات جلدوں پر مشتمل ایک قرآن شریف نظر آیا جس کے عنوانات سنہرے اور نیلے جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن پاک سنہ ۱۳۰۴ء میں سلطان الناصر محمود بن قلون کے حاجب نے بحر ملوک رکن الدین بیبرس کے لیے نقل کیا تھا۔ نیلے رنگ کی تحریر آج بھی اسی قدر پختہ ہے جس قدر تحریر کے وقت ہوگی۔

میں اس بات سے اور بھی متاثر ہوا کہ میوزیم کے ارباب اقتدار اسلامی دستاویزات کی مسلسل نگرانی کرتے ہیں ان کی حالت کو خراب ہونے سے بچانے اور انھیں ہر طرح محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن سائنسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ البتہ یہ ان طلبا اور محققین کو دی جاتی ہیں جو میوزیم میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ خود میوزیم کے کتب خانہ میں تقریباً ہر زبان کی ساڑھے لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ ہر مشرقی زبان کا ایک مخصوص شعبہ ہے۔ درازوں کی مجموعی لمبائی پچھتر میل ہے۔

یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ برطانوی سیاح ماضی کی عام تہذیبوں کے آثار کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ ان کو محض تعجب یا تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ ان مرحوم ہستیوں کی جنھوں نے آرٹ اور ثقافت کی دنیا پر گہرا اثر ڈالا ہے احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

فارسی خوش نویسی اور خطاطی کا ایک دوسرا نادر نمونہ جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا صفوی دور کا لکھا ہوا کلیات سعدی تھا جو سنہ ۱۵۶۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے رنگ کا بجنسہ محفوظ رہنا کاتب کی مہارت فن اور میوزیم کے ارباب اقتدار کی کارکردگی کا بیّن ثبوت ہے ٭

(•)

تباہ شدہ جہازوں کے مسافروں کی امداد

گزشتہ ایک سو تیس سال کے عرصہ میں رضاکاروں نے برطانوی ساحلوں کے اردگرد اکیاسی ہزار سے زائد ایسے لوگوں کی جانیں بچائی ہیں جو جہازوں کے تباہ ہو جانے یا بھنور میں پھنس جانے کی وجہ سے سخت خطرہ سے دوچار ہو گئے تھے۔

رائل نیشنل لائف بوٹ انسٹی ٹیوشن (شاہی قومی حفاظتی کشتیوں کا ادارہ) اپنی قسم کی سب سے بڑی رضاکار تنظیم ہے جس کی زیر نگرانی ایک سو چھپن حفاظتی کشتیاں ہیں برطانوی جزائر کے ساحلوں پر ایک سو اکیاون لائف بوٹ اسٹیشن موجود ہیں۔ یہ تنظیم رضاکارانہ چندوں سے اپنا کام چلاتی ہے۔ جہاز کے عملہ کے افراد اس کے رضاکار ہیں۔ چناں چہ برطانیہ کے ساحلوں پر کام کرنے والے ماہی گیر اور کشتی بان ہر وقت خدمت سرانجام دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کی بات ہے جبکہ تباہ شدہ جہاز سے متاثرہ ملاحوں کو امداد دینے کے سلسلہ میں بیم برا (نارتھمبرلینڈ) میں ایک انجمن معرض وجود میں آئی۔ سنہ ۱۷۲۱ء میں ڈرہم کے بشپ، بیرن کریو سوم کی وفات کے موقع پر ایک ٹرسٹ کے ناظم نے ان تجربات کی حوصلہ افزائی کی جن کا مقصد ایسی کشتی تعمیر کرنا ہو جو ڈوب نہ سکے ـــ دنیا میں سب سے پہلے تعمیر ہونے والی حفاظتی کشتی کو سنہ ۱۷۹۰ء میں پانی میں اتارا گیا تھا اور یہ چالیس سال تک خدمات سرانجام دیتی رہی۔

۱۷۸۹ء اور ۱۸۲۴ء کے عرصہ میں برطانیہ میں نجی کوششوں سے تقریباً چالیس حفاظتی کشتیوں کی انجمنیں قائم کیے گئے۔ ۱۸۲۳ء میں ایک کتابچہ شائع ہوا جس کا عنوان تھا برطانوی قوم سے انسانیت کے نام پر اپیل غرق شدہ جہازوں سے متاثرہ افراد و املاک کی حفاظت کے لیے انجمن کا قیام اس کے مصنف سرولیم ہلیری جزیرہ مان کے باشندے، سیاح، سپاہی، انشا پرداز اور ڈگلس نامی حفاظتی کشتی کے عملے کے باقاعدہ رکن تھے

دوسرے سال کے شروع میں لندن کے ایک اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں تجویز کیا گیا تھا برطانوی ساحلوں میں جہازوں کے تباہ ہو جانے کی صورت میں جانیں بچانے کے لیے ایک ایسی ہی انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے اور جس کا نام تباہ شدہ جہازوں سے جانیں بچانے والا قومی ادارہ رکھا جائے۔

اس طرح برطانیہ کا وہ پہلا ملک تھا جس کے ہاں قومی لائف بوٹ سروس کا سب سے پہلے آغاز ہوا۔ بیس سال کے بعد اس انجمن کا نام رائل نیشنل لائف بوٹ انسٹی ٹیوٹ رکھ دیا گیا۔

۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک کے زمانہ کو چھوڑ کر جس میں اس کو سرکار کی جانب سے سالانہ امداد ملتی رہی ہے۔ ہمیشہ سے یہ رضاکارا ادارہ چلا آرہا ہے۔ آج بھی اس کی آمدنی کا ذریعہ تحائف، آورثے، چندے اور عطیات ہیں۔

۱۹۱۷ء میں اس ادارہ پر ۹ لاکھ ۵۰ ہزار پونڈ صرف ہوئے جبکہ اس کی کل آمدنی ۹ لاکھ ۷ ہزار آٹھ سو پونڈ تھی۔ اخراجات کی سب سے بڑی مد حفاظتی کشتیوں اور اسٹیشنوں کی دیکھ بھال اور نئی تعمیر ہے۔ آج کل معیاری قسم کی کشتیاں جو زیر استعمال ہیں ان میں وارنٹ نامی کشتی بھی ہے جس کی لمبائی ۵۲ فٹ ہے اس ۷۲ ہارس پاور کی کشتی میں عملہ کے آٹھ آدمیوں کے علاوہ ایک سو آدمیوں کی نشست کا انتظام ہے۔ اس کشتی کی تعمیر میں اڑتیس ہزار پانچسو پونڈ صرف ہوئے ہیں۔ سب سے چھوٹی کشتی "لیور پول" کی لمبائی ۳۵ فٹ ہے جس میں تیس آدمی بیٹھتے ہیں اور جس کی قیمت ۱۷ ہزار پونڈ ہے۔ ان کشتیوں کے بنانے پر زیادہ لاگت کا آنا تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ خاص اہتمام کے ساتھ بنائی جاتی ہیں اور ایسے طوفان خیز وقت میں سمندر میں جاتی ہیں جبکہ شدید ہوا اور لہروں سے دوسری تمام کشتیاں پناہ لینے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں سات سو سے زیادہ موقعوں پر حفاظتی کشتیاں مصیبت میں مبتلا جہازوں اور طیاروں کے لیے پہنچائی گئی تھیں جنھوں نے چھ سو انسانی جانیں بچائیں۔ علاوہ ازیں ان حفاظتی کشتیوں کے ذریعے ایک سو چوالیس جہاز تباہ ہونے سے بچائے گئے اور ایک سو چوہتر جہازوں کی دوسرے مختلف طریقوں سے امداد کی گئی چھوٹی کشتیاں، مثلاً ہلکی بادبانی کشتیاں ڈونگے اور بھاپ یا بجلی کی قوت سے چلنے والی کشتیاں بے حد مقبول ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ مانگ ہے اور ان کے مقابلہ میں ماہی گیری کی کشتیاں دوسرے نمبر پر ہیں

۱۹۶۶ء میں طیاروں کے عملوں اور مسافروں کی مدد کرنے کے لیے چالیس موقعوں پر حفاظتی کشتیاں سمندروں میں ڈالی گئیں۔ جولائی اور اگست سب سے زیادہ مصروفیت کے مہینے ہیں کیوں کہ تعطیلات میں کشتی رانی کے شغل کی مقبولیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

حفاظتی کشتیوں کے ادارہ کی سب سے زیادہ مصروفیت کا زمانہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۶ء کی شام کے بعد چوبیس گھنٹے تھے، جبکہ بہت سے ساحلوں پر ہوا کی رفتار اٹھاسی میل فی گھنٹہ تھی۔ کل باون کشتیاں سمندر میں ڈالی گئی تھیں جنھوں نے ایک سو سے زیادہ افراد کی جانیں بچائیں چودہ جہازوں کو تباہ ہونے سے بچایا اور سات دوسرے جہازوں کی مدد کی۔

برطانیہ میں طلبا کے شب و روز

اس مختصر سے جائزہ میں لندن یونیورسٹی کے متعدد شعبوں کا تذکرہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ لندن سکول آف اکنامکس میں سیاسیات اور بعض آرٹ کے مضامین کی تعلیم کے علاوہ انسانیات۔ نوآبادیات۔ پبلک نظم و نسق۔ بین الاقوامی امور، تجارتی نظم و نسق اور ٹریڈ یونین جیسے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں اور ان میں ڈپلومے دیے جاتے ہیں۔

مشرقی اور افریقی علوم کے اسکول اور مشرقی یورپ کے اسکول میں بہت سی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں لندن اسکول آف ٹراپیکل میڈیسن اینڈ ہائی جین (گرم ممالک کے لیے ادویہ و حفظان صحت کا ادارہ) گرم ممالک کی بیماریوں کی تحقیقات و تعلیم کا اہم عالمی مرکز ہے۔ گرم ممالک کی بیماریوں اور مچھر میں جو تعلق ہے اس کے محقق سر پیٹرک مینسن نے یہ اسکول قائم کیا تھا۔ اسی قسم کا ایک دوسرا طبی اسکول لیڈز میں واقع ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (ادارۂ تعلیم) انسٹی ٹیوٹ آف کامن ویلتھ اسٹڈیز (ادارہ برائے امور دولت مشترکہ) وائی کالج آف ایگریکلچر (زراعت کا کالج جو کینٹ میں واقع ہے) بارٹ لیٹ اسکول آف آرکیٹکچر اینڈ ٹاؤن پلاننگ (تعمیرات و شہری منصوبہ بندی کا اسکول) اور رائل وٹیرنیری کالج (جانوروں کے علاج کا کالج) لندن یونیورسٹی کے خاص شعبے ہیں۔

امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن میں فنی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ لندن

یونیورسٹی کی ایک شاخ ہے جو رائل کالج آف سائنس اور رائل اسکول آف مائنز اینڈ سٹی اینڈ گیلڈز کالج پر مشتمل ہے۔ آج کل امپیریل کالج میں دو ہزار طلبا ہیں لیکن اس کو وسعت دینے کی کوششیں برابر جاری ہیں تاکہ اس میں تین ہزار طلبا تعلیم حاصل کرسکیں۔

موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، ڈرامہ، اور ناچ سکھانے والے ادارے طلبا کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ تمام برطانوی یونیورسٹیوں میں موسیقی ڈگری کورس کے ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کام زیادہ تر نظریاتی ہے۔ یہاں بہت سے ایسے ادارے بھی ہیں جن میں موسیقی کی عملی تعلیم دی جاتی ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ادارے رائل اکیڈیمی آف میوزک، گلڈ ہال اسکول آف میوزک اور رائل کالج آف آرگنسٹس (لندن) اور رائل مانچسٹر کالج آف میوزک (مانچسٹر) ہیں۔ یہ سب ادارے موسیقی میں ڈپلومے دیتے ہیں۔

نو یونیورسٹیاں آرٹ میں ڈگریاں دیتی ہیں۔ یہاں پھر یہ کورس زیادہ تر تاریخ، نظری علوم اور تنقید سے متعلق ہیں۔ لندن اور دوسرے مقامات پر آرٹ کے بہت سے اسکول اور کالج ہیں، جو عملی تربیت کے پورے وقت کے کورس فراہم کرتے ہیں۔ رائل کالج آف آرٹ اور سینٹرل اسکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس (جن میں صنعتی ڈیزائن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے) سلیڈ اسکول آف فائن آرٹس (لندن یونیورسٹی) اور رائل اکیڈیمی اسکول (جہاں ممتاز آرٹسٹ، بغیر کسی معاوضہ کے تعلیم دیتے ہیں، جنھیں رائل اکیڈیمیشن کا خطاب ملا ہوا ہے) لندن میں فنون لطیفہ کے ممتاز ترین ادارے ہیں۔ برطانیہ کے بعض آرٹ کالج اس علاقہ کی دست کاری میں خصوصی تعلیم کا انتظام رکھتے ہیں جن میں کہ وہ واقع ہیں۔ مثلاً کڈرمنسٹر آرٹ اسکول، ایک ایسے ضلع میں واقع ہے جو قالینوں کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔ چناں چہ اس اسکول میں قالین کے ڈیزائن وغیرہ بنانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسٹوربرج میں شیشے کے ڈیزائن کا کام سکھایا جاتا ہے، اور اسٹوک۔آن۔ٹرینٹ میں ظروف سازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ڈرامہ اور سنگیت کے طلبا کے لیے ہر قسم کے ڈراما ٹک اسکولوں کی تمام برطانیہ میں کثرت ہے۔ رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ (لندن) یہاں اداکاری کے تمام شعبوں پر مشتمل دو سالہ نصاب مقرر ہے۔ بیڈلز ویلو اسکول

جہاں ناچ اور سنگیت کی عام تعلیم و تربیت کا انتظام ہے اور اولڈوک اسکول (برسٹل) یونیورسٹیوں نے مختلف طریقوں سے ڈرامہ کو تسلیم کیا ہوا ہے۔ برسٹل یونیورسٹی نے اسے ڈگری کورس کا ہی ایک جزو بنا دیا ہے۔

پھر ایک مخصوص اور بالکل مختلف قسم کی نوجوان طلباء کی جماعت ہے۔ جسے بحری بری اور فضائی فوجوں کی قیادت کرنے کی تربیت دی جارہی ہے اور اس طرح وہ لیاقت اور دانشمندی سے ان بھاری ذمہ داریوں کو پورا کریں گے جو آزاد دنیا کے دفاع میں بطور ایک شریک کے برطانیہ پر عاید ہوتی ہیں۔

برٹینیا رائل نیوی کالج (ڈارٹ ماؤتھ) رائل ملٹری اکیڈیمی (سینڈہرسٹ) اور رائل ایئر فورس کالج (کارن ویل) میں طلباء نہ صرف فنی تربیت ہی حاصل کرتے ہیں جو انھیں ان کے پیشے میں ماہر بنا دے گی بلکہ عام آزاد خیال تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تعلیم کا اصل مقصد فوجی طالب علم کو مستقبل کا بہترین ملاح سپاہی یا ہوا باز بنانا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسے ملک کا ایسا خود اعتماد شہری بھی بنانا ہے جو اپنے زمانے کے مسائل بخوبی پرکھتا ہو اور ان پر فیصلے دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ان مشہور و معروف اداروں میں سے ہر ایک ادارہ اپنی جگہ ایک چھوٹی یونیورسٹی ہے۔ ان اداروں کے ممبروں میں برطانیہ اور دولت مشترکہ ممالک کے ہر قسم کے اسکول کے طلباء شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں دوسرے سمندر پار ممالک کے وہ نوجوان بھی شامل ہیں جو برطانیہ میں اعلیٰ فوجی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ تاکہ انہیں اپنے ملک کی فوجوں میں کمیشن مل سکے۔

برطانیہ میں طلباء کی آبادی میں ایک بڑی تعداد ان نوجوانوں کی شامل ہے جو یونیورسٹی یا کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد مزید خصوصی تربیت حاصل کر رہے ہیں تاکہ مستقبل کے لیے انھوں نے جو راہ متعین کی ہے اس میں یہ معاون ہو سکے۔ بہت سے ایسے بھی طلباء ہیں جو فوراً صنعت یا تجارت میں لگ جاتے ہیں۔ یہاں وہ ماہرین کی زیر نگرانی آسانی سے کام سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن بہت سے پیشوں اور کام کاج کے لیے زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور امتحانات پاس کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہمیں چند مخصوص پیشوں مثلاً طبابت، وکالت، مدرسی، اور انجینئری کے بارے میں بتانا ہے کہ کس طرح نوجوان طلباء اور طالبات اپنے آپ کو کسی مخصوص پیشے میں داخل ہونے کا اہل بناتے ہیں۔

آموزش

ایک ڈاکٹر اپنی پرائیویٹ پریکٹس (طبابت) اسی وقت شروع کر سکتا ہے جبکہ اس نے کم از کم پانچ سال سے لے کر سات سال تک تربیت حاصل کی ہو۔ علم طب کی تعلیم یونیورسٹی میڈیکل اسکول اور متعلقہ تربیتی ہسپتالوں میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

نصاب تعلیم تین کورسوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے کورس میں نامیات کے بنیادی علوم، طبیعات اور حیاتیات شامل ہیں اور ابتدا ہی میں یہ علوم پڑھا دیے جاتے ہیں۔ دوسرے کورس میں علم بدن، علم عضویات اور علم الامراض شامل ہیں۔ تیسرا کورس ادویات، سرجری (جراحی) اور دوسرے خصوصی متعلقہ موضوعات پر مشتمل ہے تیسرے کورس کی تکمیل کے بعد طالب علم مریضوں کا معائنہ کرنا شروع کرتا ہے۔

اس منزل پر اساتذہ میں زیادہ تر ایسے ڈاکٹر ہوتے ہیں جو باقاعدہ پریکٹس کرتے ہیں اور ان کے کام کا بیش بہا حصہ وہ ہوتا ہے جو ہسپتال کے وارڈوں میں مریضوں کے سرہانے ان کی دیکھ بھال سے متعلق ہوتا ہو ڈاکٹروں کے روزمرہ کے تعلیمی دوروں میں طلباء کی ایک مختصر جماعت اس کے ہمرکاب ہوتی ہے اور ہر ایک کے سپرد کچھ مریض ہوتے ہیں۔ ان مریضوں سے متعلق ذمہ داریوں کا جہاں تک سوال ہے طالب علم کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تاہم ہر مریض کے متعلق اسے معلومات فراہم کرنی ہوتی ہیں اور اپنے نوٹس بنانے پڑتے ہیں۔ طالب علموں کا آپریشن کے وقت بھی موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بیرونی مریضوں کے شعبہ میں بھی انہیں کام کرنا پڑتا ہے۔

آخری کورس میں کہیں جا کر میڈیکل طالب علم عملی علم اور تجربہ حاصل کرتا ہے۔ اور اپنی ذاتی پریکٹس شروع کرتے وقت یہی تجربہ اس کے کام آتا ہے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد اس کا آخری امتحان تحریری اور زبانی ہوتا ہے اور اس میں اگر وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو ڈاکٹر کہلوا سکتا ہے۔ لیکن اب بھی اس کی تربیت مکمل نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ نئے قانون کے مطابق نئے ڈاکٹروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک سال کسی ہسپتال میں کام کریں تب کہیں جا کر وہ نجی پریکٹس کرنے اور مکمل طور پر رجسٹرڈ ہونے کے مستحق ہوتے ہیں۔

برطانیہ کا سب سے بڑا فنی کالج، پولی ٹیکنک ہے جس میں پندرہ ہزار طلباء مختلف کورس مکمل کر رہے ہیں یہ کورس فن تعمیرات۔ تجارت۔ لسانیات۔ نامیات اور آرٹ سے متعلق ہیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے۔

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں۔

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں۔ ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے۔

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے۔ جو کہ مینیجر کو بھیجنا چاہئے۔

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی۔ تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت مینیجر سے کریں۔

مینیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ۔ لاہور (پاکستان)

شمارہ ۶، ۷] لاہور [ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۸

5 MAR 1959
DELHI

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آر۔ ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

JAMIA LIBRARY DELHI

سیدوشریف کی ورک شاپ

ایم، اے مخدومی

سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں جو تعلیمی ورک شاپ ۵ جولائی سے ۲۴ جولائی تک جاری رہی وہ کئی لحاظ سے ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور واشنگٹن سٹیٹ کالج امریکہ نے باہم مل کر اس سے پہلے بھی اساتذہ کے لیے تجدیدی نصابوں کا بندوبست کیا ہے۔ مگر اس سال کی ورک شاپ میں نہ صرف کوئی درجن بھر صدر معلم اور اے۔ ڈی۔ آئی شامل تھے بلکہ اس کے مذاکرات کی رہنمائی لگاتار کئی دنوں تک پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج نے خود کی۔ ورک شاپ کے آخری ہفتے میں محکمہ تعلیم کے کوئی نصف درجن ذمہ دار افسروں نے ان مذاکرات میں حصہ لیا اور ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین نے بھی ان مذاکرات میں شرکت کی۔ ملکی ماہرین تعلیم کے علاوہ بعض نامور امریکی ماہرین تعلیم نے بھی ورک شاپ کے کئی اجلاسوں میں شرکت کی اور اساتذہ کو اپنے علم اور تجربہ سے مستفید کیا۔

تعلیم اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے ہماری قومی زندگی ان دنوں ایک ہمہ گیر معاشرتی انقلاب میں سے گذر رہی ہے۔ ہر وہ دور جس میں معاشرتی تبدیلیاں جنم لے رہی ہوں اضطراب و بےچینی کا دور ہوا کرتا ہے۔ اس میں طرح طرح کے مشکل مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ لیکن بالآخر ان تمام مسائل کے حل تعلیم کے ذریعے سے ہی تلاش کیے جاتے ہیں۔ دورِ حاضر کی تمام قوموں نے اپنے چند در چند مسائل تعلیم کی مدد سے ہی حل کیے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اس کے سوا اور کوئی راہ موجود نہیں۔ ہمیں اپنے ہر قسم کے مسائل کو مدرسے کے ساتھ مربوط کرنا چاہیے۔ تعمیر و ترقی کے ہر منصوبے کا خاکہ تیار کرتے وقت ہمیں پہلے یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ اس کام میں رائے عامہ کی تائید کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ آخری تجزیے میں اس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ مدرسہ ایک ایسا وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے جس کی مدد سے نہ صرف مستقبل کے شہریوں کے انداز فکر کو بدلا جا سکتا ہے بلکہ بالغ آبادی کے نقطۂ نگاہ میں بھی خاطر خواہ تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو عمرانیات کے ہر طالب علم کو

یش نگاہ رکھنا چاہیے۔

مدرسے کی یہ غیر معمولی اہمیت استاد کو بھی ایک پرمعنی حیثیت عطا کرتی ہے۔ ایک جمہوری معاشرے
بن استاد کے سرگرم تعاون کے بغیر اجتماعی ترقی کے کسی خاکے میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ یہ صورت حال اس
ات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہمارے اساتذہ ہر قسم کے قومی مسائل پر نگاہ رکھیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش
کرتے رہیں کہ یہ مسائل نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس سے کس بات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قومی زندگی کا کوئی
گوشہ ایسا نہیں جو مدرسے سے متاثر ہونے والا یا اس پر اثر انداز ہونے والا نہ ہو۔ چوں کہ موجودہ زمانے کی
برق رفتار دنیا میں ہر قوم کے لیے معاشرتی زندگی کی لگاتار تجدید ایک ناگزیر ضرورت بن چکی ہے اس لیے ہر جگہ
مدرسے اور استاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں سے باخبر رہے اور ان کی مناسبت سے
اپنے کام کا جائزہ لیتا رہے۔ وادئ سوات میں جو تعلیمی ورک شاپ منعقد ہوئی اس کے سامنے بھی یہی مقصد تھا۔

یہ بات قدرتی تھی کہ ورک شاپ میں متعدد مسائل زیر بحث آتے۔ اس اہم تعلیمی اجتماع میں جو مسائل
زیر بحث آئے اور جن کے حل معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ان کی فہرست یہ ہے:-

(۱) ثانوی تعلیم کے مقاصد (۲) اجتماعی زندگی کی ترقی میں تعلیم کا ہاتھ (۳) مروجہ نصاب تعلیم کا تنقیدی جائزہ۔
(۴) تعلیمی مقاصد حاصل کرنے کی عملی راہیں (۵) مختلف مضامین اور جدید طریقہ ہائے تدریس (۶) سمعی بصری امدادیں
(۷) مضامین نصاب کا باہمی ارتباط (۸) تدریسی سواد کی ترتیب (۹) عوامی صحت کی ترقی اور استاد (۱۰) تخلیقی قوت (طلبہ)
کی ترقی (۱۱) طلبہ کی ہدایت اور رہنمائی کا مسئلہ (۱۲) تعلیمی تحقیق اور تدریس کا جائزہ (۱۳) محنت کا احترام
(۱۴) درسی کتابوں کا مسئلہ (۱۵) تعلیمی معیاروں کا انحطاط۔

اس فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مباحث حصہ لینے والے استادوں کے لیے
علمی اور فنی طور پر کس قدر مفید ثابت ہوئے ہوں گے۔ آموزش میں ان تمام مذاکرات کی روئداد ایک ساتھ شائع
کرنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم کوشش کی جائے گی کہ ان مسائل کے اہم پہلو مختلف اشاعتوں میں ناظرین کے سامنے آجائیں۔
امید ہے کہ آموزش کے پڑھنے والے ان مضامین کا مطالعہ دل چسپی سے کریں گے۔

سوات میں تین ہفتے

فضل احمد

رک شاپ کی تیاری

تعلیمی حلقوں میں ورک شاپ کا لفظ اب وہ اجنبیت نہیں رکھتا جو ۱۹۵۵ء میں رکھتا تھا۔ ۱۹۵۵ء
ں گھوڑا گلی (مری) میں پہلی ورک شاپ منعقد کی گئی تھی۔ دوسری ورکشاپ ۱۹۵۷ء میں دوبارہ مری میں
دئی اور اب کے تیسری ورک شاپ وادئ سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں منعقد ہوئی۔ ورک شاپ
نادوں کے تجدیدی نصاب کا امریکی نام ہے۔ اس امریکی اصطلاح کا مقصد اس بات پر زور دینا ہے
ہ تجدیدی نصاب کا منشا کوئی بھولا ہوا سبق یاد دلانا نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کا نصب العین یہ ہونا
ہیے کہ استاد ایک جگہ مل کر بیٹھیں اور اپنی روزمرہ مشکلات کے قابل عمل حل تلاش کرنے کی کوشش کریں
وسرے لوگ اس کام میں صرف صلاح مشورہ کی حد تک دخل دیں اور یہ صلاح مشورہ طلب کرنے پر ہی
یش کیا جائے۔

پہلی دو ورک شاپوں کی طرح اس موسم گرما میں بھی ورک شاپ مری میں منعقد کرنے کی تجویز تھی
منصوبہ جنوری ۱۹۵۸ء سے تیار ہو رہا تھا مگر تعطیلات بہار تک یہ بات واضح ہوگئی کہ مری میں جگہ نہ مل
ہو سکے گی۔ اس وقت منتظمین میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس دفعہ مری کی بجائے وادئ
وات کو کیوں نہ آزمایا جائے۔ چناں چہ پرنسپل جہاں زیب کالج سیدو کو خط لکھا گیا۔ ان کی جانب سے
راً جواب موصول ہوا کہ کالج اور اس کے ہوسٹل کی عمارتیں حاضر ہیں تعطیلات گرما میں یہ عمارتیں خالی
ی ہوں گی۔ آپ انھیں شوق سے استعمال کیجیے۔ وادئ سوات کی اس سرگرم مہماں نوازی نے یہ بات
طعی طور پر طے کر دی کہ ۱۹۵۸ء کی ورکشاپ سوات کے صدر مقام سیدو میں ہوگی۔

اس سال کی ورک شاپ پہلی دو ورک شاپوں سے بعض دوسرے امور میں بھی مختلف ثابت

ہوئی۔ پہلے دونوں مواقع پر ثانوی نصاب اور طریقہ ہائے تدریس ہی مذاکرات کا موضوع بنے رہے تھے اس دفعہ شروع سے ہی منصوبہ یہ تھا کہ استادوں کی عملی دشواریاں معلوم کرنے اور ان کا سائنسی جائزہ لینے کی بھی کوشش کی جائے۔ اس مطلب کے لیے اپریل کے اواخر میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں حلقہ لاہور کے صدر معلموں اور صدر معلمات کی ایک کانفرنس بلائی گئی۔ اس کانفرنس نے دوسرے امور کے علاوہ تعلیمی معیاروں کے انحطاط۔ درسی کتابوں کے انتخاب اور اس قسم کے بعض دوسرے اہم مسائل پر بھی غور کیا جو آج کل ہمارے نظام تعلیم کے لیے دردِ سر بن رہے ہیں۔

پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ورک شاپ کا انتظام سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور واشنگٹن سٹیٹ کالج (امریکہ) نے مل کر کیا۔ اول الذکر کی طرف سے اس کام کی ذمہ داری محترم ایم۔ اے مخدومی اور ملک دین محمد صاحب کے کندھوں پر تھی۔ اور ثانی الذکر کے نمائندے ڈاکٹر ورجیل سمتھ تھے جو پچھلے دو سال سے سنٹرل ٹریننگ کالج میں کام کر رہے ہیں۔ ان اصحاب کے علاوہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے اساتذہ میں سے مندرجہ ذیل لوگ ورک شاپ کے انتظامات کرنے اور اس میں کام کرنے کے لیے مقرر تھے:۔

(۱) شیخ عبدالحق صاحب (۲) خان فرحت اللہ صاحب (۳) شیخ معز الدین صاحب (۴) مسٹر انیس الدین انصاری صاحب (۵) مسٹر فضل احمد صاحب۔

لاہور سے سیدو شریف

لاہور سے سیدو کا کل فاصلہ کوئی تین سو بیس میل کے لگ بھگ ہوگا۔ جون کی گرمی میں یہ فاصلہ ایک دن میں لاری کے ذریعہ طے کرنا تکلیف دہ ہوتا۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ ۳ جولائی کی شام تک سب لوگ راولپنڈی میں جمع ہوں۔ اور وہاں سے اگلی صبح سیدو کے لیے روانہ ہو جائیں۔ ورک شاپ کا آغاز ۵ جولائی کی صبح ہونے والا تھا۔

راولپنڈی سے سیدو تک سفر کے لیے پراونشل ٹرانسپورٹ کی ایک بس لینے کا خیال تھا۔ مگر بعد محکمہ تعلیم لاہور ریجن کی عنایت سے گورنمنٹ لیڈی میکلیگن کالج لاہور کی نئی بس دستیاب ہو گئی۔ اس بس کے مل جانے سے نہ صرف لاہور سے سیدو تک آنے جانے کا مسئلہ حل ہو گیا بلکہ سیدو میں سیر و تف

ایک اچھا خاصہ پروگرام بھی یقینی ہوگیا۔ تاہم بس اتنی دیر سے مل سکی کہ ورک شاپ میں شرکت کرنیوالے بیرونی اصحاب کو یہ اطلاع نہ دی جا سکتی تھی کہ وہ ۳ جولائی کی صبح کو لاہور میں جمع ہو جائیں۔ لاہور سے اس بس کے علاوہ دو امریکی موٹر گاڑیاں بھی جانے والی تھیں۔ ان میں سے پہلی گاڑی ۳ جولائی کی صبح کو پروفیسر ایم۔ اے مخدومی، مسٹر سمتھ اور ملک دین محمد کو لے کر چل دی، اور دوسری اسی تاریخ کی شام کو پروفیسر عبدالحق صاحب اور پروفیسر انیس الدین صاحب انصاری کو لے کر۔ بس میں پروفیسر فرحت اللہ صاحب، شیخ معزالدین صاحب، راقم الحروف اور شرکائے ورک شاپ میں سے وہ لوگ سوار ہوئے جنھیں لاہور سے روانہ ہونا تھا۔

ہماری بس کوئی پونے آٹھ بجے صبح لاہور سے چلی اور تین بجے بعد دوپہر راولپنڈی پہنچ گئی۔ یہاں اکثر اصحاب نے شیخ معزالدین صاحب کی پُرجوش مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔ اگلی صبح ہونے تک شرکائے ورک شاپ میں سے اکثر لوگ پراونشل ٹرانسپورٹ راولپنڈی کے اڈے پر جمع ہو چکے تھے۔ اتفاق رائے سے پروفیسر فرحت اللہ خاں صاحب میر قافلہ قرار پائے اور وہ باہر سے آنے والے اصحاب کو بس میں بٹھا کر ٹھیک سوا چھ بجے صبح ان کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ ٹریننگ کالج کے اساتذہ میں سے باقی چار اصحاب جنمیں راقم بھی شامل تھا راولپنڈی سے امریکی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر صبح ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئے۔

جب سے ہم سطح مرتفع پوٹھوہار میں داخل ہوئے تھے۔ پنجاب کی سرسبزی اور شادابی پیچھے رہ گئی تھی۔ ہری بھری کھیتیوں کی جگہ اب مٹی اور پتھر کے خشک ٹیلوں نے لے لی تھی جن کے درمیان کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے کاشت شدہ کھیت اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں نظر آ جاتی تھیں۔ یہ کیفیت کم و بیش اسی طرح جاری رہی حتیٰ کہ ہم حسن ابدال کے درّے میں سے گذر کر یک دم ایک سرسبز و شاداب وادی میں داخل ہوئے۔ یہ مختصر سی وادی بہت جلد ختم ہو گئی اور ہم دوبارہ نیم بنجر علاقے میں سے گذرنے لگے جس میں بارش کے پانی نے جگہ جگہ گہرے کٹاؤ پیدا کر رکھے تھے، بالآخر ہم کیمبل پور کے نواحی میدان میں داخل ہوئے اس میدان کا چہرہ زخموں سے تقریباً خالی تھا، اور اس میں جگہ جگہ تمباکو کی کھیتیاں نظر آتی تھیں۔ کیمبل پور سے چند میل آگے اس میدان کی ڈھلان نیچے کو ہونے لگی، ساتھ ہی کچھ ٹنڈ منڈ پہاڑیوں کی خشک چوٹیاں دکھائی دیں۔

میں بھیانک پہاڑی دیوار میں کہیں کہیں خلا بھی تھے جن کے اس پار دریائے سندھ کا پانی ٹھاٹھیں ترتا دکھائی دیتا تھا۔

آخر ہم اس پہاڑی دیوار کے دامن میں آن پہنچے۔ سڑک ان چٹیل اور جھلسی ہوئی پہاڑیوں میں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ان سنگلاخ چٹانوں میں جگہ جگہ تاریخ کی داستان عبرت کے کئی اوراق بکھرے پڑے تھے۔ یہاں قدم قدم پہ مندروں، مسجدوں، مقبروں اور دوسری تاریخی عمارتوں کے آثار نگاہ کو کھینچتے تھے۔ ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے لے کر قرون وسطیٰ تک وسط ایشیا سے فاتحین کے جو ریلے وقتاً فوقتاً برصغیر پاک و ہند کا رخ کرتے رہے۔ ان سب کے لیے دریائے سندھ کا یہ حصہ دروازے کا درجہ رکھتا تھا۔ ہر نئے فاتح کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس دروازے میں گھس آئے اور بعد میں اس میں ایسا مضبوط قفل ڈال دے کہ کوئی اور اس میں سے نہ گذر سکے۔ یہ سلسلہ اس طرح جاری رہا حتیٰ کہ اس جگہ تاریخی آثار کا ایک اچھا خاصہ عجائب خانہ بن گیا ان آثار میں آج سب سے زیادہ اہم یہ مضبوط قلعہ ہے جو بالکل لب دریا ایک سنگلاخ چٹان پر قدم جمائے کھڑا ہے اور جس سے بالکل آگے اٹک کا مشہور پل ہے۔

اٹک کا پل جدید انجینئرنگ کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ یہ پل دوہرا ہے۔ اس کے اوپر سے ریل کی پٹری گذرتی ہے اور نیچے سے سڑک۔ پل کے دونوں طرف پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ پل کے اس پار سابق صوبہ سرحد شروع ہو جاتا ہے۔ پل سے ذرا اوپر دریائے سندھ اور دریائے کابل کا سنگم واقع ہے۔ اس جگہ یہ دونوں طوفانی دریا ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں اور اپنے متعدد تلاطم سے ایک وسیع عالم آب پیدا کر دیتے ہیں۔ اٹک کا پل عبور کرنے کے بعد سڑک دریائے کابل کے ساتھ چلنے لگی۔ اب سڑک کے کنارے سایہ دار درخت نظر آنے لگے اور سبز کھیتیاں بھی۔

دریائے کابل کے کنارے چلتے چلتے ہم نوشہرہ میں آن پہنچے۔ جرنیلی سڑک نوشہرہ چھاؤنی کے بیچ گذرتی ہے اور اس کے دونوں طرف کیلوا ڑیوں کی قطاریں اس طرح چلتی ہیں جیسے یہ کوئی پارک۔ نوشہرہ سے آگے دریائے کابل نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہم جرنیلی سڑک کو خیرباد کہہ کر مردان

سڑک پر چل دیے۔

مردان میں ہمیں دوپہر کا کھانا کھانا تھا جس کا اہتمام شیخ معز الدین کے دوست خان چاند بادشاہ صاحب نے کر رکھا تھا۔ ہم اپنے میزبان کے ہاں مقررہ وقت سے کچھ دیر کر کے پہنچے مگر انھیں چشم براہ پایا۔ چاند بادشاہ صاحب نے پٹھان مہمان نوازی کی روایات کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا اور ہم تقریباً ایک بجے ان سے رخصت ہو کر دوبارہ اپنی موٹر گاڑی میں سوار ہوئے۔ اپنی تمام سرسبزی کے باوجود مردان کے اونچے حصے۔ درختوں اور ہریاول سے بالکل خالی ہیں۔ خان چاند بادشاہ صاحب کا مکان بھی شہر کے ایک ایسے ہی حصے میں واقع ہے۔ چنانچہ جب ہمیں اپنی موٹر گاڑی دھوپ میں چھوڑنی پڑی اور جب ہم دوبارہ اس میں بیٹھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی تنور میں کود پڑے ہوں۔

مردان سے ہم مالاکنڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ہماری سڑک ایک ایسے سرسبز اور شاداب علاقے میں سے گزر رہی تھی جس پر پنجاب کے نہری علاقے بھی رشک کر سکتے ہیں۔ بڑی اور چھوٹی نہریں اس علاقے میں جگہ جگہ چاندی کی لکیروں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور زمین کے چپے چپے کو زندگی کی بھرپور رونق عطا کر رہی تھیں۔ نہروں کے کنارے گھنے سایہ دار درخت سر اٹھائے کھڑے تھے نہروں میں جگہ جگہ بچوں اور نوجوانوں کی ٹولیاں نہا رہی تھیں۔ اور جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی لہلہاتی کھیتیوں اور گہرے سبز باغوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا تھا۔

اس سرسبز و شاداب قطعے کے شمالی کنارے پر خشک پہاڑیوں کی ایک قطار سر اٹھائے نظر آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ پہاڑیاں قریب آتی گئیں۔ تھوڑی دیر میں ان پہاڑیوں میں سے ایک کے سینے پر پھیلی ہوئی چاندی کی ایک دھڑکتی ہوئی لکیر نظر آنے لگی۔ جوں جوں یہ پہاڑی قریب آتی گئی یہ چمکیلی لکیر زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ اس لکیر کے پہلو میں لوہے کے چار بڑے بڑے پائپ نیچے کی طرف آ رہے تھے۔ چمکیلی لکیر دریائے سوات کا شفاف پانی تھا جو پہاڑی سرنگ میں سے گزر کر اس خشک پہاڑی کے سینے پر سر پٹختا ہوا مردان کو سیراب کرنے کے لیے آگے ایک نہر کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ لوہے کے پائپ بھی اسی دریا کے پانی کو قید کیے ہوئے تھے۔ یہ پانی کئی سو فٹ کی بلندی سے نیچے گر کر برقی قوت پیدا کر رہا تھا جو

ستان کی صنعتی اور کاروباری زندگی کے لیے رگ جان کا درجہ رکھتی ہے۔ بعد میں یہ پانی بھی مردان کی
دی کو سیراب کرنے کے کام آتا ہے۔ درگئی کے منصوبے نے نہ صرف ضلع مردان کو ایک نئی زندگی بخشی ہے
نہ اس کی بدولت سابق صوبہ سرحد کو سستی بجلی بھی میسر ہوتی ہے۔ ہماری سڑک درگئی میں سے ہوتی
ہوئی پہاڑوں کے سینوں پر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی مالاکنڈ تک جا پہنچی۔ مالاکنڈ ایک پہاڑی کی چوٹی پر
واقع ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے۔

مالاکنڈ سے آگے ہماری سڑک نیچے اترنے لگی اور بالآخر دریائے سوات کے کنارے کنارے
ایک سرسبز و شاداب وادی میں سے گذرنے لگی۔ پہاڑیوں کے اُس پار درجہ حرارت ۱۱۴ سے کم نہ تھا اور جھلسا
دینے والی لو چل رہی تھی۔ مالاکنڈ کی بلندی پر بھی تمازت میں کوئی کمی نظر نہ آئی تھی، مگر سوات کی سبزہ پوش
وادی میں داخل ہوتے ہی ہوا میں ایک خوش گوار تبدیلی نظر آئی۔ اب نہ صرف سڑک کے دونوں طرف
سبز سایہ دار درخت سر جوڑے کھڑے تھے، بلکہ اس کے دونوں طرف وادی کے دونوں کناروں تک دھان
کے سرسبز کھیت ایک زمردیں چادر بچھائے ہوئے تھے۔ اس سبز چادر میں جگہ جگہ چمکتی ہوئی سفید لکیریں
سانپ کی طرح بل کھاتی دکھائی دیتی تھیں، یہ پانی کے سوتے تھے جو دریائے سوات کے حیات بخش
پانی کو وادی کے چپہ چپہ پر پھیلا رہے تھے۔

اس سبزہ پوش وادی میں آگے بڑھتے بڑھتے ہم بٹ خیلہ کی چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ یہاں
ہم نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بازار میں گھومتے دیکھا۔ ان کی بس پاس ہی کھڑی تھی۔ ہم بھی اسی
جگہ ستانے کے لیے رک گئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور اس وقت تقریباً دو بج رہے تھے۔ نماز
جمعہ کے لیے ہم نے مسجد کی تلاش شروع کی۔ بازار کے دائیں کنارے ایک تنگ گلی میں مسجد مل گئی۔ یہ
کافی بڑی مسجد تھی مگر ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جمعہ کی نماز ہو چکی ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم نے
مسجد کے کنوئیں سے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ پانی بے حد ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ بٹ خیلہ کا قصبہ اس
اعتبار سے اہم ہے کہ اس جگہ سے مالاکنڈ ایجنسی کی ریاستوں یعنی سوات، دیر اور چترال کو راستے
جاتے ہیں۔

سوات کا دل

بٹ خیلہ سے آگے ہماری سڑک دریائے سوات کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ہم لگاتار اس تنگ وادی میں سے گذر رہے تھے جو مالاکنڈ کی پہاڑی دیوار کے اس پار شروع ہوئی تھی۔ اس وادی میں دریائے سوات پیچ و خم کھاتا ہوا بہتا دکھائی دیتا تھا اور اس سے نکالی گئی نہروں نے ساری وادی میں ایک جال تن رکھا تھا۔ وادی کے دونوں کناروں پر خشک پہاڑیوں نے ایک غیر منقطع دیوار کھڑی کر رکھی تھی اور ان پہاڑیوں کے دامن تک ہر جگہ دھان کی چھوٹی چھوٹی کھیتیاں لہلہاتی نظر آتی تھیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے درخت چھتری تانے کھڑے تھے۔ اس سرسبز و شاداب وادی میں سے گذرتے ہوئے ہم لنڈاکی کے مقام پر پہنچے۔ یہاں لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی نصب تھی جو یہ اعلان کر رہی تھی کہ ریاست سوات کی سرحد شروع ہو گئی ہے۔ لنڈاکی سے تھوڑی دور آگے محصول کی چوکی تھی جہاں ہر موٹر گاڑی۔ بس اور ٹرک کی تلاشی لی جاتی ہے۔

سوات کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ہم نے گرد و پیش کے علاقے میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ اب سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطاریں زیادہ گھنی اور زیادہ سرسبز نظر آنے لگیں۔ کوئی گھنٹہ بھر کے سفر کے بعد ہم سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں آن پہنچے۔ "جہانزیب کالج" کے فرسٹ ہوسٹل میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ چناں چہ ہم نے اپنے اپنے کمروں میں بستر جمائے اور اگلے تین ہفتوں کے تعلیمی مذاکرات کے لیے تیار ہو گئے۔

سیدو شریف کو سوات کا دل کہنا چاہیے نہ صرف یہ کہ یہ بستی وادیٔ سوات کے تقریباً مرکز میں واقع ہے بلکہ یہ اس کی انتظامی اور ثقافتی زندگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ سطح سمندر سے سیدو کی بلندی تین ہزار فٹ سے کچھ اوپر ہے۔ اس لیے یہاں گرمی معمولی پڑتی ہے۔ دریائے سوات کی بڑی وادی سے سڑک کے دائیں ہاتھ ایک اور چھوٹی سی وادی پیدا ہو گئی ہے۔ سیدو اس وادی میں واقع ہے۔ وادی کے تین طرف پہاڑ ہیں اور شمال میں دریائے سوات اور اس کی حسین وادی پھیلی ہوئی ہے۔ سیدو کے متعلق سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ اس کے رفاہی ادارے تقریباً سب کے سب قیام پاکستان کے بعد بنے ہیں۔

جہاں زیب ڈگری کالج۔ اس کے دو ہوسٹل۔ ہائی سکول۔ زنانہ ہائی سکول۔ دو ہسپتال۔ مویشیوں کا ہسپتال
سوات ہوٹل، یہ اور اس قسم کے دوسرے ادارے تمام کے تمام آزادی کی آمد کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ یہ نئی
عمارتیں اور صاف ستھری سایہ دار سڑکیں سیدو کو ایک نئی نویلی دلہن کا حسن عطا کرتی ہیں۔ ان عمارتوں کے متعلق
سب سے زیادہ قابل ذکر چیز ان کا تناسب حسن اور ان کی پائداری ہے۔ آزادی کی آمد کے بعد پاکستان کے
باقی حصوں میں بھی کئی ایک سرکاری عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں لیکن جو پائداری سوات کی سرکاری عمارتوں کا عام
خاصہ ہے وہ دوسری جگہ بہت کم دیکھنے میں آئے گی، اس کی وجہ ہمیں یہ بتائی گئی کہ سرکاری عمارت
خواہ ریاست کے کسی بھی گوشے میں بنائی جا رہی ہو، والی سوات دوران تعمیر اسے خود دیکھنے جاتے ہیں اور
اور اس بات کا پورا یقین کرتے ہیں کہ ہر قسم کا عمارتی سامان صحیح مقداروں اور صحیح قسم کا استعمال ہو رہا ہے۔

خوب صورت سرکاری عمارتوں اور فراخ پختہ سڑکوں نے پچھلے چند سال میں سیدو شریف کی زندگی
میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے ورنہ اس کی اصل حیثیت ایک بڑے گاؤں سے زیادہ نہ تھی جس میں
چند سو کچے مکان اور ایک چھوٹا سا بازار ہے۔ گاؤں سے بالکل ملحق حکمران خاندان کے خوب صورت رہائشی
مکانات ہیں، مگر سیدو شریف کی اہم ترین عمارت اس کی دیدہ زیب جامع مسجد ہے جس کے بلند و بالا مینار
افق کو مرمریں تاج پہنائے رہتے ہیں، یہ مسجد ایک وسیع ہال پر مشتمل ہے جس کا فرش اور ستون عمدہ سنگ مرمر کے
بنے ہیں۔ یہ ہال دو منزلہ ہے۔ اوپر کی منزل پر فرش لکڑی کا بنا ہے۔ مسجد کے صحن میں حضرت سیدو بابا کا مزار
واقع ہے۔ یہ بزرگ حکمران خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کی روحانی عظمت نے ساری وادی کو گرویدہ
بنا رکھا ہے۔ موجودہ ریاست سوات کے بانی حضرت سیدو بابا کے پوتے میاں گل عبدالودود خاں تھے
جنھوں نے ۱۹۱۶ء میں اس سبزہ پوش وادی کو آفات و خوانین کی طوائف الملوکی سے نجات دلا
یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کی اور اہل سوات کو امن و امان عطا کیا۔ عبدالودود خاں صاحب کو عرف عام
میں بادشاہ صاحب کے نام یاد کیا جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کا بے حد احترام ہے۔

بادشاہ صاحب کچھ سالوں سے حکومتی کاروبار سے دست کش ہو چکے ہیں۔ حکومت کے سربراہ اب
ان کے بڑے صاحبزادے جہاں زیب ہیں۔ سیدو شریف کی وادی آگے جنوب کی طرف نکل گئی ہے اور

بلندی ہر قدم پر بڑھتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ ایک پیالی نما پہاڑی سبزہ زار میں جا ختم ہوتی ہے۔ اس جگہ پہاڑی چوٹیاں چیل کے درختوں سے ڈھکی نظر آتی ہیں اور ان کی گود میں شفاف ٹھنڈے پانی کے چشموں نے ایک سریلی گنگناہٹ پیدا کر رکھی ہے۔ وادی سوات کا یہ حسین و جمیل گوشہ مرغزار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس جگہ بادشاہ صاحب نے ایک چھوٹے سے سفید بنگلے میں گوشۂ تنہائی اختیار کر رکھا ہے۔ ان کا بیشتر وقت عبادت میں گذرتا ہے۔ البتہ وہ باہر سے آنے والے معززین میں سے بعض کو شرف ملاقات بھی بخشتے ہیں۔

قدرتی طور پر ہمیں بادشاہ صاحب کی ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا۔ چناں چہ ہم نے ایک درخواست کی شکل میں اپنا یہ اشتیاق ان پر ظاہر کر دیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر یہ درخواست قبول نہ کی جائے تو اس کا خیال نہ کرنا چاہیے کیوں کہ بادشاہ صاحب بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں مگر خوش قسمتی سے ہماری درخواست قبول کر لی گئی اور ایک روز ہم سب پانچ بجے شام مرغزار میں پہنچ گئے۔ اندر سے اطلاع آئی کہ صرف پروفیسر صاحبان اندر برآمدے میں آ کر بیٹھ جائیں۔ گروہ کے باقی افراد کو کہا گیا کہ وہ سفید محل کے سرسبز باغیچے میں ٹہلیں۔

ہم کوئی آٹھ نو افراد برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے اس اولوالعزم انسان کو دیکھنے کے منتظر تھے جس کی ہمت اور قوت بازو نے کوئی نصف صدی پہلے موجودہ سوات کو جنم دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں میانہ قد کے ایک سفید ریش بزرگ کمرے سے نکلے اور ہر ایک سے معانقہ کر کے ہمارے درمیان آ بیٹھے۔ وہ سراپا سادگی اور روحانی تمکنت کا مجسمہ تھے۔ خاکی شلوار اور خاکی قمیص کے ساتھ انھوں نے ایک گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پہ سفید عمامہ تھا۔ وہ عینک لگائے ہوئے تھے۔ چند منٹ تک انھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً بنظر غائر دیکھا۔ پھر ترجمان کے توسط سے پشتو میں چند باتیں پوچھیں۔ ہماری طرف سے دعائے خیر کی درخواست پر ان کے ہاتھ فوراً دعا کے لیے اٹھ گئے۔ پھر ہم میں سے ایک نے گذارش کی کہ اساتذہ کی اس جماعت کو جو اس وقت مرغزار میں موجود ہے کوئی پیغام دیا جائے۔ بادشاہ صاحب نے بلا تامل فرمایا کہ "میں اس کے سوا اور کیا پیغام دے سکتا ہوں کہ یہ لوگ قوم کی خدمت کریں اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں"

جب ہم رخصت لے کر چلنے لگے تو ایک صاحب نے گذارش کی کہ کوئی چالیس اساتذہ جو پنجاب کے مختلف گوشوں سے آئے ہیں نیچے باغیچے میں جمع ہیں اگر انھیں بھی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے تو وہ بہت ممنون ہوں گے۔

یہ سن کر بادشاہ صاحب فوراً نیچے اتر آئے اور استادوں میں سے ہر ایک کے ساتھ معانقہ کیا۔ یہ مختصر صحبت اگرچہ کوئی پندرہ بیس منٹ میں ختم ہو گئی مگر اس کے نقوش ہر ایک کے دل پر اب تک تازہ ہیں اور مدتوں تازہ رہیں گے۔

سوات کے موجودہ حکمران جناب جہاں زیب ہیں جو عرف عام میں والی کے نام سے مشہور ہیں۔ ہم نے ان سے بھی ملاقات کا وقت مانگ رکھا تھا۔ مرغزار سے واپسی کے دو دن بعد اس ملاقات کا وقت بھی مقرر ہو گیا۔ انھوں نے صرف پروفیسر صاحبان کو ساڑھے نو بجے اپنے دفتر میں بلایا تھا۔ ہم مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے۔ والی صاحب کا دفتر سیدو شریف میں مسجد کے تقریباً بالمقابل سڑک کے کنارے واقع ہے۔ دفتر کے احاطے میں قدم رکھتے ہی یہاں ایک کچہری کی سی چہل پہل نظر آئی۔ سیدو شریف ریاست کا صدر مقام ہے اور والی صاحب ریاست کی سب سے بڑی عدالت ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے مقدمے آخری اپیل کے لیے یہاں پیش ہوتے ہیں اور والی صاحب کو باقاعدہ دفتر میں آنا پڑتا ہے۔

ہمیں ملاقات کے لیے اندر بلایا گیا۔ ہم جونہی اندر داخل ہوئے۔ میانے قد اور مضبوط جسم کے والی مسکراتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے اور ہر ایک کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ان کا لباس بالکل سادہ اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ کمرے میں تین چار آدمی میز سے ہٹ کر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میز پر سرکاری کاغذ پڑے تھے۔ والی صاحب چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ سیدو شریف میں استادوں کے نصاب کا معلوم کر کے انھوں نے مدعا یہ پوچھا کہ کیا سوات کے استادوں کو بھی اس میں شریک کیا گیا ہے۔ ساتھ سٹیٹ کالج واشنگٹن (امریکہ) کے مسٹر سمتھ بھی تھے۔ والی صاحب نے ان سے بھی چند سوال پوچھے پھر اپنے دورۂ امریکہ کے متعلق چند جملے کہے۔ کوئی پندرہ منٹ کی صحبت کے بعد ہم نے رخصت چاہی۔ مختصر سی صحبت سے ہم نے والی صاحب کا جو تاثر لیا وہ مشرق کے روایتی حکمران کا تاثر نہیں بلکہ سائنسی دور کے ایک بیدار مغز صنعت کار کا تاثر ہے جو اپنی مختلف النوع ذمہ داریوں کے پیش نگاہ رکھتا ہے اور اس سارے سلسلے کو کمال خوبی اور ہوشمندی کے ساتھ چلائے جا رہا ہے۔

عام زندگی آزادی اور خود مختاری کی بدولت قومی زندگی میں جس تیزی سے انقلاب پیدا ہوا

ا اندازہ کرنے کے لیے سوات کی تعلیمی ترقی پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے سوات کا
بڑا تعلیمی ادارہ سیدو شریف کا ہائی سکول تھا جو ایک نیم پختہ عمارت میں واقع تھا۔ اس کے سوا علاوہ
ت بھر میں گنتی کے چند پرائمری سکول ہوں گے۔ آج سیدو شریف میں ایک اعلیٰ درجے کا ڈگری کالج
ہے۔ ریاست کے ہر اہم قصبے میں ایک ہائی سکول موجود ہے اور دیہات میں پرائمری سکولوں کا جال پھیلا ہوا ہے
دور افتادہ دیہات میں پرائمری مدرسے نہیں کھولے گئے وہاں تو تر پرائمری سکول موجود ہیں غرض خواندگی
ل کرنے کی سہولتیں ہر جگہ موجود ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اہل سوات کے لیے ہر قسم کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ جو
ب علم تعلیم کا شوق رکھتا ہو وہ کالج تک بلا فیس تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ آپ سوات میں کسی طرف نکل
ں آپ کو ہر بستی میں سکول اور ہسپتال کی عمارت نظر آئے گی اور یہ عمارتیں ایک ممتاز حیثیت کی حامل
ائی دیں گی۔

ریاست سوات کا کل رقبہ کوئی چار ہزار مربع ہے۔ دریائے سوات اس کے وسط میں سے
رتا ہے اور ریاست کی شمالی حد سے لے کر جنوبی حد تک اس کی لمبائی تقریباً ۸۴ میل ہے۔ سوات در اصل
ا سرسبز و شاداب وادی کا ایک حصہ ہے جو دریائے سوات نے پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی ہے۔ اس
ی کا عرض ہر جگہ ایک سا نہیں بعض مقامات پر یہ وادی کئی میل کشادہ ہے۔ مگر اس کا عام عرض پانچ
ہ میل ہے۔ وادی کے دونوں جانب پہاڑوں کی دیواریں پھیلتی چلی گئی ہیں جنوبی حصوں میں یہ پہاڑ بالکل
ف ہیں مگر شمالی حصوں میں ہریاول سے ڈھکے نظر آتے ہیں۔ دریائے سوات میں دونوں طرف سے
ی پہاڑی نالے آکر شامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں سارا پانی موجود رہتا ہے۔ ان پہاڑی نالوں
ں سے بعض نے وادیاں کاٹ رکھی ہیں جو بڑی وادی میں سے دائیں بائیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

دریائے سوات اس قطعہ زمین کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ دریا کے دونوں طرف پہاڑوں
دامن تک سرسبز کھیتیاں لہلہاتی نظر آتی ہیں۔ یہ تمام کاشت اس نظام آبپاشی کی رہین منت ہے
ں نے وادی کے چپہ چپہ میں اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ انسانوں، حیوانوں اور کھیتوں کے لیے زندگی کا
اصد سہارا دریائے سوات ہے۔ اسی دریا کے طفیل وادی سوات کا ہر انچ سبزہ پوش ہے اور یہاں

ح طرح کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ زرعی پیداوار میں چاول زیادہ اہم ہے۔

نظامِ آب پاشی کی طرح سوات کا نظام رسل و رسائل بھی نہایت ترقی یافتہ ہے۔ دریا کے دونوں جانب
ڑی سلسلوں کے ساتھ ساتھ سڑکیں چلتی ہیں۔ سیدو شریف میں دریا پر ایک لکڑی کا پل موجود ہے جو ان
نوں سڑکوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ اب اس پل کو پختہ بنا دینے کی تجویز ہے۔ اکثر سڑکیں پختہ ہیں جو پختہ نہیں
بھی کنکر سے بنی ہیں اور پختہ سڑکوں سے کسی طرح کم نہیں۔ پختہ سڑکوں کی توسیع کا منصوبہ باقاعدگی
سے زیرِ تکمیل ہے اور ہر سال چند میل پختہ سڑک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

سوات کے لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ کھیتوں میں سڑکوں پر اور مختلف تعمیری کاموں میں
معین صبح سے شام تک مصروفِ کار دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری قیام گاہ کے بالکل قریب سوات ہوٹل کی
توسیع زیرِ تعمیر تھی۔ مزدور اور مستری سورج نکلنے کے جلد بعد کام پر آ لگتے اور سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے تک
کام کرتے رہتے۔ یہی کیفیت ان مزدوروں کی تھی جو سڑکوں پر کام کر رہے تھے۔ فرض کا جو احساس اور محنت
کی جو عادت سوات کے عوام میں ہے وہ پاکستان کے باقی حصوں میں کم دیکھنے میں آئے گی۔

اجتماعی زندگی کے یہ تمام عناصر باہم مل کر ایک بلند معیارِ زندگی پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس اس
معاملے میں دیکھنے والے کو مایوسی ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ سوات کی نفیس سڑکوں پر بڑی بڑی چمکیلی
کاریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ مگر معدودے چند افراد کا تموّل عوامی افلاس کو نہیں ڈھانپ سکتا۔ اصل حقیقت
یہ ہے کہ پاکستان کے دوسرے حصوں کی طرح سوات کی معیشت بھی خالصتہً ایک زرعی معیشت ہے۔
تعلیمی سہولتوں نے بے شک اشاعتِ تعلیم کی راہیں کھول دی ہیں۔ مگر ہمارا تعلیمی نصاب کسی شخص کو معاش کی
نئی راہیں تلاش کرنے کے قابل نہیں بناتا۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے سوات کو بے شک ایک پُرکشش
خطہ بنا دیا ہے اور گرمی کے موسم میں اب کئی لوگ تفریح کے لیے یہاں آنے لگے ہیں اس سے چند قصبوں کے
باشندوں کے لیے کاروبار کی چند نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ مگر جب تک عوام کے سامنے بافراغت معاش کی
نئی راہیں نہ کھلیں اس وقت تک ان کا معیارِ زندگی بہتر نہیں ہو سکتا۔ ریاست میں قدرتی وسائل کی خاص
فراوانی ہے۔ لوگ محنتی اور جفاکش ہیں۔ اگر انہیں ایسی گھریلو دستکاریاں سکھائی جا سکیں جو مقامی خام

یداوار کو مفید مصنوعات کی شکل دے سکیں تو سوات مستقبل قریب میں پاکستان کا سوئزرلینڈ بن سکتا ہے۔
الی سوات نے جس عزم و جرات کے ساتھ سوات کو زندگی کے بعض شعبوں میں ترقی کی راہ پر ڈالا ہے۔ اسے دیکھ کر
بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اگر ریاست کی معیشت کو وسیع تر اور منضبط تر بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف متوجہ
ہو جائیں تو وہ اس منصوبے کو بھی کامیابی کے ساتھ پروان چڑھا سکیں گے۔

اگرچہ وادی سوات کے حسین چہرے پر ایشیائی افلاس کے بدنما دھبے جگہ جگہ نظر آتے ہیں مگر لوگوں کا حسن اخلاق
اور ان کا جذبہ مہمان نوازی اس کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔ سوات کے باشندے یوسف زئی قبیلے کے پٹھان ہیں اور
مہمان نوازی ان کی قومی روایات کا حصہ ہے۔

قابل دید مقامات

سوات کے صدر مقام سیدو شریف کے متعلق پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ سیدو کے شمال میں صرف دو میل کے
فاصلے پر منگورہ کا قصبہ واقع ہے۔ منگورہ وادی سوات کا سب سے بڑا شہر اور اس کا تجارتی مرکز ہے۔ یہ شہر
دریائے سوات سے چند فرلانگ دور ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے بازار کشادہ اور جدید وضع
کے ہیں۔ اس بازار کی دکانیں ہر قسم کی چیزوں اور مقامی مصنوعات سے بھری پڑی ہیں۔ سیدو شریف کے مقابلے
میں منگورہ نہ صرف جدید وضع کا حامل بلکہ نہایت اجلا نظر آتا ہے۔ ایک کشادہ پختہ سڑک اس شہر کو سیدو شریف
سے ملاتی ہے اور اس سڑک پر سارا دن آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ شہر میں اچھے ہوٹل موجود ہیں۔ چند فرلانگ کے
فاصلے پر دریائے سوات کے کنارے پر بلند و بالا چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے جہاں گرم سے گرم موسم میں بھی خنکی
رہتی ہے۔ گرمیوں میں یہاں ہر شام لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

سیدو شریف سے نو میل جنوب کو مرغزار کا دلفریب گوشہ موجود ہے جس کی طرف پیچھے اشارہ کیا گیا
ہے۔ سوات کے باقی اہم مقامات اس شاہراہ کے کنارے واقع ہیں جو دریائے سوات کے ساتھ ساتھ وادی
میں سے گزرتی ہے ان میں سے زیادہ اہم مدین اور بحرین ہیں۔ مدین کا فاصلہ سیدو شریف سے صرف دو میل
ہے مگر یہاں تک پہنچتے پہنچتے سطح سمندر کی بلندی تقریباً ایک ہزار بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ مقام سیدو شریف
کی نسبت خنک ہے۔ مدین ایک اچھا بارونق قصبہ ہے۔ یہ تحصیل ہے اور اس جگہ ہسپتال، ہائی سکول اور

چھے ہوٹل موجود ہیں۔ دریائے سوات میں سے نکالی گئی ایک چھوٹی سی نہر شہر میں چکر کاٹتی پھرتی ہے۔ دریا کے بالکل قریب سے گذرتا ہے۔ مگر یہاں اس کی گذرگاہ سطح زمین سے کوئی سو سو فٹ نیچی ہے۔ مدین سے ، سڑک ایک نئے تعمیر شدہ پل پر سے گذر کر دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ یہاں دریا کا پانی چھوٹا ہے۔ پل کو عبور کرنے کے بعد دریا کی وادی یک دم تنگ ہو جاتی ہے اور وہ دریا جو ایک فراخ سرسبز وادی کے درمیان اٹھکیلیاں کرتا ہوا بہتا نظر آتا تھا اب سنگلاخ چٹانوں کے درمیان مقید نظر آتا ہے۔ اسی طرح پیسے سات میل آگے بڑھنے کے بعد بحرین کا دل فریب منظر نگاہ کو یک دم کھینچ لیتا ہے۔

بحرین کے مقام پر دریائے سوات اور دریائے درال باہم ملتے ہیں۔ سوات شمال سے سنگلاخ چٹانی پہاڑوں کے درمیان بہتا چلا آتا ہے کہ یہاں دائیں جانب سے دریائے درال ایک عمیق پہاڑی ڈھلان سے شور مچاتا ہوا اور پتھروں پر سر پٹختا ہوا اس میں آن شامل ہوتا ہے۔ پانی کی مقدار کے لحاظ سے درال بے شک سوات کا چھوٹا بھائی ہے۔ مگر حسن و رعنائی اور پانی کی لطافت اور پاکیزگی کی وجہ سے درال ہر دیکھنے والے کی ساری توجہ کو جذب کر لیتا ہے۔ اس کا شفاف نیلگوں پانی بڑے بڑے پتھروں پر سے قلابازیاں کھاتا اور سفید برف سا جھاگ منہ پر لاتا ہوا بالآخر سوات کے نسبتاً گدلے پانی میں گم ہو جاتا ہے۔

دونوں دریاؤں کے درمیان جو تکونی چٹان واقع ہے اس پر بحرین کی بستی آباد ہے۔ یہاں مسجدوں اور بازاروں میں بہ نالی پانی کے چھوٹے چھوٹے دھارے بل کھاتے ہوئے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ چنار کے بلند و بالا درختوں نے اس قدرتی حسن میں اضافہ کر رکھا ہے۔ مگر دلفریب اور پاکیزہ قدرتی حسن کو انسانی جہالت اور کج ذوقی جس طرح داغدار کر سکتی ہے بحرین کی بستی اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ پیش کرتی ہے۔ بازاروں میں سے گذریں تو دکانیں یوں معلوم دیتی ہیں جیسے زمانہ قبل از تاریخ کے نیم وحشیوں نے کسی پہاڑی کے پہلو میں غاریں کھود رکھی ہوں۔ اگر کسی مسجد میں جانا ہو جائے تو آب رواں کی فراوانی کے باوجود ایک روح کش تعفن دور ہی سے استقبال کرتا ہے۔

بحرین کے مقام پر دریائے سوات پر ایک لکڑی کا پل بنا ہے۔ اس سے آگے بڑی موٹر گاڑیاں نہیں جا سکتیں۔ دریا کے ساتھ ساتھ سڑک بدستور جاتی ہے۔ مگر اس کی چوڑائی کم ہے۔ لہٰذا اس پر صرف

جیسے گاڑیاں یا کاریں چل سکتی ہیں، موٹر لاریاں نہیں چل سکتیں۔ بحرین میں برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اگر سفر آگے جاری رکھا جائے تو ۲۰ میل کے بعد کالام کا مقام آ جاتا ہے۔ یہ ریاست سوات کا آخری کنارا ہے۔ اس سے آگے چترال کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ کالام میں پہاڑوں کی چوٹیاں دائمی برف کی سفید ٹوپیاں پہنے نظر آتی ہیں۔ یہی برف پگھل پگھل کر برفانی نالوں اور چشموں کی شکل اختیار کرتی ہے اور بالآخر سوات اور دیرال کے دریاؤں کا روپ دھار لیتی ہے۔

وادی سوات میں جگہ جگہ داستان ماضی کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ وادی بدھ تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اس تہذیب کے آثار آج تک وادی کے مختلف حصوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ کئی ایک مقامات پر کھدائی کی گئی ہے اور پرانی بستیوں اور عبادت گاہوں کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔

سوات میں اسلام کی روشنی پھیلانے کا شرف تاریخ کے مشہور بت شکن فاتح محمود غزنوی کو حاصل ہے۔ جب محمود نے ہندوستان پر یلغاریں شروع کیں تو تمام سرحدی قبائل بت پرست تھے۔ محمود نے اپنے مختلف جرنیلوں کو یہ خدمت سونپی کہ ان قبائل سے بت پرستی کا خاتمہ کریں۔ سوات میں یہ خدمت خوش حال خاں کو سونپی گئی کہتے ہیں کہ اس وقت یہاں راجہ گیرا کی حکومت تھی جو بدھ مت کا پیرو تھا۔ سیدو شریف سے چند میل جنوب کو سڑک کے کنارے اوڈی گرام کا گاؤں واقع ہے۔ اس کے بالکل بالمقابل پہاڑی کی چوٹی پر راجہ گیرا کا قلعہ تھا جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ مقامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ غزنوی جرنیل خوش حال خاں نے راجہ گیرا سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اس کے قلعہ پر حملہ کیا۔ ادھر راجہ بھی اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تیار بیٹھا تھا۔ زور کا معرکہ ہوا جس میں گیرا اور اس کے اکثر ساتھی کام آئے اور وادی سوات اسلامی جھنڈے تلے آ گئی۔ فتح کے بعد خوش حال خاں نے تبلیغ اسلام کا کام جاری رکھا۔ لوگوں کو دین فطرت کی تعلیم دی اور جگہ جگہ مسجدیں اور مکتب تعمیر کرائے۔ یہ مرد مجاہد اب اسی جگہ ابدی نیند سو رہا ہے۔ جہاں اس نے کفر پر فیصلہ کن فتح حاصل کی تھی۔ خوش حال خاں کا مزار اسلامی سادگی کا نمونہ اور عوامی عقیدت کا مرکز ہے۔

سیدو شریف کے بالکل قریب سڑک کے کنارے ایک بڑے پتھر پر گوتم بدھ کی تصویر کندہ ہے۔ کہتے ہیں یہ تصویر مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے کندہ کی تھی۔ منگورہ سے کوئی پون میل کے فاصلہ

اڑدوں کے دامن میں کھدائی ہوئی ہے اور زمانہ قبل از اسلام کے کھنڈرات برآمد ہوئے ہیں۔ ابھی کھدائی کا
ام باقی ہے۔ منگورا سے چھ سات میل شمال کو سڑک کے کنارے منگلور کا گاؤں اس تاریخی درے کے
نہ پر واقع ہے جس کی راہ سے یونانی فاتح سکندر (روادی) سوات میں داخل ہوا تھا۔ یہ درہ ایک پہاڑی ندی نے
پیدا کیا ہے جو دریائے سوات

ں آن ملتی ہے۔ اس درے کی ایک پہاڑی چوٹی پر ایک بے حد بڑا پتھر چوکڑی بنائے بیٹھا ہے۔ اس پتھر
ے اس رخ پر جو وادی کی طرف ہے گوتم بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ کندہ ہے جو بہت دور سے دکھائی دیتا ہے
س وادی میں کچھ فرلانگ آگے بدھ کے مجسمے چٹانوں پر کندہ کیے گئے ہیں ۔

رکشاپ کا افتتاح

ان حسین و جمیل قدرتی نواحات میں ۵ جولائی کی صبح کو تعلیمی ورکشاپ کا آغاز ہوا۔ حصہ لینے والوں
یں حلقہ لاہور کے کوئی چالیس معلم شامل تھے۔ ان میں نصف مدرسین سے زیادہ ہیڈ ماسٹر تھے اور باقیوں نے
بھی زندگی کے کئی سال درس و تدریس میں صرف کیے تھے۔ یہ تمام لوگ سید و شریف میں اس لیے جمع ہوئے
تھے کہ تعطیلات گرما کی فرصت کے تین ہفتے ایک پرسکون ماحول میں گذاریں اور ایک فکر انگیز فضا میں اپنے
مشترکہ مسائل پر بحث کر کے ان کے قابل عمل حل تلاش کریں۔ نیز یہ معلوم کریں کہ ان کے پیش نظر کیا مقاصد ہونے
چاہئیں اور ان مقاصد کے حصول کی موثر ترین تدبیریں کیا ہیں۔

ورکشاپ کا افتتاح جناب ایم اے مخدومی پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور نے کیا۔ ان کا فاضلانہ
خطبہ جو نپے تلے الفاظ اور ایجاز بیان کا ایک عمدہ نمونہ تھا زمانہ حال کے تقاضوں اور ملک کی اہم تعلیمی ضرورتوں
کا ایک موثر خاکہ تھا۔ آپ نے تجدیدی نصابوں کی ضرورت اور اساتذہ کی لگاتار بالیدگی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر
اطمینان کا اظہار کیا کہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور واشنگٹن سٹیٹ کالج (امریکہ) کے باہمی تعاون کے طفیل ہر موسم گرما
میں اتادوں کو فنی بالیدگی جاری رکھنے کا ایک موقع حاصل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی مسرت
ظاہر کی کہ پچھلے تین سالوں میں جو اساتذہ ان تجدیدی نصابوں میں شریک ہو رہے ہیں وہ ان سے صحیح معنوں میں مستفید
ہو رہے ہیں ۔

تدریس کے عمل میں استاد کی غیر معمولی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ تدریس کو مؤثر اور پُر معنی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے استاد تازہ ترین تعلیمی فکر اور جدید ترین طریقہ ہائے تدریس سے پوری طرح باخبر رہیں۔ موجودہ دنیا اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ استاد کی قبل از ملازمت تعلیم و تربیت کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو وہ اپنی پیشہ ورانہ نگاہ میں لگاتار تازگی پیدا کیے بغیر اپنا کام خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔ یہ نکتہ تجدیدی نصابوں کو ایک غیر معمولی اہمیت عطا کرتا ہے۔ موجودہ ورکشاپ ایک اعتبار سے پچھلے تجدیدی نصابوں سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ جو موضوع اس میں زیر بحث آنے والے ہیں ان میں ہمارے بعض اہم ترین تعلیمی مسائل پر مشتمل ہیں مثلاً:۔ تعلیمی معیاروں کی پستی۔ نظام امتحانات کا جائزہ، درسی کتابوں کا مسئلہ وغیرہ۔

نصاب تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر مخدومی نے کہا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نصاب تعلیم کے پیش نظر یہ مقاصد ہونے چاہئیں:۔ (۱) نئی پود کے دلوں میں سچی اسلامی قدروں کے ساتھ سرگرم وابستگی پیدا کی جائے (۲) بننے والے شہریوں کو ملک و قوم کی بے لوث خدمت میں فخر محسوس کرنا سکھایا جائے (۳) سچی جمہوری روح کو ترقی دینے کے لیے بچے کی انفرادیت کا احترام کیا جائے اور اس کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار آنے کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ واضح تر الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ نہ صرف غیر معمولی ذہانت کے بچوں کو بالیدگی کے پورے مواقع ملیں بلکہ کند ذہن اور سست رفتار بچوں کی نشوونما بھی پیش نظر رہے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہر بچے کی افتاد طبع معلوم کر کے اسے علمی یا فنی قسم کی تربیت دے ایک جمہوری معاشرے میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر بچے کی فطری صلاحیتیں معلوم کی جائیں اور انھیں پوری پوری نشوونما دینے کے پورے مواقع دیے جائیں۔ غیر معمولی ذہانت کے بچوں اور ضعیف العقل بچوں دونوں کو خصوصی توجہ ملے۔ تعلیم کی ذمہ داری صرف اوسط ذہانت اور اوسط صلاحیت کے بچوں کی تعلیم و تربیت نہ ہونی چاہیے بلکہ اسے ہر قسم کے معذور بچوں کی ذمہ داری بھی لینی چاہیے۔ پاکستان اگرچہ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے مگر ہماری معیشت میں اب جدید صنعت کو بھی خاص دخل حاصل ہو رہا ہے۔ لہٰذا تعلیم کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ جدید سائنس کی آبیاری کرے۔ تعلیم کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ نئی پود کو قومی زبان پر اچھی خاصی قدرت عطا کرے تاکہ وہ قومی میراث کی نگہبانی کی خدمت بجا لا سکے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے

ہمارے ثانوی مدرسوں میں اُردو ایک لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ جدید معاشی زندگی کا ایک خاصہ اس کی وسعت اور تنوع ہے۔ جدید معیشت میں طرح طرح کے فنی ماہروں کی خدمات ناگزیر نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ہماری تعلیم کو چاہیے کہ نوجوانوں کو مختلف پیشوں کے متعلق ابتدائی قسم کی تعلیم دے تاکہ وہ دستکاری، تجارت و صنعت اور جدید زراعت میں مفید کل پرزوں کی طرح کام کر سکیں۔

اپنے خطبے کے آخر میں پروفیسر مخدومی نے تعلیمی معیاروں کے انحطاط کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے زیادہ اہم دو ہیں:۔ (۱) اچھے اور قابل استادوں کی کمی (۲) طلبہ کی رہ نمائی کا فقدان۔ اچھے استادوں کی کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ تدریس کا کام خاطر خواہ نہیں ہو رہا۔ رہ نمائی کے فقدان کا نتیجہ یہ ہے کہ بچے بھاری تعداد میں فیل ہوتے ہیں۔ مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں طرح طرح کی شرارتوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس طرح قومی وسائل بری طرح ضائع ہو رہے ہیں۔ اس ضیاع کو روکنے اور بچوں کی ذہنی صحت کو ترقی دینے کے لیے سکول کو چاہیے کہ والدین کا تعاون حاصل کرے۔ اس تعاون کی بہترین صورت جو مغرب میں کامیابی کے ساتھ آزمائی جا چکی ہے والدین اور اساتذہ کی انجمنوں کا قیام ہے۔ ہمیں مغرب کے اس تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور والدین کا تعاون حاصل کر کے اس تعاون سے تعلیمی خدمت حاصل کرنی چاہیے۔

تعلیمی معیاروں کو بلند کرنے کے لیے اگرچہ کئی باتیں ضروری ہیں۔ مگر میرا یقین ہے کہ اس مرض کا علاج زیادہ تر استاد کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر استاد کو اپنی ذمہ داری کا صحیح احساس ہے اور اگر وہ خلوص اور سرگرمی کے ساتھ کام کرنا جانتا ہے تو وہ عام حالتوں میں ہر قسم کی دشواریوں پر قابو پا کر موثر کام کر سکے گا۔ تدریس کو موثر بنانے کی ذمہ داری آخری تجزیے میں استاد اور بالخصوص ہیڈ ماسٹر کے کندھوں پر نظر آتی ہے۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تدریس کے عمل میں صدر معلم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ایک اچھا صدر معلم حیرت انگیز تیزی کے ساتھ مدرسے کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ موثر تدریس کے لیے اچھی عمارت، ساز و سامان اور قابل استادوں کی ایک جماعت ضروری شرائط ہیں۔ مگر ایک اچھا صدر معلم عمارت اور ساز و سامان کی کمی کے باوجود تدریس کو موثر شکل دے سکتا ہے۔ ایک اچھا صدر معلم بد دل قسم استادوں میں جذبہ پھونک سکتا ہے۔ وہ نااہل قسم کے استادوں کو بھی ذہنی بالیدگی کی راہ پر لگا سکتا

غرض تعلیمی معیاروں کے بحال کرنے اور انھیں ترقی دینے میں استاد اور بالخصوص ہیڈماسٹر صاحبان سب سے زیادہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پروفیسر ایم۔ اے مخدومی کے افتتاحی خطبہ کے بعد ورک شاپ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی۔ ڈبلیو سمتھ نے اپنی تقریر میں حاضرین کو خوش آمدید کہا اور والی سوات کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے از راہ کرم جہاں زیب اور ودودیہ ہوسٹل کی عمارتیں ورک شاپ کے استعمال کے لیے عنایت کیں۔ ڈاکٹر سمتھ کی تقریر کے بعد جہاں زیب کالج کے پرنسپل جناب فیض اللہ خٹک نے حاضرین کو یقین دلایا کہ وہ ان کی اور والی سوات کی آمد پر بہت مسرور ہوئے ہیں اور ان کی ہر قسم کی مدد کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد حاضرین کی تواضع چائے سے کی گئی۔ ورک شاپ کا اصل کام ۲ جولائی سے شروع کیا گیا۔ ۲ جولائی سے ۲۰ جولائی تک روزانہ دو اجلاس ہوتے رہے جن میں اہم تعلیمی موضوعات پر دلچسپ اور سرگرم بحثیں ہوتی رہیں۔ ان مباحث کی مختصر روداد کسی اور مضمون میں کی جائے گی۔

سبق کی منصوبہ بندی

محمد عبدالعزیز

سبق کی منصوبہ بندی اگرچہ جدید طریق تدریس کا ایک اہم جزو ہے لیکن بالعموم اس کی ترتیب میں جس احتیاط کی ضرورت ہے، ہم اس کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور کبھی نظامِ تعلیم اور کبھی مدرسے کے نظم و نسق کی آڑ لے کر اپنی پست کا جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اعتراضات غور طلب ہیں اور بعض ایسے جو بے جا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مدرسوں میں طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے اور ایک دن میں ایک مدرس کو اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہر سبق کی تیاری میں توجہ سے کام لے گا ایک بہت بڑی بھول ہے۔ مدرسہ جانا اور سبق پڑھانا عادت بن جاتی ہے اور وہ عادتاً اپنی پرانی معلومات کے پیش نظر سبق پڑھا دیتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ معلومات دور از کار اور بچوں کی ذہنی بالیدگی کے لیے غیر مفید ہیں، یا طلبہ مدرس کی تشریحات سے استفادہ کرتے ہیں۔ اصولاً ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن عملاً ایسا ہوتا ہے جس سے بظاہر مفر نہیں، لیکن ان حالات سے بد دل ہو کر سبق کی تیاری سے گریز کرنے کا بھی ہمارے پاس کوئی جواز نہیں۔ سبق غیر دلچسپ اور روکھے پھیکے ہوں گے تو وہ ایک ایسا گورکھ دھندا بن جائیں گے جس میں مدرس اور طلبہ دونوں ٹامک ٹوئیاں کرتے نظر آئیں گے۔

اس سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ کلاس میں جو کچھ پڑھایا جائے اور جس عنوان سے پڑھایا جائے اس کا مکمل خاکہ پڑھانے والے کے سامنے ہو۔ وہ کیا پڑھانا چاہتا ہے اور کس انداز میں پڑھانا چاہتا ہے۔ اس کا مفصل خاکہ سبق کو مدلل اور دلچسپ بنا دے گا جس سے طلبہ بھی فیض یاب ہو سکیں گے اور مدرس کا ذوقِ تدریس بھی مرتعش ہوتا رہے گا۔

منصوبے کی نوعیت

سبق کا منصوبہ دراصل جو کچھ آپ پڑھانا چاہتے ہیں اس کا متوقع تجربہ ہے، یعنی تدریس سے طلبہ پر جو تاثر قائم ہوتا ہے، سوالوں کی نوعیت اور جوابوں کی مناسبت، گنجلک باتوں کی تشریح وغیرہ۔ اس میں د

سب کچھ شامل ہوتا ہے جس کا تعلق مدرس، سبق، اور طلبہ سے ہے، اس طرح سبق کا منصوبہ تیار کرنا گویا فکر و نظر کو دعوتِ عمل دینا ہے۔ منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مدرس جماعت میں وارد ہونے والے واقعات کو قبل از وقت سوچ سکتا ہے یا نہیں اور پھر یہ کہ طلبہ کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کر سکتا ہے یا نہیں۔
اس کے لیے ہمیں مدرس اور متعلم دونوں کا متعلم اور معاشرے کی ضروریات کے پیشِ نظر تجزیہ کرنا ہوگا اور چوں کہ تعلیم و تعلم کے اس سلسلے میں مدرس ایک اہم پارٹ ادا کرتا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اچھی تدریس اور ایک اچھا منصوبہ تیار کرنے کے لیے مدرس میں کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ مضمون پر قدرت

مدرس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اپنے مضمون میں ماہر ہونا ہے۔ آیا جو کچھ وہ پڑھا رہا ہے۔ اسے اس پر قدرت بھی حاصل ہے یا اس کی گفتگو گنبدِ بابل کی صدائے بازگشت ہے۔ اس قدرت سے مدرس میں اعتماد اور ایقان پیدا ہوگا اور وہ کلاس میں طلبہ کے مزاج ان کے نفسیاتی تقاضوں اور ان کی ضروریات کے مطابق ایسا فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں طلبہ دل چسپی کے ساتھ مصروفِ کار ہو جائیں گے۔ اس طرح مدرس اپنے ذہن میں ان دشواریوں کا ایک مجمل خاکہ مرتب کر سکتا ہے جن کا پڑھاتے وقت احتمال ہو سکتا ہے لیکن اگر مدرس کو اپنا مضمون واجبی واجبی آتا ہے تو طلبہ کی مشکلات کی گرہ کشائی سے قطعِ نظر خود اپنی گرہ کشائی مشکل ہو جائے گی

۲۔ ماحول اور اس کے اثرات سے واقفیت

دوسری اہم بات ماحول ہے۔ ماحول کا اثر بچوں پر براہِ راست اور بالواسطہ، اجتماعی اور انفرادی طور پر پڑتا رہتا ہے۔ اس لیے ان عوامل کا تجزیہ اور یہ کہ بچوں کی زندگی پر ان کے اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ مدرس سبق کے منصوبے میں ان کا پورا پورا خیال رکھے بلکہ انھیں اصولاً اپنے سبق کی اساس بنا کر اپنا منصوبہ تیار کرے مثلاً کسی گاؤں کے اسکول کے لیے اگر مدرس سبق اس طرح تیار کرتا ہے جس کا پس منظر شہری اور جس کے مندرجات شہری بچوں کے خیال اور مزاج کے مطابق ہیں تو دیہاتی طلبہ اسے نہ ذہنی طور پر قبول کر سکیں گے اور نہ مزاجاً اسے اپنی معلومات کا جزو بنا سکیں گے۔ اس طرح سبق کا جو منصوبہ تیار ہوگا

اس سے مجموعی طور پر طلبہ فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائیں گے اور مدرس کو بھی ان کی تفہیم اور ان کے ردِ عمل کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔

۳۔ بچوں کی نفسیات کی تفہیم

مضمون میں مہارت اور ماحول سے واقفیت کے باوجود یہ ممکن ہے کہ مدرس اپنے سبق کی تدریس میں کامیاب نہ رہے۔ تدریس کا مدعا بچوں کو کچھ سکھانا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا براہِ راست تعلق طلبہ سے ہوتا ہے۔ اب اگر مدرس ان کی نفسیات سے واقف نہ ہو کہ کب، کس وقت اور کس طرح انھیں آمادۂ کار کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے اصول کیا ہیں، سبق کے منصوبے اور تعلیم میں کتنا گہرا ربط ہے اور یہ کہ بچوں کی اپنی ذہنی افتاد کیا ہے تو اس کا اس طرح پڑھانا غلط ہوگا۔ اس دور میں مہارتِ خصوصی اور منصوبہ بندی پر اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ مدرس کا بے منصوبہ سبق پڑھانا، بے سوچے سمجھے دریا میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہوگا۔ اگر تیر کر پار اتر گئے تو بہتر ورنہ غرقِ آب۔ اس قسم کی تدریس کسی طرح سائنٹفک نہیں کہی جا سکتی لیکن اس سے ہر وقت تعلیم کو نقصان پہنچانے کا اندیشہ ضرور رہتا ہے۔ اصولاً تعلیم وہی صحیح ہوگی جس میں انسانی جبلت کے مختلف تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی اور جو مدرس تدریس کے اس بنیادی اصول کو ٹھکرا کر آگے بڑھے گا۔ اس کا ناکام ہو جانا اتنا تعجب خیز نہیں۔ مثلاً چھوٹی عمر کے بچوں کو کھیل اور کہانیاں سننے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اب اگر ان بچوں کو اس طرح پڑھانے کی کوشش کی جائے جس طرح بالغ نوجوانوں کو پڑھایا جاتا ہے تو یہ ایک نفسیاتی قلابازی ہوگی جس کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں۔

۴۔ تدریسی تکنیک

چوتھی اور آخری خوبی جو تدریس میں جان پیدا کر سکتی ہے وہ جدید تدریسی تکنیک ہے۔ آیا مدرس یہ جانتا ہے کہ اپنے سبق کی تدریس میں وہ کن اصولوں کو ملحوظ رکھ کر کامیاب ہو سکتا ہے یا یہ کہ اس ضمن میں وہ کون سے طریقے ہیں جو سبق میں زندگی کی توانائی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں اگرچہ اس بحث کا موقع نہیں کہ جدید تدریسی تکنیک کیا ہے۔ لیکن ضمناً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس میں وہ سارے اصول اور طریقے شامل ہیں جن کا دنیا میں اس وقت تک تجربہ ہو چکا ہے۔ فروبل نے بچوں کے باغ کا تصور دیا۔ اس طرح یہ "

طریق تدریس کا اصول بن گیا۔ مس پارک ہرسٹ نے ثانوی مدارس کے بچوں کی تدریس کا ایک تجربہ کیا جو ڈالٹن پلان کی شکل میں متشکل ہوا۔ علیٰ ہٰذا القیاس، اس دور میں اس قسم کے بہت سے تجربے ہوتے ہیں اور ہر تجربہ جو کارآمد سمجھا گیا اسے تدریسی طریقوں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

ان جدید تدریسی طریقوں سے مدرس کی واقفیت اتنی ہی ضروری ہے جیسے جسم انسانی کو خوراک کی۔

سبق کے دو طریقے

سبق تیار کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تحریری جس میں مدرس سبق کے سیاق و سباق کے پیش نظر اس کا مختصر ساخاکہ مرتب کر لیتا ہے اور پڑھاتے وقت حالات کے مطابق اس میں معلومات کا آب و رنگ بھرتا جاتا ہے۔ دوسرا زبانی جس میں مدرس اپنی یادداشت پر بھروسا کر کے سبق کا خاکہ اپنے ذہن ہی میں مرتب کر لیتا ہے اور کلاس میں جا کر حسب معمول کچھ پڑھا دیتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ پڑھانے والے کو وہ سب کچھ یاد رہے جو وہ پڑھانا چاہتا ہے۔ اس میں فکر کو پرواز کا موقع ملتا ہے اور وہ فضا کی پہنائی میں محو حیرت پرواز کرتی رہتی ہے۔ فکر کی یہ مطلق العنانی طلبہ کو بے راہ اور بے مقصد بنا سکتی ہے لیکن ان کے مسائل کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی۔

تحریری منصوبہ

سبق کا تحریری منصوبہ دراصل نفس مضمون کی منطقی اور استدلالی ترتیب ہے جو اسے دلچسپ اور مفید بنا دیتی ہے۔ یہ ترتیب اصولاً منطقی ہونی چاہیے لیکن بعض اوقات طلبہ کے نفسیاتی تقاضوں کے پیش نظر ترتیب میں رد و بدل کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ بعض مدرس اس خیال سے کہ انہیں سب کچھ آتا ہے، اس لیے تحریری منصوبہ غیر ضروری ہے۔ سبق کا تحریری منصوبہ تیار کرنا بے معنی سمجھتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہی نہیں، خطرناک بھی ہے۔ مدرس کا علمی تبحر اس کے ہر وقت کام آ سکتا ہے۔ تحریری منصوبہ اسے اور متنوع بنا دیتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے علم کی نیرنگی رو میں مدرس بعض باتیں ایسی بھی کہہ جاتا ہے جن کا براہ راست موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اچھی تدریس کا تقاضہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے مناسب موزوں اور مفید ہو اور پھر اس انداز میں کہی جائے کہ طلبہ کا ذہن اسے قبول کرے جو بات مشکل سے کہی جائے گی اس کا اثر، اگر اسے اثر

کہا جا سکتا ہے، لابدی نہیں ہوگا۔

ذہن میں جو خیالات مرتب ہوتے ہیں، اکثر مبہم، غیر مربوط اور نامکمل ہوتے ہیں۔ اگر انھیں لکھ لیا جائے تو ان میں ایک ربط قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً چودہ سال کی عمر کے بچوں کو اکبر کی مذہبی حکمت عملی پڑھاتے وقت، ذہن اورنگ زیب کی عمومی حکمتِ عملی کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ مدرس اپنی معلومات کی بنا پر دونوں کی حکمت عملی کا موازنہ تاریخی حقائق کی روشنی میں خوش اسلوبی سے کر سکتا ہے اور ممکن ہے اس کی تقریر میں واقعات کا رچاؤ اور زبان کی چاشنی بھی ہو لیکن اس کے باوجود سبق کامیاب نہ ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ معلومات طلبہ کی ذہنی سطح سے اونچی ہوں اور بالفرض ان کا معیار اتنا بلند نہ ہو کہ اس عمر کے بچوں کو تفہیم میں دشواری ہو اور پھر بھی ایک قسم کا ذہنی الجھاؤ پیدا ہو جائے۔ اس الجھاؤ کی وجہ مدرس کا اپنا طریقِ تدریس ہو سکتا ہے کہ بیک وقت وہ اکبر اور اورنگ زیب دونوں کی حکمت عملی کا ذکر کر رہا ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب اور اکبر کے مابین جہانگیر اور شاہ جہان کا زمانہ حائل ہے اور ان دونوں کے عہد کے حالات کا تجزیہ کیے بغیر حکم بن کر اورنگ زیب کے عہد کے متعلق کوئی بات کہنا صحیح نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب پڑھاتے وقت اکبر کے بعض انتظامی اور دینی امور کا بھی جائزہ لیا جائے لیکن اکبر کے ساتھ اورنگ زیب کا جوڑ زمانۂ مابعد ہونے کی وجہ سے اکبر کا سبق پڑھاتے وقت مفید نہیں ہوگا۔

تحریری منصوبے کے خواص

اس احتمال کے پیشِ نظر جدید تعلیم، سبق کی منصوبہ بندی کے حق میں ہے۔ بلکہ اسے منصوبہ بندی پر اصرار ہے۔ اور حق یہ ہے کہ طلبہ اور مدرس دونوں کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ اس کے چند خواص یہ ہیں۔

۱۔ فکر کا معین ہونا

فکر کا انسانی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے۔ انسان مختلف مسائل پر کچھ سوچتا رہتا ہے۔ لیکن اگر خیالات محض سوچنے کی حد تک ذہن میں محفوظ رہیں تو ان میں یقین پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں یہ بالعموم بے ربط، مبہم اور دھندلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں لکھ لیا جائے تو ذہن میں ان کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سوچنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک موضوع کے متعلق

بہت کچھ جاتا ہے۔ لیکن جب کسی گفتگو میں استدلال کی ضرورت پڑتی ہے تو فکر کی ترتیبی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ رسول کریم نے صحابہ سے فرمایا کہ کام کی باتیں لکھ لیا کرو۔ ارشادِ نبوی میں دراصل انسانی فہم و ادراک کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انسان جو کچھ سنتا ہے یا جو کچھ پڑھتا ہے وہ اسے پورا پورا یاد نہیں رہتا موضوع کے بعض پہلو ذہن سے اتر جاتے ہیں اور اس وقت منطقی انداز میں ایک خیال کو مربوط کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی تحریری شکل میں ہو تو نہ صرف یہ کہ ان کے ربط اور ہم آہنگی کو قائم رکھا جا سکتا ہے بلکہ سوچنے والا اس کا تجزیہ بھی کر سکتا ہے۔ اس میں کون سی خوبی ہے اور کون سی برائی۔ حشو و زوائد کیا ہیں اور مجموعی حیثیت سے اس کی ترتیب کیا ہو گی۔

۲۔ فکری ترتیب اور اس کا ارتقا

بعض لوگوں کو اپنی یادداشت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے۔ مدرسوں میں سے بھی بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے حافظے کے زعم میں سبق کے اشارات مرتب کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن نہ تو یادداشت اتنی وسیع ہوتی ہے کہ اس میں سب کچھ اس طرح بھر لیا جائے کہ ہر چیز اپنے اپنے خانے میں پہونچ جائے اور کسی قسم کا فکری تصادم نہ ہونے پائے اور نہ انسانی توجہ اتنی قابلِ اعتماد کہ ماورائے انحراف ہو۔ ان دونوں صورتوں میں کہ انسانی حافظہ اور توجہ، ایک متعینہ حد سے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ضروری ہے کہ فکر کے ارتقا اور اس کی ترتیب کے لیے اسے لکھ لیا جائے اور پھر اس کا اس طرح جائزہ لیا جائے کہ کوئی پہلو غیر موزوں اور غیر متوازن نظر نہ آئے۔ اگر خیالات کی ترتیب میں اس سے اغماض برتا گیا تو بیان میں ابہام پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

سبق کی تیاری میں یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ جو کچھ ہم پڑھا رہے ہیں، اس کا انحصار کلاس کے متوقع ردِّ عمل پر ہوتا ہے۔ سبق کی تیاری میں ہم نے جن عوامل کو پیشِ نظر رکھا وہ ہماری توقع کے مطابق اپنا کام کرتے رہے یا ہمارے بیان میں کہیں سقم پیدا ہو گیا ہے۔ یا یہ کہ ہم جو تاثر طلبہ کے ذہن میں پیدا کرنا چاہتے تھے اس میں ہمیں کامیابی ہوئی۔ یا یہ کہ بعض پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا اور بعض حصے بے توجہی کی نذر ہو گئے۔

۳۔ بھول سے بچاؤ

مدرس کا سبق کے سارے اجزا کا یاد رکھنا ممکن نہیں۔ مثلاً سامو گڑھ کی لڑائی پڑھاتے وقت ہو سکتا ہے کہ اسے یہ تو یاد ہو کہ اس میں دارا شکوہ نے شکست کھائی اور اورنگ زیب منصور و مظفر آگرہ پہنچا۔ لیکن جنگ کا مکمل نقشہ اس کے سامنے نہ ہو۔ وہ یہ جانتا ہو کہ ہراول دستہ راجپوتوں پر مشتمل تھا مگر یہ یاد نہ رہے کہ میمنہ خلیل اللہ خاں اور میسرہ سپہ شکوہ کے سپرد تھا، اور دارا خود قلب لشکر میں تھا۔ سبق کے اشارات اس مقام پر مدرس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر سامو گڑھ کی لڑائی کے توضیحی نوٹ مدرس کے پاس موجود ہیں تو وہ اس خاکے میں تفصیلات کا آب و رنگ بھر سکتا ہے۔ اس کی یادداشت اسے کسی مقام پر دھوکا دے سکتی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اکثر مختصر نوٹ مفید نہیں ہوتے۔ مضمون میں ربط قائم رکھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

۴۔ تدریس میں آزادی

آزادی کے لفظ میں بڑا رچاؤ ہے۔ لیکن بایں ہمہ کہ اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے، تدریس میں اس کا مفہوم قدرے مختلف ہے۔ انسانی فکر، ارتباط خیال سے اکثر پیچیدگیوں میں پھنس جاتی ہے اور ایک راہہ، دو راہہ، سہ راہہ بلکہ کثیر راہہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بظاہر تو یہ ایک خوبی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یقین راہ نہ ہو تو منزل پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر پڑھانے والا موضوع کی شاخ در شاخ وسعتوں ہی میں گم ہو گیا تو یہ آزادی سبق کی تدریس میں نہ مدرس کے کام آسکتی ہے اور نہ اس سے طالب علموں کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے مثلاً مدرس تیرہ چودہ سال کے طلبہ کو کنواہا کی لڑائی پڑھانا چاہتا ہے۔ لڑائی کی تفصیلات کے ذکر میں اس کا ذہن آداب حرب، ترتیب لشکر، رسد اور تربیت سپاہ کی طرف جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رانا سانگا کا نام آتے ہی راجپوتوں کی شجاعت، ان کا طریق جنگ حتیٰ کہ وہ سارا پس منظر اس کے سامنے آ جاتا ہے جس کے پیش نظر بابر اور رانا سانگا کے لشکر اس بے آب و گیاہ میدان میں معرکہ آرا ہوئے۔ اب اگر مدرس اصل موضوع سے ہٹ کر راجپوتوں کی بہادری کے قصے سنانے لگے یا بابر کی مردانگی پر واہ و تحسین کرتا ہوا کبھی ماوراء النہر کے سبزہ زار کی تعریف و توصیف میں محو ہو جائے اور کبھی راجپوتانہ کے تپتے ہوئے ریگ زار کا نقشہ کھینچنے لگے تو شاید اس سے رنگ و آب و شاعری تو پیدا ہو جائے لیکن کنواہا کی لڑائی کا صحیح نقشہ بچوں کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غیر محدود آزادی مدرس کے لیے مفید نہیں ہوتی۔ اندیشہ ہے کہ وہ ذہن کی اس بھول بھلیاں میں اس طرح پھنس جائے گا کہ منزل تک پہونچنا مشکل ہو جائے گا۔ عافیت اسی میں ہے کہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔

اس آزادی بے جا سے ایک اور احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ مبادا مدرس اپنے اشارات سبق کے گورکھ دھندوں ہی میں اسیر ہو جائے، گویا اس سے سرِ مو انحراف ایک گناہ کبیرہ ہے۔ سبق کے یہ اشارے مدرس کی رہ نمائی کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی پابندی اس وقت تک ضروری ہے جب تک کلاس کے حالات میں کوئی غیر معمولی تغیر واقع نہ ہوا ہو لیکن اگر حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ موضوع سے متعلق دو چار مزید باتیں بیان کرنے سے اگر سبق کی توضیح میں مدد ملتی ہے تو اس سے گریز کرنا کوئی خوبی نہیں۔ مدرس اپنے تیار کردہ منصوبہ پر قادر ہے نہ یہ کہ منصوبہ اس پر۔ مدرس خالق ہے اور منصوبہ مخلوق۔ اس طرح یہ منصوبے منزل کی آگہی کے لیے ہوتے ہیں، بجائے خود منزل نہیں بن سکتے۔

۵۔ منصوبے میں اصلاح کی گنجائش

بعض مدرس ایک مرتبہ سبق کا منصوبہ تیار کرنے میں وقت صرف کرتے ہیں اور پھر برسوں اس پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ اس طریق کار میں کوئی تعلیمی افادیت نہیں۔ مدرس کا تھوڑا سا وقت ضرور بچتا ہے۔ لیکن اس سے طالب علموں کو جو نقصان پہونچتا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ سبق کے منصوبے میں اگر ترمیم و اضافے اور اصلاح کی گنجائش نہ ہو تو منصوبہ بندی کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ سبق پڑھانے کے بعد اس منصوبے کا منطقی اور نفسیاتی لحاظ سے تجزیہ کیا جائے۔ آیا معلومات صحیح تھیں۔ بچے انھیں سمجھ سکے ہیں یا نہیں۔ کون سا پہلو تشنہ رہ گیا۔ سبق پڑھاتے وقت بچوں کی دل چسپی قائم رہی یا نہیں۔ انھوں نے اس سے کس حد تک فائدہ اٹھایا۔ اسے اور کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے، یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوال منصوبے کی افادیت کے متعلق بحث کی اساس بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ایک مرتبہ جو منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ اس میں کسی اصلاح کی گنجائش ہی نہیں تو یہ اتنی بڑی خود فریبی ہے کہ اس سے اصلاح و ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ سبق کا پہلا منصوبہ دراصل مدرس کی علمی کاوشوں کا نقش اول ہے۔ نقش ثانی، ہمیشہ نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔ چناں چہ ایک سبق کی تکمیل کے بعد مدرس جو نیا خاکہ تیار کرے گا وہ پرانے تجربات کی روشنی میں زیادہ مفید ہوگا۔

اور جس طریقے سے وہ بچوں کو اب پڑھائے گا پہلے سے کہیں بہتر ہوگا

منصوبے کے ضروری اجزا

سبق کے منصوبوں کی اہمیت کا احساس بالعموم مدرس کو ہوتا ہے۔ فرق صرف مدارج کا ہے۔ بعض پرانے اور تجربہ کار اساتذہ شاید اس قسم کے منصوبوں کے زیادہ محتاج نہ ہوں۔ لیکن ایک ایسا مدرس جو کسی تربیتی ادارے سے تربیت حاصل کر کے مدرسے کے ماحول میں تازہ وارد ہوتا ہے، اسے شروع شروع میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کا اندازہ ہم میں سے ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو خود ان مراحل سے گذرا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ ابتدائی زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو ہم ان دشواریوں سے تجاہل برتتے ہیں۔ یا تجربے کی آڑ لے کر منصوبہ بندی سے اغماض کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات اسے غیر ضروری اور دور از کار بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ مدرس موضوع سے ہٹ کر بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو سبق سے غیر متعلق ہوتی ہیں یا پڑھاتے پڑھاتے ایسی مبہم باتیں کرنے لگتا ہے کہ سبق چیستان بن جاتا ہے۔ جسے کون بوجھے! مدرس خود ہی گم کردہ راہ ہو تو طلبہ صحیح نتیجہ کیسے اخذ کر سکتے ہیں۔

سبق کی ان پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مدرس جو کچھ پڑھانا چاہے اس کا خاکہ اس کے پاس موجود ہو۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس کی گفتگو میں ربط پیدا ہو جائے گا بلکہ طلبا بھی مستفیض ہو سکیں گے۔ اس خاکے کی ترتیب میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ متوقع نتیجے کی صحیح تفہیم

پڑھاتے وقت مدرس کے پیش نظر دو مسئلے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ جو کچھ وہ پڑھا رہا ہے اس کا فوری نتیجہ کیا ہوگا اور دوسرے یہ کہ اس تدریس سے آگے چل کر کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ یا یہ کہ فوری نتیجہ اور نتیجۂ بعید کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ اس کی تعیین کے بعد مدرس کی منصوبہ بندی کسی مقصد کے تابع ہو جائے گی

۲۔ اسباق کا باہمی تعلق

تعلم ایک عمل جاریہ ہے۔ تجربے، مشاہدے، دوسروں کی بتائی ہوئی باتیں۔ یہ سب کچھ تعلم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جن کا اثر طلبہ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل پر پڑتا رہتا ہے آج کا تجربہ کل کے کام آتا ہے

بعض مدرس ہر سبق کو ایک علاحدہ یونٹ یا واحدہ قرار دے کر اسے پچھلے سبق سے غیر متعلق بنا دیتے ہیں یا یہ کہ اسے اس انداز میں ختم کرتے ہیں گویا اس موضوع پر یہی آخری بات تھی۔ آنے والے سبق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ غلط فہمی ایسی ہے جس کا ازالہ طلبہ کی ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ سبق بجائے خود ایک واحدہ نہیں۔ اس کا سرچشمہ پچھلا سبق ہوتا ہے اور اس سے اگلے سبق کا سوتا پھوٹتا ہے۔ تینوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا، طلبہ کی تعلیمی اور ذہنی ترقی کو محدود کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنی زندگی میں جو تجربہ کل کیا، جو کچھ انھوں نے کل سیکھا، مدرس نے انھیں استعمال کرنے سے روک دیا۔ اور اس طرح جو تجربہ وہ آج کریں گے، اس کے استعمال سے کل محروم کر دیے جائیں گے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی سے طلبہ کو فائدے کی بجائے نقصان پہونچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کل، آج اور کل تینوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا جائے اور اس کی اساس پر سبق کی منصوبہ بندی کی جائے تو اس سے مدرس کو یہ فائدہ ہوگا کہ جو کچھ وہ پڑھا رہا ہے اسے صرف اس کا وقوف ہی نہیں ہوگا، بلکہ وہ اس پر حاوی بھی ہوگا۔ طلبہ کو یہ فائدہ ہوگا کہ پڑھانے والا اس صورت میں اس طرح پڑھائے گا کہ سبق کا کوئی پہلو تشنہ بیان نہ رہ جائے۔ موضوع کی صحیح وضاحت اور اس کے مشکل پہلو کی صحیح تشریح، تدریس کا یہی سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔

سبق پڑھاتے وقت اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ طلبہ حالیہ سبق کو اگلے سبق کی ایک کڑی سمجھیں، اسے جزو سمجھیں کل نہ سمجھیں بلکہ انداز تدریس اس قسم کا ہو کہ اس کڑی کو ملانے کے لیے دوسری کڑی کے حصول کی انھیں خود تلاش ہو۔ ان کی اس ذہنی بے تابی کو ایک وقتی سکون دینے کے لیے کچھ اس قسم کا کام دینا بھی مناسب ہوتا ہے جو ان کے جذبۂ جستجو کو قائم رکھ سکے۔ مثلاً پاکستان میں قدرتی ایندھن کا سبق پڑھانے سے پہلے پاکستان کا طبیعی جغرافیہ پڑھا دینا ضروری ہے۔ زمین کس قسم کی ہے پہاڑ کیسے ہیں، معدنیات کی نوعیت کیا ہے۔ پھر یہ بتائیے کہ ایندھن کی ہماری سماجی اور اقتصادی زندگی میں کیا اہمیت ہے اور اس حد تک لے جائیے کہ یہ ایندھن نسبتاً سستا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اسے زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں۔ گھریلو کاروبار میں بھی اور کارخانوں کے چلانے میں بھی۔ اس کا ہماری اقتصادی

زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اسے کل پر اٹھا رکھنا چاہیے۔ طلبہ کی جستجو طلب طبائع اس کی ٹوہ میں لگی رہیں گی اور بعض ہوشیار بچے اس سلسلے میں خود ہی معلومات مہیا کرنے کی کوشش کریں گے، اور تدریس کا یہی سب سے بڑا مقصد ہے۔

۳۔ نفس مضمون، سازو سامان اور فعالیتوں کی تنظیم

جدید طریق تدریس میں نفس مضمون کے علاوہ تدریسی سامان اور طلبہ کی فعالیتوں کو بھی تعلیم کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ سبق پڑھاتے وقت اگر ان میں سے کسی ایک پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تو سبق کا غیر دلچسپ ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہ ہوگی۔ نفس مضمون کی بہر صورت بڑی اہمیت ہے کہ سبق کی منصوبہ بندی میں اگر نفس مضمون ہی کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو جو خاکہ تیار ہوگا اسے کسی طرح صحیح اور متنوع نہیں کہا جا سکتا۔ نفس مضمون کو سامنے رکھ کر جب سبق کا منصوبہ تیار کیا جائے گا تو نصابی کتابوں کے علاوہ مدرس کو کتب حوالہ کی بھی ضرورت ہوگی، اور اس وقت وہ خود اپنے تجربے اور دوسروں کے تجربے سے بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جو منصوبہ تیار ہوگا اس سے طلبہ کی اکثریت یقیناً فیض یاب ہوگی۔

سبق کی منصوبہ بندی میں نفس مضمون کے علاوہ تدریسی سازو سامان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس تدریسی سامان میں نقشے، خاکے، فلم سلائڈ وغیرہ شامل ہیں۔ منصوبہ بندی کے وقت مدرس کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ ان میں سے کس قسم کا سامان استعمال کرے گا۔ سامان کی نوعیت کیا ہوگی اور سبق کے کس مرحلے پر کس سامان کو استعمال کیا جائے گا۔

اس زمانے میں ہمارے نظامِ تدریس میں سماجی مشاغل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر سبق کی منصوبہ بندی میں انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مدرس جب ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک منصوبہ بنائے گا تو اس سے نہ صرف سبق کی تعلیمی افادیت بڑھ جائے گی۔ بلکہ طلبہ اسے زیادہ دلچسپی سے پڑھیں گے۔

۴۔ عمل تعلّم

اس دور میں تدریسی تکنیک کے سلسلے میں جو تجربے ہوئے ہیں، اس سے عمل تعلم کی بہت سی نئی راہیں

نکل آئی ہیں جس میں بچوں کی ذہنی سطح عضویاتی تبدیلیاں، فطری رجحانات اور نفسیاتی تقاضوں کا خیال رکھا جاتا ہے
کس عمر کے بچے کو کونسی چیز کس طریقے سے پڑھائی جائے۔ ہر سبق کی تدریس کی ایک نئی راہ ہو سکتی ہے اور ہر نئی راہ
کے لیے ایک نئی تکنیک۔ اس سلسلے میں اگرچہ نئے نئے تجربوں کی ضرورت ہے لیکن جو طریقے عام ہو چکے ہیں مدرس
کسی ایک کو اختیار کر سکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کر سکتا ہے۔ سبق کی منصوبہ بندی میں یا
اس کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے بچوں کے مزاج اور ان کی ضروریات
کے مطابق سبق کا صحیح تجزیہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مدرس کو سبق کے مختلف مدارج کا علم ہو گا۔ اس کے
مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا اور عمل تعلیم کے ایک مخصوص دائرے میں رہ کر طلبہ کو بہت کچھ سکھا
سکے گا

۵۔ کامیابی کا مناسب اندازہ

سبق پڑھانے کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ سبق کس حد تک کامیاب رہا ؛ تدریس میں جو مقاصد
پیش نظر تھے ان کے حصول میں کامیابی ہوئی یا نہیں ؛ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ پڑھانا مطلوب ہو اور اس سے
جن نتائج کی توقع ہو اس میں پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی ہو بلکہ اس کامیابی کی حیثیت محض جزوی ہو
ایسی صورت میں پڑھائے ہوئے سبق کا جائزہ لینا مفید ہوتا ہے۔ اس کے کون سے اجزا ہیں جو مکمل
نہیں ہو سکے یا کون سا پہلو ہے جو تشنہ رہ گیا ہے۔ کون سا حصہ ہے جو باقی رہ گیا ہے جس کی تدریس میں
خاصی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مدرس اپنے سبق کو موثر نہ بنا سکا ہو یا طریق تعلم کے اطلاق
میں غلطی ہوئی ہو ان سب کا جائزہ لے کر تدریس کی نئی راہ متعین کرنا مدرس کا فرض ہے۔ حقائق شناس
مدرس ان کا اس طرح تجزیہ کرے گا کہ غلط اور صحیح صورتِ حال کا موازنہ ہو سکے۔ اس موازنے کے
بعد وہ جو اقدام کرے گا اس کی صحت پر شبہے کی گنجائش کم ہو گی۔

پڑھانے کے بعد جس سبق کا تجزیہ اس انداز میں نہ کیا جائے یا منصوبہ بندی کے وقت اس میں
اس قسم کی گنجائش نہ رکھی جائے وہ منصوبہ بندی یقیناً ناقص ہو گی۔

ان بنیادی اصولوں کے علاوہ کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر نگاہ رکھنی ضروری ہے جو سنگ میں

ان کی تعداد بارہ بتائی ہے جو یہ ہیں۔ اول سبق کے مقاصد کی تعیین دوم مناسب اور اچھی تفولیفیں سوم اچھا خلاصہ چہارم انفرادی اختلافات کے لیے گنجائش پنجم مرکزی سوالات کا شمول ششم اہم توضیحات کو سبق کا جزو بنانا ہفتم ریویو ہشتم تعلیمی مواد نہم حرکات کی تکنیک۔ دہم اندازہ لگانے کی تکنیک۔ یازدہم سبق کے ہر پہلو کی تدریس کے لیے وقت کا تعیین۔ دوازدہم استدراک تعلم کی طرف انعطاف توجہ (یعنی قدیم و جدید تعلم کی جانب توجہ)

ان میں سے بعض کی تفصیلات لکھی جا چکی ہیں اور بعض کے متعلق اس باب میں تشریحی اشارے موجود نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان موضوعات پر دوسرے بابوں میں مفصل بحث ہوتی آئی ہے۔ مدرس اگر سبق کے جملہ خواص پر نگاہ رکھے گا تو غلطی کا احتمال کم ہوگا۔

امتحان کے جدید طریقے

ڈاکٹر عبدالرؤف

مضمون قسم کے امتحان کے علاوہ طلبہ میں تحصیل علم کا جائزہ لینے کے لیے چند جدید طریقے بھی وضع کیے گئے ہیں۔ امتحان کے ان جدید طریقوں کو تعلیمی تحصیل کی آزمائش بھی کہا جاتا ہے۔ ان تحصیلی آزمائشوں کی دو مشہور قسمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جدید قسم کا امتحان ———— (۲) معیاری آزمائش

امتحان کی یہ اقسام آپس میں بہت مشابہ ہیں۔ یہ اقسام مضمون قسم کے امتحان سے بدرجہا بہتر ہیں۔

جدید قسم کا امتحان

جدید قسم کا امتحان طلبہ کی تعلیمی تحصیل کا جائزہ لینے کے لیے اساتذہ کے بہت کام آتا ہے۔ یہ ان تمام خامیوں سے مبرا ہے جو مضمون قسم کے امتحان میں موجود ہیں۔ امتحان کا یہ طریقہ بہت دل چسپ اور مفید ثابت ہوا ہے۔ جدید قسم کے امتحان میں طلبہ سے متعدد سوالات پوچھے جاتے ہیں جواب کے طور پر ان سے رٹے رٹائے لمبے لمبے مضامین کی توقع نہیں رکھی جاتی، بلکہ جواب فقط "ہاں" یا "نہیں" یا محض نشان دہی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جدید قسم کے امتحان کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) **سوالوں کی کثرت اور تنوع :۔** اس قسم کے امتحان میں طلبہ سے بے شمار اور طرح طرح کے سوال کیے جاتے ہیں جن کے جواب فقط ہاں یا نہیں یا نشان دہی کی صورت میں دینے ہوتے ہیں۔

(۲) **واضح ہدایات :۔** امتحان منعقد کرنے، سوال پوچھنے، اور جوابات لکھنے سے متعلق تمام ہدایات اتنی واضح ہوتی ہیں کہ ان سے متعلق ابہام یا غلط فہمی کا قطعی امکان نہیں رہتا۔

(۳) **نمبر لگانے کا سائنسی اور آسان طریقہ :۔** نمبر لگانے کا بے حد آسان اور سائنسی طریقہ ہوتا ہے۔

(۴) **جزئی نمبروں کا عدم استعمال :۔** چوں کہ ہر سوال کا جواب واضح اور ہر صورت میں فقط ایک ہی

ہوتا ہے۔ اس لیے غیر واضح جوابوں کے لیے جزئی نمبر نہیں دیے جاتے۔

(۵) غیر متعلقہ عناصر کی نظر انداز ی: ۔ نمبر لگانے وقت خوش خطی، صفائی، ظاہری ترتیب وغیرہ ہر قسم کے غیر متعلقہ عناصر کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

جدید قسم کے امتحان کی چند اقسام

جدید قسم کے امتحان کی بہت اقسام ہیں۔ چند چیدہ چیدہ اقسام درج ذیل ہیں۔

(۱) صحیح اور غلط جوابات کی آزمائش
(۲) بے ترتیب فقرات کی آزمائش
(۳) انتخاب جوابات کی آزمائش
(۴) تکمیل فقرات کی آزمائش
(۵) اعادہ کی آزمائش
(۶) تقسیم کی آزمائش
(۷) ترتیب کی آزمائش
(۸) تشبیہات کی آزمائش
(۹) مشابہت کی آزمائش
(۱۰) تضادات کی آزمائش
(۱۱) مناسبت کی آزمائش
(۱۲) تسلسل اعداد کی آزمائش

(۱) صحیح اور غلط جوابات کی آزمائش: ۔ سوال نامہ میں مختلف فقرے دیے ہوتے ہیں ہر ایک کے سامنے "صحیح" "غلط" لکھا ہوتا ہے۔ طلبہ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر انھیں فقرہ صحیح دکھائی دے تو صحیح کے نیچے ورنہ غلط کے نیچے نشان لگا دیں۔

(۱) لاہور پاکستان کا دارالخلافہ ہے   صحیح   غلط

(۲) حد درجہ حرارت انسانی اہلیت کو فنا کر دیتی ہے۔   صحیح   غلط

(۲) بے ترتیب فقرات کی آزمائش: ۔ چند بے ترتیب فقرے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہر فقرے کے آگے "صحیح" "غلط" "نامعلوم" لکھا ہوتا ہے۔ طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر فقرہ کو ترتیب دیں اور پھر سوچیں کہ ترتیب شدہ فقرہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر فقرہ صحیح معلوم ہوتا ہو تو صحیح ورنہ غلط کے نیچے نشان لگا دیں اگر انھیں فقرے کی صحت یا غلطی کا علم نہ ہو تو لفظ نامعلوم کے نیچے نشان لگا دیں۔

(۱) بلی کا پرندہ ہے قسم ایک   صحیح   غلط   نامعلوم

(۲) کی طرح سبق چاہیے معلم تیاری سے کو پڑھانے سے پہلے اچھی کرنا　صحیح　غلط　نامعلوم

(۳) انتخابِ جوابات کی آزمائش :۔ سوال نامہ میں ہر سوال دو سطور پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلی سطر میں ایک غیر مکمل فقرہ ہوتا ہے۔ جسے مکمل کرنے کے لیے فقط ایک لفظ درکار ہوتا ہے۔ دوسری سطر میں چند ایسے الفاظ دیے ہوتے ہیں جن میں سے فقط ایک پہلے فقرے کو مکمل کرتا ہے۔ طالب علم نے اس صحیح لفظ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) بانگ درا کا مصنف ۔

حالی　غالب　اقبال　ذوق　ہے ۔

(۲) پٹ سن اس ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے۔

ہندوستان　ایران　برما　پاکستان ۔

(۴) تکمیل فقرات کی آزمائش :۔ یہ آزمائش ہمارے مضمون قسم کے امتحان کے اس سوال سے ملتی ہے جسے درج ذیل فقروں میں خالی جگہوں کو پر کرو کہتے ہیں ۔

(۱) حمید اپنے والد کا بہت نیک ..... ہے۔

(۲) مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ..... ۔

(۵) اعادہ کی آزمائش :۔ یہ آزمائش بھی مذکورہ بالا آزمائش سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں طالب علم کو خالی جگہ پر کرنے کے لیے حافظہ پر زور دے کر اعادہ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) بجلی کا موجد .... تھا۔

(۲) یوم جمہوریہ پاکستان ہر سال .... کو منایا جاتا ہے ۔

(۶) تقسیم کی آزمائش :۔ الفاظ کی چند قطاریں پیش کی جاتی ہیں۔ ہر قطار میں چند الفاظ ہوتے ہیں ان میں سے ایک لفظ کے سوا باقی سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں طلبہ نے اس ایک لفظ پر نشان لگانا ہوتا ہے جو باقی الفاظ کی قسم سے خارج ہوتا ہے ۔ مثلاً :۔

(۱) پتہ، تنا، درخت، باغ، ٹہنی ،　(۲) پشاور، راولپنڈی، کراچی، ڈھاکہ ، لاہور

(۷) ترتیب کی آزمائش :۔ طلبہ کے سامنے چند الفاظ پیش کیے جاتے ہیں اور انھیں ان الفاظ کو کسی مخصوص اور بتائی ہوئی ترتیب کے تحت ترتیب دینے کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً :۔

درج ذیل افراد کو ان کے وقتوں کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔ ہر فرد کے نام کے پہلے خالی بریکٹ دیے گئے ہیں۔ ان میں اُس بریکٹ میں (۱) لکھ دیں جس کے مقابل کا فرد وقت کے اعتبار سے سب سے پہلے آتا ہے۔ اُس بریکٹ میں (۲) لکھ دیں جس کے مقابل کا فرد دوسرے نمبر پر آتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس باقی بریکٹوں میں بھی اسی ترتیب سے نمبر لکھتے جائیں۔

i ( ) ۔ شہنشاہ ہمایوں — v ( ) شاہ ولی اللہؒ

ii ( ) برناڈ شاہ — vi ( ) ابراہیم لنکن

iii ( ) مہاتما بدھ — vii ( ) اقبال

iv ( ) سکندراعظم — ۔ ۔ ۔ ۔

(۸) تشبیہات کی آزمائش :۔ اس آزمائش میں دو دو سطور پر مشتمل فقرے دیے جاتے ہیں پہلی سطر میں ایک مکمل تشریح ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک غیر مکمل تشبیہ دی ہوتی ہے۔ دوسری سطر پر چند الفاظ ہوتے ہیں جن میں سے صرف ایک لفظ پہلی سطر والی غیر مکمل تشبیہ کو مکمل کرتا ہے۔ طلبہ کو ہدایات کر دی جاتی ہیں کہ وہ اس لفظ کو ڈھونڈ کر اس کے نیچے نشان لگا دیں۔ مثلاً :۔

(i) پاکستانیوں کو اُردو سے وہی نسبت ہے جو امریکیوں کو

فارسی انگریزی فرانسیسی جرمن سے

(ii) میٹھے کا شہد سے وہی تعلق ہے جو کڑوے کا

تلخ کلامی تجربہ زبان کونین سے

(۹) مشابہت کی آزمائش :۔ طلبہ کے سامنے دو دو سطور کی صورت میں چند الفاظ پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلی سطر کے تمام الفاظ آپس میں کسی نہ کسی اعتبار سے مشابہ ہوتے ہیں دوسری سطر میں فقط ایک لفظ پہلی سطر کے ہم مشابہ الفاظ کا ہم جنس ہوتا ہے۔ اس لفظ کے نیچے نشان لگانا ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

(i) چڑیا طوطا کبوتر
بیاہ اونٹ سانپ کوّا جینس

(ii) طبیب مصنف تاجر
حبشی انجینئر انگریز رئیس مفلس

(۱۰) متضادات کی آزمائش:۔

الفاظ کی چند قطاریں پیش کی جاتی ہیں۔ ہر قطار میں ایک لفظ کے آگے بریکیٹوں کے اندر چند اور الفاظ دیے ہوتے ہیں۔ طالب علم نے بریکیٹوں والے الفاظ میں اس ایک لفظ کو ڈھونڈنا اور اس پر نشان لگانا ہوتا ہے جو بریکٹ کے باہر والے لفظ کا متضاد ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

(i) بیچنا (فروخت کرنا، قیمت ادا کرنا، خریدنا، انعام حاصل کرنا)

(ii) عارضی (پختہ، مستقل، مضبوط، توانا)

(۱۱) مناسبت کی آزمائش: ۔ اس آزمائش میں طلبہ کو مختلف الفاظ یا فقرات میں مناسبت دریافت کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً :۔

ذیل میں الفاظ کے دو کالم دیے ہوئے ہیں۔ پہلے کالم میں ہر لفظ کے آگے بریکیٹ میں اس کا سلسلہ وار نمبر دیا ہوا ہے۔ کالم نمبر دو میں الفاظ سے پہلے خالی بریکیٹ دیے ہوئے ہیں۔ کالم نمبر ایک کے ہر لفظ کو کالم نمبر دو کے ایک مخصوص لفظ سے کچھ مناسبت ہے۔ کالم نمبر ایک میں جس لفظ کو کالم نمبر دو کے جس لفظ سے مناسبت ہے اس کا نمبر کالم نمبر دو کے خالی بریکیٹ میں درج کر دیں۔

کالم نمبر ۱		کالم نمبر ۲
(۱) بارش	( )	جراثیم
(۲) حج	( )	منڈی
(۳) مصر	( )	مون سون
(۴) تجارت	( )	جرم
(۵) سزا	( )	مکّہ
(۶) بیماری	( )	اہرام

(۱) تسلسلِ اعداد کی آزمائش :- طلبہ کے سامنے ایسے اعداد کی چند قطاریں پیش کی جاتی ہیں جو سی ترتیب کے تحت مسلسل ہیں۔ ہر قطار کے آگے دو خالی جگہیں چھوڑی ہوتی ہیں۔ طلبہ نے اعداد کے تسلسل سے کر دو ایسے اعداد دریافت کرنے ہوتے ہیں جو اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوں۔ ان اعداد کو خالی جگہوں پر لکھ جاتا ہے، مثلاً :-

۲۰۲ ۳۰۳ ۴۰۴ ۵۰۵ — —

۴۰ ۱۰ ۳۵ ۱۵ ۳۰ — —

جدید قسم کے امتحان کے فوائد

جدید قسم کے امتحان پر بہت تنقید و تنقیص ہوئی ہے۔ اس کے چند فوائد درج ذیل ہیں :-

(۱) وقت اور محنت کی بچت :- جدید قسم کے امتحان کی مختلف آزمائشوں کو بنانے میں دیر لگتی ہے، مگر استعمال کرنے وقت اور نمبر لگانے میں وقت اور محنت کی بہت بچت ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ آزمائش مضمون قسم کے امتحان کی نسبت وقت اور محنت کی بہت بچت کرتی ہے۔

(۲) جامعیت :- اپنی وسعت کے اعتبار سے جدید قسم کا امتحان واضح طور پر مضمون قسم کے امتحان سے جامع ہے۔ اس کے پرچوں میں مضامین کے تمام پہلوؤں کو بخوبی شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۳) امتحان کا سائنسی طریقہ :- اس امتحان میں تعصب، رعایت اور گڑبڑ کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیوں کہ اس کے جوابوں کی صحت یا غلطی صاف نظر آ جاتی ہے اور ممتحن خواہ کوئی بھی ہوں ان کے نمبروں میں تفاوت کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

(۴) غور و فکر پر زور :- ان آزمائشوں کے حل کرنے میں رٹائی اور گھوڑ بازی کی بجائے غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۵) غیر متعلقہ عناصر کی نظر انداز ی :- غیر متعلقہ باتیں لکھنے کا ان کو کہیں بھی موقع پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی امیدوار ایسی باتیں لکھ بھی دے تو اس کا اُسے قطعی کوئی نمبر نہیں مل سکتا۔

جدید قسم کے امتحان کی خامیاں جدید قسم کے امتحان سراسر خوبیوں ہی کا مجسمہ نہیں ہیں۔ ان میں

چند خامیاں بھی موجود ہیں۔ چند چیدہ چیدہ خامیاں درج ذیل ہیں۔

(۱) **محدود افادیت** :- جدید قسم کے امتحان کی افادیت محدود ہے۔ یہ صرف معلومات عامہ والے مضامین کے امتحان کے لیے ہی زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

(۲) **تحریری کام میں مشق سے نظر اندازی** :- اس قسم کے امتحان تحریری کام میں مشق کے معاملہ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۳) **قیاس آرائی کا عدم علاج** :- جواب دیتے وقت طالب علم محض قیاس آرائی اور تُک بندی پر بھی اتر سکتا ہے۔ جدید قسم کے امتحان میں اس امر کی جانچ پڑتال اور علاج کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے، کہ کسی طالب علم کے جوابات کس حد تک صحیح علم یا تُک بندی کا نتیجہ ہیں۔

بہر کیف جدید قسم کے امتحان کی خوبیاں اس کی خامیوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ مجموعی طور پر امتحان کا یہ طریق ہمارے مضمون قسم کے امتحان سے بدرجہا بہتر ہے۔ مضمون قسم کے امتحان کی اساس سراسر رٹائی پر رکھی گئی ہے۔ اس کے برعکس جدید قسم کا امتحان تخلیق اور غور و فکر کے اصولوں پر مبنی ہے۔

معیاری آزمائشیں

معیاری آزمائشیں جدید قسم کے امتحان سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ استعمال کرنے سے قبل انھیں کافی طلبہ پر آزمانے کے بعد ایک مخصوص معیار کے مطابق بنا لیا گیا ہوتا ہے جو کسی خاص عمر کے بچوں کے لیے موزوں ہو۔

معیاری آزمائشوں کو درج ذیل دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(ا) خصوصی تعلیمی مقصد والی معیاری آزمائشیں

(ii) مضامین میں استعداد اور قابلیت جانچنے والی معیاری آزمائشیں۔

اول الذکر قسم کی آزمائش کسی خاص تعلیمی مقصد کو مدنظر رکھتی ہیں اور موخر الذکر مختلف نصابی مضامین یا واقفیت عامہ میں طلبہ کی قابلیت کا جائزہ لیتی ہیں۔

خصوصی تعلیمی مقصد والی آزمائشوں کی چند اقسام درج ذیل ہیں۔

(۱) مقدار، شرح، یا رفتار کی آزمائش۔

(۲) مشکلات سے نپٹنے کی صلاحیت کی آزمائش

(۳) نوعیت کی آزمائش

(۴) صحت کی آزمائش

(۵) مخلوط آزمائش

(۱) مقدار، شرح، یا رفتار کی آزمائش :۔ معیاری آزمائشوں کی یہ قسم اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتی ہے کہ طلبہ میں علم حاصل کرنے کی مقدار، شرح، یا رفتار کیا ہے۔

(۲) مشکلات سے نپٹنے کی صلاحیت کی آزمائش :۔ یہ آزمائشیں طلبہ کے سامنے کسی مضمون سے متعلق ایسے سوالات پیش کرتی ہیں جو بتدریج مشکل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جوابوں کی بنا پر اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ طلبہ میں مشکلات سے نپٹنے کی صلاحیت کس حد تک محدود ہے

(۳) نوعیت کی آزمائش :۔ ان آزمائشوں کے ذریعہ طلبہ کے جوابوں میں نفس مضمون، تحریر، طرز ادائیگی، ادراک، عبور وغیرہ کے پہلوؤں کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

(۴) صحت کی آزمائش :۔ ان آزمائشوں کا مقصد لکھائی، پڑھائی، حساب، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں طلبہ کے نفسِ مضمون کی صحت کا امتحان لینا ہے۔

(۵) مخلوط آزمائشیں :۔ مخلوط آزمائشوں میں ایک ہی آزمائش کے ذریعہ مذکورہ بالا چاروں اقسام کی آزمائشوں کے اغراض پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

معیاری آزمائشوں کی دوسری قسم کا تعلق نصابی مضامین سے ہے۔ اس کی دو انواع درج ذیل ہیں۔

(i) جامع آزمائش

(ii) انفرادی آزمائش

جامع آزمائشوں کا مقصد ایک ہی آزمائش کی مدد سے تمام درسی مضامین میں طلبہ کی قابلیت کا امتحان لینا ہوتا ہے۔ انفرادی آزمائشوں میں اس کے برعکس مختلف مضامین امتحان لینے کے لیے مختلف انفرادی آزمائشیں استعمال کی جاتی ہیں۔

معیاری آزمائشیں ہی مضمون قسم کے امتحان کے مقابلہ میں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی مدد سے معلم مختلف مضامین میں طلبہ کی لیاقت اور نالائقی کا قدرے سائنسی امتحان لے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان آزمائشوں کے ذریعے طلبہ کی خصوصی صلاحیتوں، فنکارانہ، موسیقانہ، میکانکی، معاشرتی اور دیگر قابلیتوں اور رجحانوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اس جائزہ کی روشنی میں ان کی فنی تربیت اور رہنمائی کا کام بہت بہتر طریق سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

امتحان کا جامع طریق

ہم نے مضمون قسم اور جدید قسم کے امتحانوں کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جدید قسم کے امتحانات مضمون قسم کے امتحانات سے بدرجہا بہتر ہیں۔ تاہم چند ایک خوبیوں کی بنا پر ہم مضمون قسم کے امتحان کو قطعی طور پر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر امتحان کا یہ واحد طریق ہے جو طلبہ کو تحریر کی مشق کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ چند ایک مضامین ایسے بھی ہیں، جن کا مناسب امتحان فقط اسی طریقے سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً تاریخ، ادب وغیرہ۔

اس لیے بہتر طریق یہی ہے کہ امتحانوں کا ایک ایسا جامع طریق رائج کیا جائے جس میں دونوں طریقوں کی خوبیاں شامل ہوں۔ اس جامع طریق کے امتحان میں دونوں طریقوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر معلومات عامہ والے مضامین کے لیے ہم جدید قسم کے امتحانات کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ، ادب اور تشریح طلب مضامین کے لیے مضمون قسم کا امتحان استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔

مقام مسرت ہے کہ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے اس قسم کے جامع طریق کو کسی حد تک میٹرک کے امتحان میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس تعلیمی تجربہ کے نتائج کا ناقدانہ تجزیہ کرنے سے امتحان کے اس مجوزہ طریق کے محاسن و معائب پر روشنی پڑنے کا بہت امکان ہے۔

طلبأ کی حکومت خود اختیاری

عبدالرحمٰن عابد

تعلیم کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی مستقبل کی امیدوں یعنی اس کے نونہالوں کو اس قسم کی ذہنی غذا دی جائے۔ انھیں ایسے تعلیمی ماحول میں پروان چڑھایا جائے اور طلبا کو اس احسن طریق سے زیر تربیت رکھا جائے کہ وہ اعلیٰ صلاحیتوں، بلند کردار، عمدہ اخلاق اور مستحسن عادات کے ساتھ عملی زندگی میں داخل ہوں۔ جہاں ایک طرف وہ ایثار، خلوص، صداقت، امانت و دیانت اور پسندیدہ اطوار سے کام لیں۔ اور دوسری طرف ملک کے محب وطن جاں نثار اور اچھے شہری بن جائیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارے تعلیمی اداروں میں مختلف تنظیمیں ہوتی ہیں جن میں طلبا کو شہریت کی تربیت دینے کی سعی کی جاتی ہے۔ یوم ادب، سٹوڈنٹس یونین، جمعیت طلبا اور بوائز لیگ وغیرہ اس مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔ ہر ایک جگہ ادارے کے اپنے خصوصی حالات، کارکنوں کی فراہمی اور طلبا کی دلچسپی و عدم دلچسپی سے ایسی تنظیمیں چلتی ہیں۔ لیکن سکولوں اور کالجوں کی ایسی تنظیموں میں اساتذہ کی دلچسپی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر وہ دلچسپی لیں اور بچوں میں ایسا جذبہ بھر دیں تو یہ تنظیمیں اتنے اچھے کارکن پیدا کرتی ہیں، اور کئی نوجوانوں کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہیں۔ نصاب، تدریس اور پڑھائی کی اہمیت و ضرورت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ طلبا میں اپنا انداز فکر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کچھ مسائل انھیں خود حل کرنے پڑیں، وہ عملی زندگی سے عہدہ برا ہونا بھی جانیں گے اگر انھیں مسائل سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ انتظام و انصرام کے قابل اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب اس چھوٹی عمر میں ہی ان پر اعتماد کر کے انھیں اس راہ پر ڈالا جائے اور شہریت کا صحیح شعور بھی پیدا ہو سکتا ہے جب انھیں ایک شہری کی طرح تربیت دی جائے۔

ترقی یافتہ ممالک میں تعلیمی ادارے حقیقت میں شہریت کی تربیت کے سب سے بڑے ادارے ہوتے ہیں۔ ان میں طلبا کے ہاتھ میں بہت سے انتظامی معاملات سونپے جاتے ہیں۔ کئی ایک چھوٹے چھوٹے

معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کو طلبا خود سنبھالتے اور انجام دیتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان میں چند ایک ایسے مقصدی تعلیمی ادارے ہیں جن میں طلبا کی اپنی ایک کونسل ہوتی ہے جو کونسل کے حیثیت محدود معاملات میں باہمی مشورے اور انتظام سے انھیں پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں، صفائی، حاضری، خیروں، غیرہ کے بورڈ پودے اور درختوں وغیرہ کی دیکھ بھال۔ اخلاقی حالت کو بہتر رکھنا وغیرہ کئی ایک ایسے امور ہوتے ہیں جو طلبا خود انجام دیتے ہیں۔ یوم ادب منعقد کرنا، اجلاسوں کی صدارت کرنا، خطابت کرنا۔ انھیں جماعتوں میں بھیجنا، طلباء کے ہی ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ کئی ایک جگہوں پر تو طلباء کی عدالتوں تک کے نہایت کامیاب تجربات ہوئے ہیں۔

ایسی تنظیمیں ہمارے ہاں تقریباً تعلیمی ادارے میں پائی جاتی ہیں۔ کہیں یہ فعال اور بڑی کارآمد ہیں تو کہیں محض نمائشی ہیں کسی کالج میں یہ سماجی سرگرمیاں طلبا کی بہبودی اور حسِ شہریت کی بیداری کا باعث ہوتی ہیں تو دوسرے کالج میں سارا سال کسی کو معلوم تک نہیں ہوتا کہ یہاں طلباء کی کوئی تنظیم موجود بھی ہے یا نہیں۔ تمام اداروں میں حکومت خود اختیاری قسم کی تنظیم ضرور موجود ہے لیکن اس کی صحیح اہمیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ اسے غلط غیرنصابی سرگرمی کا نام دیا گیا ہے۔ حالاں کہ اسے نصاب کا جزو لاینفک قرار دینا چاہیے اور تمام تعلیمی اداروں، مڈل اور ہائی اور ہائر سیکنڈری سکولوں اور کالجوں کی کارکردگی کا ایک ضروری حصہ ہونا چاہیے۔

دراصل اس کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مسئلے کو سائنٹفک بنیادوں پر سوچنے کے لیے بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس قسم کی تنظیمیں بناتے ہی اساتذہ کرام اور تعلیمی اداروں کے سربراہ کاروں کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ نہ جانے کیسے طلبا ان تنظیموں کے عہدے دار بنیں اور کن خطوط پر انھیں چلائیں۔ کہیں وہ مزید مسائل نہ پیدا کر دیں۔ اساتذہ اور طلباء کے تعلقات کی بنیاد کیا ہوگی۔ کیوں کہ جماعت اور کلاس کا ماحول مختلف ہوتا ہے لیکن سماجی مشاغل میں طلباء اور اساتذہ کلاس کے ماحول سے مختلف اور عام زندگی سے بہت قریب ہوتے ہیں اس لیے پہلے سوچنا ہوگا کہ ان میں اساتذہ اور طلباء کے تعلقات کس طرح استوار ہوں۔ پھر اور کئی ایک مسائل ہیں جن کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اتفاق سے ملتان کے ایک ہائی سکول کو اس قسم کی ایک تنظیم کا تجربہ کرنے کا موقع ملا ہے جو نتائج کے

اعتبار سے نہایت خوش کن، حوصلہ افزا، اور مسرت افروز ثابت ہوا ہے۔ بہت کوشش کی گئی کہ اسے ایک منصوبہ سے چلایا جائے۔ باقاعدہ نظام اور پروگرام ہو۔ تنظیم کا نقشہ حکومت اختیاری کا ہو۔ لیکن اس میں یہ امر پیش نظر رہا کہ اس تنظیم کی بدولت اپنا ملکی انتظام طلبہ سیکھ سکیں۔ جمہوری طریق سے عہدیداروں کا انتخاب ہو۔ عہدیداران حلف وفاداری اٹھائیں۔ ایوان بالا اور ایوان زیریں کا نقشہ ہو۔ پھر تقریبات اور میٹنگ ایسی رکھی جائیں جو سکول اور کالج کے ماحول کے مطابق ہوں۔ جن سے طلباء کی معلومات بڑھیں۔ ذہنی وجسمانی اور انتظامی صلاحیتیں ترقی پائیں۔ ان میں جذبۂ خدمتِ خلق اور جذبۂ تعاون باہمی بڑھے۔ آپس کے تعلقات میل ملاپ اور محبت ویگانگت بڑھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔

ایک قابلِ تقلید مثال

لائل پور زنانہ کالج کی طالبات کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ وہ قیمتی ریشمی لباس پہن کر آئیں نہ بناؤ سنگار کی چیزوں کا استعمال کریں۔ بلکہ کالج کی مقررہ یونی فارم پہنیں اور سادہ عادات اختیار کریں۔ ان ہدایات کی خلاف ورزی کے لیے جرمانے کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

یہ ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بننے والے شہریوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ بنائے۔ پاکستان ایک پسماندہ زرعی ملک ہے، جہاں فی کس اوسط آمدنی کوئی بیس پچیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں۔ ایسے ملک میں [illegible] محنت اور سادگی کا عادی بننا چاہیے۔ تاکہ قومی تعمیر کے جو ان گنت کام ادھورے پڑے ہیں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ ان تعمیری کاموں کی رہنمائی کا بوجھ ان طلبا اور طالبات کے کندھوں پر پڑے گا جو کالجوں اور یونی[illegible] اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے دورِ غلامی میں اعلیٰ تعلیم اور تن آسانی دو لازم و ملزوم چیزیں بنا دی گئی تھیں۔ یہ افسوس ناک صورتِ حال اب تک باقی ہے اس چیز کا فوری تدارک آج ہماری ایک اہم قومی ضرورت ہے۔

لائل پور زنانہ کالج نے اپنی طالبات کو سادہ زندگی کا عادی بنانے کے لیے جو قدم اٹھایا ہے وہ قابلِ تحسین ہے اور اس کی ہر جگہ تقلید ہونی چاہیے۔ سکولوں اور کالجوں میں ایک مقررہ یونی فارم کا نفاذ نمائشی لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا بڑی حد تک خاتمہ کر سکتا ہے ؞

معاون مدیر

مسئلۂ تحریکِ ذہنی

کوثر حسین

بچے فطرتاً نہایت چست اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ تجسّس کا مادہ بھی رکھتے ہیں اور کچھ سیکھنے کی خواہش اور ارادہ بھی۔ وہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حصولِ معلومات کے طریقوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پیاس میں صاف اور زہریلے پانی میں امتیاز کرنا ان کے بس کی بات نہیں مفید و مضر میں فرق اُن کی بلا جانے۔ ہر شے جو نئی ہو اور کانوں کو بھی بھلی معلوم ہو انھیں اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ یہ معلومات کے شیدائی ہر دلنواز آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہیں اور ہر تکاپ پر جان دینے کے لیے آمادہ۔

بچے اور مدرسہ

بچے ماں کی آغوش اور گھر کے صحن کی تعلیمی و تادیبی منزلیں طے کر کے ہمسائے کی غیر رسمی اٹھ پہری درس گاہ سے ہوتے ہوئے جب باقاعدہ تعلیم کے لیے مدرسوں میں آتے ہیں تو خالی نہیں آتے، بلکہ اس طرح کہ کتاب شوق در بغل۔ وہی شوق جو رہ رہ کر آنکھوں کے دریچوں سے جھانکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ معلومات چاہتا ہے۔ مگر حصولِ معلومات کا یہ شوق اسی وقت تک ہے جب بچوں کو ان کی مرضی کی معلومات بہم پہنچائی جائیں، اچھی اچھی، مزیدار، دل کش یعنی ایسی جو اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتی ہوں، ورنہ بچے روٹھ جائیں گے، اور ان کا شوق بدشوقی یا بیزاری کی صورت اختیار کر لے گا۔

مدرسہ جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے بڑے بڑے عزائم لیے کھڑا ہے، وہ بچوں کی فعالی تنوع اور اُپج کی پوری پوری وانمود کا آرزو مند ہے۔ کیوں کہ یہی تو ان نوواردوں کی ترقی پذیر شخصیت کا لازمہ ہے جو پھلنے پھولنے کے لیے ہر جانب نگراں ہے۔ مدرسہ ان کو دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے

اور معاشرے میں مقام حاصل کرنے کے قابل بھی بنانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس صلاحیت کے بغیر معاشرے کے جم غفیر میں، اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا، اور آگے بڑھنا ان کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ گویا مدرسہ انفرادیت کا فروغ بھی چاہتا ہے۔ اور ایک حد تک انفرادیت اور سماجیت کا سنجوگ بھی۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے بچوں کو سلیقہ سکھانا بھی ضروری ہے۔ اور مروجہ معائر خیر و شر اور نظریات خطا و صواب کا احساس دلانا بھی ضروری، اس لیے ایک نئے نام "علم اخلاق کی تلقین مدرسے کے پہلے ہی دن سے، شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً نرسری سکول کی معلمہ یہ چاہتی ہے کہ بچے سلیقے سے کپڑے پہنے رہیں۔ اور بچوں کا بقول نظیر اکبرآبادی یہ حال کہ ؎

ننگے پھریں تو کیا ہے پہنے پھریں تو کیا ہے ؎ یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے

قلم دوات کی روشنائی جو تختی پہ حروف بناتی ہے، اگر ہاتھوں یا گالوں کو تختی بنا دے تو کیا حرج ہے

اور ہاتھ تالیاں بجاتے بجاتے کسی دوسرے بچے کے سر سے بھی ایک تال پیدا کر دیں تو کیا مضائقہ ؟

جس بات کو جی چاہا وہ اچھی، جو کام آسان ہو، وہی بہتر اور جس مشکل پہ دل مائل ہو وہی سب سے آسان۔ ان کا شوق پورا ہونا چاہیے۔ نہ فائدے سے غرض نہ انجام سے کام۔ مگر مدرسے کو بچوں کے فائدے سے بھی غرض ہے اور انجام سے بھی کام ہے، اس لیے مدرسے کی ذمہ داریاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ کیا معلوم کل کو مدرسہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ بھی کچھ اور چاہنے لگے ؎

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو ؎ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
(انیس)

اس وقت مدرسہ جو کچھ چاہتا ہے۔ بچے اس میں سے کچھ چاہتے ہیں اور کچھ نہیں چاہتے جو وہ چاہتے ہیں اس کے لیے وہ ہمہ تن گوش اور ہمہ تن چشم ہیں۔ جو نہیں چاہتے، اس کو دیکھنا اور سننا بھی انھیں گوارا نہیں۔ جو مشغلہ بچوں کی دل چسپی کے مطابق اور فطری رجحانات کے موافق ہوتا ہے وہ خود بخود ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ بلکہ بچے اس کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ مگر مدرسے کے وہ مشاغل بھی جو دل چسپی کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، بچوں کی نشوونما کے لیے ضروری، اور سماجی نقطۂ نظر سے اہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان غیر دل چسپ مشاغل کو بچوں کے لیے قابل قبول بنانا پڑتا ہے۔

تحریک ذہنی کی تعریف

وہ عمل جو بچوں کو شوق دلانے اور انھیں کچھ سیکھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اختیار کیا جائے تعلیمی اصطلاح میں تحریکِ ذہنی کہلاتا ہے۔

تحریک ذہنی کی ضرورت پر نفسیاتی حجت

جدید نفسیات نے انکشاف کیا ہے کہ طالب علم کسی چیز کو مستعدی سے نہیں سیکھتا تاوقتیکہ اسے اس چیز سے دل چسپی نہ ہو۔ گویا تحریک ذہنی کا مسئلہ تحصیل علم کی مزید صلاحیت کا مسئلہ ہے کیوں کہ تحریک ذہنی طالب علم کو کچھ سیکھنے کے لیے مستعد و آمادہ کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں عادات و اطوار کی نشو و نما تحریکِ ذہنی کے عمل سے براہِ راست وابستہ ہے، چنانچہ اگر کسی کام کو سیکھنے کا عمل اس طرح انجام پاتا ہے کہ دل چسپی اور ولولہ، شوق بھی موجود ہو تو نہ صرف اس کام کی جانب، بلکہ اس قسم کے دوسرے کاموں کی جانب بھی، ایک مستقل میلان طبع پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی طالب علم خوش گوار و خوش آئند فضا میں اردو ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو غالب یہی ہے کہ اس فضا کی خوش گواری طالب علم اور مطالعۂ ادب میں ایک خوش گوار رابطہ قائم کرے گی یہ مضمون اس طالب علم کی ذات کا ایک جز و بن کر اس کی توجہ کو خود بخود اپنی طرف مبذول کرے گا اور طالب علم اس کا عادی ہو جائے گا۔ گویا تحریک ذہنی جو خوش آئند فضا کو مستلزم ہے کسی سبق کی آموزش کو آسان ہی نہیں بناتی۔ بلکہ طلبہ کے دل میں اس سبق کے متعلقہ مضمون کا "چسکا" پیدا کر دیتی ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چسکا یا مستقل دل چسپی جو اکتسابی میلان (یا عاطفہ) کی پیداکردہ ہوتی ہے دل و دماغ پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔ اور تقریر و تحریر کے ہر پہلو سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے

پھر یہ بھی ہے کہ اگر طلبہ مواد تعلیم سے دل چسپی لے رہے ہوں تو قدرتی طور پر جماعت میں ان کا رویہ اچھا ہی رہے گا۔ نہ کوئی شرارت ہوگی، نہ کوئی انضباطی زناد ہی مسئلہ پیدا ہوگا۔ اس سے ایک طرف معلم ناخوش گوار اعصابی کوفت سے محفوظ رہے گا، اور دوسری طرف اس کی توجہ طلبہ کی

ضروریات پر مرکوز ہو سکے گی۔ انہماک کی بدولت خود طلبہ کی توجہ کسی دوسری طرف منعطف نہ ہوگی
علم کی اعلیٰ قابلیت کا حصول دراصل ایسی ہی دلچسپ و خوش آئند فضا میں ممکن ہے اور ایسی ہی
پیدا کرنے کے لیے تحریک ذہنی سے مدد لی جاتی ہے۔

...ی اور توجہ

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ آموزش کے لیے طالب علم کی توجہ کا حصول ایک ضروری شرط ہے۔ لیکن
...جس میں دلچسپی کا عنصر غائب ہو، بے جان و بے اثر، پھر اور نہایت مختصر ہوتی ہے۔ عدم توجہ
...وجوہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن توجہ کی۔ یعنی ایسی توجہ کی جو کچھ عرصے تک قائم رہے اور تحصیل علم و فن میں
...صرف ایک ہی وجہ ہے جو دلچسپی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں توجہ کی اقسام پر سرسری نظر ڈالنا
...ہے۔ کیوں کہ دراصل تسلیم کے لیے متعلم کی توجہ ہی درکار ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ توجہ
...ہی کی کھوکی ہے۔

...ی اقسام

توجہ کی مندرجہ ذیل تین اقسام ہیں جن کی نوعیت ان کے نام سے ظاہر ہے۔

(۱) غیرارادی (۲) ارادی (۳) ثانوی غیرارادی

(۱) غیرارادی توجہ میں مرضی یا ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خارجی اسباب کے تحت خود بخود عمل
...تی ہے۔ مثلاً شور و غل یا اچانک چیخ کی آواز ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ نشو و نما کے
...ے یہ توجہ کا پہلا درجہ ہے۔ چمک، دمک، تماشے، قمقمے، تصاویر، مناظر یا ایسی ہی دوسری
...جو حسن و جمال کی حامل ہو، اپنی طرف مائل کر لیا کرتی ہیں، بالعموم ہیجان کی شدت، کوئی نمایاں خصوصیت
...ندرت یا تکرار اس توجہ کا مرکز بن جاتی، دراصل اس توجہ کا تعلق کسی نہ کسی جبلت سے ہوتا ہے
...کے مظاہرے چھوٹے بچوں میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں، بچے انہی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے
...ن کی جبلتوں سے وابستہ ہوں۔ دراصل یہی وہ فطری سرچشمے ہیں جن پر حقیقی تحریک ذہنی کا
...ہے۔ تعلیمی ماحول کی تشکیل اس نہج پر ہونی چاہیے کہ یہ چشمے خود اُبل پڑیں۔ ایک استاد جماعت سے

یہ کہہ کر کہ دیکھیں اس سوال کو کون حل کر سکتا ہے"؟ بچوں کی خود نمائی کی جبلت کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح تجسس، گروہ پسندی، تعمیر، تحصیل اور اثبات ذات کی جبلتوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً گروہ پسندی کی جبلت سے مدد لے کر شہریت کا سبق پڑھایا جا سکتا ہے۔ اسی جبلت کی بدولت بچے اپنے قریب کے رہنے والوں کے حالات شوق سے سنتے ہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے سننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ معلم اس رجحان سے تاریخ کی آموزش کا مصرف لے سکتا ہے۔

(۲) ارادی توجہ میں ہمارے ارادے اور کوشش کو پورا پورا دخل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے یا کوئی صورت حال بذات خود جاذبیت نہ رکھتی ہو اور ہم کسی مقصد کے پیش نظر یا کسی فائدے کے خیال سے اس کی جانب توجہ کریں، تو یہ توجہ ارادی یا فعالی توجہ کہلائے گی۔ زندگی میں بعض اوقات، بلکہ اکثر اوقات بے کیف اشیاء کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ گویا حصول مقصد کی آرزو ہی اس توجہ کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن ایسی توجہ بالغ اور پختہ سیرت لوگوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ بچوں سے اس کی توقع عبث ہے۔ البتہ بڑے لڑکوں کو مقصد کا تصور دلا کر اور کسی کام کی عظمت یا افادیت سمجھا کر متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض مضامین کسی خاص پیشے کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جیسے فزیالوجی ڈاکٹری کے لیے۔ ریاضی انجینئرنگ کے لیے۔ اگر پیشہ پسند آ جائے تو غیر دلچسپ مضامین کی جانب توجہ کی تحریک ہو سکتی ہے۔ مگر چھوٹے بچے فوری مسرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی خوش کن نتیجہ کے بھروسہ پر کام سے دل لگانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ان کے لیے فطری محرکات یعنی وہ جو ان کی جبلتوں سے وابستہ ہوں بروئے کار لانا چاہئیں۔ کیونکہ بچوں کی توجہ مقاصد سے بے نیاز ہوتی ہے۔

(۳) ثانوی غیر ارادی توجہ:- جب ارادی طور پر کسی جانب بار بار توجہ مبذول کی جائے تو اس جانب توجہ کرنے کا ایک مستقل رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے اکتسابی رجحانات کو عواطف کہتے ہیں جو جبلتوں کی طرح دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ شے جس کی طرف پہلے ارادتاً توجہ کی جاتی تھی، اب خود بخود توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ یہ ارادی توجہ کا ثمرہ ہے۔ اور اس

ت کا عمل جو شروع شروع میں ارتکاز توجہ کے لیے کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً جب سائیکل چلانا سیکھتے
ں تو بڑی محنت اور کوشش سے سائیکل پر توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد سائیکل
ا میکانکی ہوجاتا ہے اور کسی ارادی توجہ کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔

قابل اساتذہ کی تعریف اکثر ان الفاظ میں سنی گئی ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے دل میں حصول علم
"چسکا" یا ذوق پیدا کردیتے ہیں۔ یہ "چسکا" یا ذوق اصطلاح نفسیات میں عالمفے سے جدا کوئی شئے نہیں۔

حلقۂ معلمین میں، درسیات کی تشویق و ترغیب کے بہت سے طریقے رائج ہیں اور کہنہ مشق
ساتذہ خود وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

شویق یا تحریک ذہنی کے طریقے

(۱) مستعدی اور تیزی سے سوالات کرنا طلبہ کی ذہنی فعالی کو بیدار کرتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح
لبہ سوچنا شروع کردیتے ہیں اور تجسّس کا جبلی رجحان حرکت میں آجاتا ہے۔

(۲) اُن معاملات یا مسائل کا ذکر جو اس وقت طلبہ کی دلچسپی کا محور ہوں۔ طلبہ کے ذہن کو
ت جلد اپنی طرف مائل کرلیتا ہے اور کامیاب معلم ان مسائل سے موزوں طور پر گریز کرکے اسبق کی طرح
ال سکتا ہے۔

(۳) سبق کے مقصد کا اعلان کرکے، اور اس کی افادیت کا احساس دلاکر کم از کم بڑے بچوں کی توجہ
اصل کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر سبق کے مقصد سے شروع ہی میں طلبہ کو آگاہ نہ کیا جائے تو
ہ اپنی استعداد کے مطابق قیاس آرائی کرتے ہیں اور اصل مقصد سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اگر انھیں
سبق کا فائدہ معلوم نہ ہو تو کچھ عجب نہیں کہ وہ اس سبق کو معمولی بات سمجھ کر اغماض برتیں۔

(۴) طلبہ کی توجہ کو مفید و موثر بنانے کے لیے انحرافی اسباب کا سدباب ضروری ہے۔ طلبہ کے
یر معمولی، ہمہمے اور شور و غل سے، اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ طلبہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

(۵) سبق کو ایک حل طلب مسئلے کی صورت میں پیش کرنا تشویق کار کی ایک کامیاب صورت ہے
طلبہ کی جبلت تجسّس و جبلت خود نمائی ہر دو حرکت میں آجاتی ہیں۔ وہ مسئلے کا حل معلوم کرنے کے لیے

ایک ذہنی بے چینی محسوس کرنے لگتے ہیں جو انہماک کا پیش خیمہ ہے۔

(۶) انفرادی و اجتماعی منصوبے طلبہ کو عام تعلیم کا شوق دلانے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

(۷) تعلیمی سیر و سیاحت نہ صرف اُن تاریخی و جغرافیائی معلومات کا شوق پیدا کرتی ہے، جن کے لیے سیر و سیاحت اختیار کی جائے بلکہ اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ شوق مطلوبہ معلومات کو اُن کے قدرتی ماحول میں دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنے حقیقی رنگ روپ میں ہوتی ہیں۔ تعلیمی سیر میں باقاعدہ پروگرام اور اُس کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔ مبادا وہ محض تفریح پر منتج ہو۔

(۸) ذاتی ترقی یا جماعت یا مدرسے کی ناموری کا احساس دلانا بھی بالخصوص بڑے بچوں میں شوق و ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۹) توضیحات و تشریحات پیش کرنا بھی طلبہ کو ذہنی طور پر سبق کے لیے تیار کر دیتا ہے، بلکہ سبق کے دوران میں بھی توضیحات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اگر سبق کا کوئی حصہ غیر واضح رہ جائے تو سبق کے اگلے پچھلے حصے غیر متعلق ہو کر بے معنی ہو جاتے ہیں، اور طلبہ کی دلچسپی بھی معنوی تسلسل کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ توجہ ہی کیا جو اس حالت میں بھی منتشر نہ ہو، چناں چہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے لائق معلّم سبق کے ہر مشکل حصے کے لیے توضیحات تیار رکھتا ہے۔

توضیحات کی اقسام

توضیحات کی دو قسمیں ہیں (۱) لفظی یا زبانی (۲) بصری یا مرئی

(۱) لفظی یا زبانی توضیحات سے اجزائے سبق کی وہ تشریحات مُراد ہیں جو معلّم کی طلاقت لسانی کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ اس کے لیے مضمون زیر مطالعہ دست گاہ کلی اور زبان پر کما حقہ عبور ضروری ہے اور مہارت کے بغیر تو کوئی کام بھی بطریق احسن انجام نہیں دیا جا سکتا۔ مہارت یقینی طور پر تجربے کا نتیجہ ہے۔ اس لیے تشریح و توضیح کا کام قابل اور چیدہ کار معلمین ہی کا حصہ ہے۔ مگر ہر معلّم کو کرنا پڑتا ہے۔ معلّم سبق کی عبارت، اصول یا ادر کسی جزو کی وضاحت کے لیے کبھی تشبیہ و تمثیل سے کام لیتا ہے

متخالف و متضاد کیفیات کے حوالے سے۔ اور کبھی تفہیم کی خاطر تلخیص کر دیتا ہے، اس حیثیت سے تلخیص بھی منجملہ توضیحات ہے، کیوں کہ یہ بھی وضاحتِ مفہوم میں ممد ہوتی ہے۔

(۲) بصری یا مرئی توضیحات - یہ وہ توضیحات ہیں جو مقرون حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جنھیں طلبہ دیکھ اور چھو سکتے ہیں۔ اس قسم کی توضیحات، تعلم میں زیادہ کارآمد سمجھی جاتی ہیں۔ مرئی توضیحات کی حسب ذیل چار قسمیں ہیں۔

(ا) اصل شے (ب) ماڈل یا نمونہ (ج) تصویر (د) نقشہ یا خاکہ وغیرہ۔

(ا) **اصل شے** :۔ اگر سبق کی مذکورہ اشیا آسانی سے دستیاب ہو جائیں اور وضاحت کے لیے طلبہ کے سامنے جماعت میں لائی جا سکیں تو ضرور لائی جائیں کیوں کہ وہی بہترین سامان توضیح ہیں، اور راست طریقۂ تعلیم کا ذریعہ بھی۔ لیکن عام طور پر اصل اشیا لا کر دکھانا مشکل ہوتا ہے، اور بعض اوقات ناممکن بھی، مثلاً کارخانہ یا پہاڑ اٹھا کر جماعت کے کمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایسی صورت میں کارخانے یا پہاڑ وغیرہ کے ماڈل سے توضیح کا مصرف لیا جا سکتا ہے۔

(ب) **ماڈل** :۔ بچوں کے لیے تصویروں یا نقشوں کے مقابلے میں، ماڈل مفید تر ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ ماڈل اصل شے کا صحیح نمونہ ہوتا ہے۔ وہ ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، بلندی) رکھتے ہیں۔ تصاویر میں یہ بات کہاں، مگر توضیحی ماڈل میں اصل شے کے وہ پہلو ضرور نمایاں ہونے چاہئیں جن کی خاطر ماڈل پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ اس کی افادیت میں فرق نہ آئے۔ توضیحی کے لیے یہ ضروری ہے کہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ذرا بڑے ماڈل بنائے جائیں۔ تاکہ بچے انھیں اچھی طرح دیکھ کر سمجھ سکیں۔ پھر طلبہ سے بھی ویسے ماڈل بنائے جائیں تاکہ ماڈل سے متعلق جملہ معلومات ذہن نشین ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس طرح تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کا موقع بھی بہم پہنچے۔ بہت خوب صورت ماڈل مفید مطلب نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض اوقات توانحراف کا سبب بن جاتے ہیں۔ ماڈل کی صفت یہ ہے کہ سادہ ہو اور اس بات یا اس اصول کی توضیح کرے جس کی خاطر ماڈل بنایا گیا ہے۔ اگر جمالیاتی احساس کو بیدار کرنا مقصود ہو تو پھر اچھے ماڈل کے تعداد پیش کی جائیں۔

(ج) تصاویر۔ ماڈل کسی اصل شے مثلاً عمارت کی شکل کو بدرجہ اتم ظاہر کر دیتا ہے لیکن وہ ایسا جمالیاتی احساس پیدا نہیں کر سکتا، جیسا ایک تصویر آسانی سے کر سکتی ہے کیونکہ تصویر عمارت کو مع پس منظر پیش کرتی ہے۔ طلبہ کو دکھانے اور سبق کا شوق دلانے یا سبق کے کسی حصے کو سمجھانے کے لیے کارڈ سائز کی تصاویر بھی کام دے سکتی ہیں لیکن ان کی تعداد کافی ہونی چاہیے۔ تاکہ توضیح کے وقت طلبہ میں تقسیم کر دی جائیں اور وہ انفرادی طور پر انھیں اچھی طرح دیکھ سکیں۔

(د) خاکے گراف اور نقشے وغیرہ:۔ تصویر اصل شے کی مجموعی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ خاکوں اور نقشوں سے جزوی مطالعے کا مصرف لیا جاتا ہے۔ دراصل خاکوں کا صحیح مصرف یہی ہے۔ پیچیدہ خاکے بے کار بلکہ مضر ہوتے ہیں۔ خاکے میں صرف وہی باتیں دکھائی جائیں جن کا بنانا مقصود ہے۔ بعض معلم سبق کے ساتھ ساتھ تختۂ سیاہ پر خاکہ بناتے جاتے ہیں۔ یہ بہترین طریقہ ہے۔ سبق کے بعد ایسے خاکے، نقشے اور گراف وغیرہ طلبہ سے بھی بنوانے چاہئیں

توضیحات کی افادیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن غیر ضروری توضیحات تضییع اوقات کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لیے توضیحات کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اور مرئی توضیحات کے ساتھ ساتھ زبانی توضیحات سے بھی مدد لینی چاہیے۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں مرئی توضیحات کی زیادہ ضرورت ہے۔ بڑے بچوں کے سمجھانے کے لیے بڑی حد تک زبانی توضیحات پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

توضیحات کے انتخاب میں بلحاظ عمر طلبہ کی دل چسپی کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ شروع میں بیان کیا گیا۔ دل چسپی کا تعلق جبلات و عواطف سے ہے۔ دل چسپی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی شے کسی نہ کسی جبلی تحریک سے وابستہ ہو یا اکتسابی ہونے کے سبب کسی سے پیوستہ ہو۔

فن کار مدرس

شیخ اصغر علی

ماہرینِ تعلیم، تدریس کو فنون کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ وہ چیز جس کا تعلق عمل سے ہو اور وہ کام جس میں مہارت پیہم مشق کی محتاج ہو یقیناً ایک آرٹ، ایک فن ہے۔ مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس فن کو اس طور حاصل کرے اور اس میں وہ مشق بہم پہنچائے کہ وہ فن کار مدرس کہا جا سکے۔ مدرسین کی جماعت پر نظر دوڑائیں تو عام مدرس تو ایک کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں، لیکن فن کار مدرس خال خال۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خوبیاں اور کون سے اوصاف ہیں جو ایک عام اور فن کار مدرس میں امتیاز قائم کرتے ہیں۔ ایک عام مدرس اور فن کار مدرس میں وہی فرق ہے جو ایک عام شاعر اور فن کار شاعر۔ ایک عام ادیب اور ایک فن کار ادیب اور ایک عام افسانہ نگار اور ایک فن کار افسانہ نگار میں ہوتا ہے جس طرح ایک عام شاعر کے اشعار رفعتِ تخیل سے محروم، خلوص سے عاری اور سلیقے کے محتاج ہوتے ہیں۔ یا جس طرح ایک عام افسانہ نگار کے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے ڈھیلے، واقعات کے لحاظ سے غیر فطری اور تاثر کے نقطۂ نظر سے سپاٹ ہوتے ہیں۔ یا ایک عام ادیب کے ادب پارے ایک بدنظمی، بے ہنگم پن اور بدسلیقگی کے مرقع ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک عام معلم کے اسباق سلیقہ کے جوہر سے محروم، اور تاثر اور دل چسپی کے اعتبار سے صفر ہوتے ہیں۔ اس کے سبقوں میں وہ جاذبیت نظر نہیں آتی جو ایک سگھڑ خاتون کی گھریلو ترتیب یا ایک سلیقہ مند آرٹسٹ کی تصویروں میں نمایاں ہوتی ہے۔ فن کار استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک سلیقہ شعار مدرس ہو۔ اس کا ہر ہر سبق اور اس کی تدریس کی ایک ایک منزل اس کے شستہ ذوق کی عکاس اور اس کے سلیقے اور نفاست کی آئینہ دار ہو۔

سلیقہ کیا ہے

سلیقہ ذوق کی اس صفت کا نام ہے جس کے ذریعے لطافت اور تناسب کی تخلیق ہوتی ہے

یہ سلیقہ اگر ادب کی روح ہے تو تدریس کی جان۔ سبق کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک سلیقے کی ضرورت ہے عبارت برائے مطالعہ کے انتخاب سے لے کر اس کی تدریس اور اس کے اختتام تک کا سارا کام سلیقے پر مبنی ہوتا ہے۔ سلیقہ کو ایک ذہنی اور داخلی صفت کا نام ہے۔ گر شاعر، مصنف، مدرس اس کے ذریعے فن کی خارجی شکل و صورت کو روپ دیتے اور اپنے شاہکاروں کی نوک پلک درست کرتے ہیں سلیقہ تخلیق حسن میں بہت بڑا حصہ لیتا ہے اور سبق کی مختلف کڑیوں میں توازن و تناسب اسی کا مرہون منت ہے۔ سلیقہ کی تعریف میں میر صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے ؎

سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں ٭ عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے

میر صاحب کو تو اپنی سلیقہ مندی پر بڑا ناز ہے۔ وہ اس جوہر کو اپنے لیے وجہ افتخار سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مرے سلیقے سے مری نبھی محبت میں ٭ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

وہ محبت میں تو سلیقہ بقول میر تقی میر ناکامیوں کو کامرانیوں میں بدل دیتا ہے۔ لیکن دنیائے تدریس میں سلیقے کا جوہر جس کے ہاتھ آجائے اسے قدم قدم پر سوائے کامیابی کے اور کچھ پیش ہی نہیں آتا۔ پس مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سبق کے ہر حصے میں سلیقے کو پیش نظر رکھے۔ اس کی تمہیدی گفتگو جس کا مقصد بچوں کو نئے سبق کے لیے تیار کرنا یا اصطلاح میں تحریک ذہنی ہوتا ہے، سلیقے کا مرقع ہو۔ وہ اپنے سلیقے سے دور از کار باتوں کو نظر انداز کرتا ہوا نہایت ضروری اور کام کی باتیں بتائے۔ بچوں کی دلچسپیوں اور ان کے طبعی رجحانات کو نگاہ میں رکھے لیکن سبق کے مفہوم سے دور نہ جانے پائے کسی شاعر اور مصنف کی زندگی کے حالات سنائے تو ہر جماعت کی استعداد اور تقاضائے سبق کے پیش نظر اس کی زندگی کے انھی گوشوں کو بے نقاب کرے، جو مفید اور ازبس ضروری ہوں۔ چھٹی جماعت کے طلبہ کو یہ بتانا کہ غالب شراب کا رسیا تھا اور غالب کا یہ شعر سنانا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مدرس کی عدم سلیقگی کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ سے مربوط اردو مضمون کو تاریخی رنگ دینا تو بجا لیکن اسے
فن تاریخ کا سبق بنا دینا کہ سننے والے کو وہ ادب اور زبان کا سبق ہی نظر نہ آئے۔ سلیقہ مندی کے فقدان
کا اظہار کرتا ہے۔ بچے کی تحریک ذہنی کے لیے نفس مضمون سے الگ ہو کر کوئی کہانی۔ یا لطیفہ سنانا نہ صرف
ضیاع اوقات ہے۔ بلکہ بد سلیقگی کا اظہار۔

بعض اساتذہ تحریک ذہنی کو تفریح کا مترادف قرار دے کر بعض ایسے اقدامات کرتے ہیں
۔ ان کی تمہیدی گفتگو اصل سبق سے بے ربط ہو جاتی ہے۔ یوں تو ہر سبق کی تمام منازل استاد کے سلیقے کی
محتاج ہوتی ہیں۔ لیکن یہ منزل بالخصوص اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ استاد بڑے غور اور بڑی احتیاط
سے تحریک ذہنی کا سامان پیدا کرے کہ اس کی دلآویز۔ اور سلیقہ مندانہ گفتگو سے طلبہ کے اذہان خود بخود
نئے سبق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور ان کا جذبۂ تجسس و اشتیاق بیدار ہو جائے۔ استاد کو یہاں
اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اس تحریک ذہنی میں ضرورت سے زیادہ وقت نہ لے۔ اسے
چونکہ ایک محدود وقت میں سبق کو مکمل کرنا ہے، اس لیے اگر اس نے وقت کے تناسب کا خیال نہ رکھا
تو ہو سکتا ہے کہ اس کے لمبے عمل سے تحریک ذہنی تو وجود میں آ جائے لیکن اس تحریک ذہنی
سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے پاس وقت نہ رہے۔ تمہید کے مواد کی مناسبت اور اس کے
انتخاب کے علاوہ وقت کے تناسب کا احساس بھی سلیقے ہی کا کرشمہ ہے۔ مختلف معانی رکھنے والے الفاظ
میں صرف ضروری معنی بتانا، اشعار کی مناسب تشریح۔ عبارت پر موزوں سوالات ان سب میں ایک سلیقے
اور قرینے کی ضرورت ہے۔ اور وہ مدرس جو سلیقے ایسی نعمت سے محروم ہے تدریس سے انصاف نہیں
کر سکتا۔

خلوص :۔ سلیقے کے علاوہ ایک اور چیز جو ایک فن کار مدرس میں بنیادی شرط کا حکم رکھتی ہے
خلوص ہے۔ کوئی فن خلوص کے بغیر اپنے اظہار میں مکمل اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گویا فن اور خلوص لازم و ملزوم
ہیں۔ آج کے استاد میں اگر کسی چیز کی کمی نظر آتی ہے تو وہ یہی خلوص ہے۔ یوں تو تقریباً ہر پیشہ میں کام
چرانے اور بد دلی سے سرانجام دینے کا مرض وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن تعلیم و تعلم میں تو یہ

یہ بیماری اس قدر عام ہے کہ ہمارے معلم کے رگ و پے میں رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں
کہ اس بددلی کی تہ میں بہت سے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ اور اقتصادی زبوں حالی ان میں سے ایک ہے
وہ شخص جو "پراگندہ روزی" ہو شاید "پراگندہ دل" بھی ہوتا ہے۔ اور پراگندہ دل انسان سے خلوص کی توقع رکھنا
عبث۔ لیکن اس بحث سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ایک غیر مخلص استاد کبھی بھی اپنی تدریس کو جاندار
اور کامیاب بنا سکتا ہے۔ خلوص کی عدم موجودگی میں کوئی فن پروان نہیں چڑھ سکتا۔ علامہ اقبال کے نزدیک
ہر ہنر اور ہر فن کے لیے خلوص ایک بنیادی لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس فن میں خلوص کارفرما نہ ہو
وہ آنی و فانی ہے۔ وہ اپنی شہرۂ آفاق نظم مسجد قرطبہ میں کہتے ہیں ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مغل دور کی عمارات اور ان کے نقش و نگار ہوں یا مغنیوں اور موسیقاروں کے اختراع کردہ سُر
اور راگ۔ سب اپنے صناعوں اور موجدوں کے خلوص کی واضح للکار اور ان کے خونِ جگر کے صحیح عکاس ہیں
خلوص فن کو حیات جاودانی بخشتا اور آرٹ کو ابدی قدریں عطا کرتا ہے۔ پُرخلوص تدریس بچوں کے ذہنوں
بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ اور معلم کا خلوص، وہ رنگ لاتا ہے کہ طلبہ خود خلوص کے پیکر
بن کر اخلاص کے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ جذبات کو متعدی کہا جاتا ہے۔ اور استاد کی شخصیت کا طلبہ پر
جس قدر گہرا اثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کے جذبات طلبہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک بددل استاد اپنے شاگردوں
میں بددلی سے کام کرنے کی عادت راسخ کرتا ہے۔ اور مخلص معلم اپنے متعلمین کو خلوص کی سی لازوال دولت عطا
کرتا ہے۔ ایک غیر مخلص استاد یقیناً اپنے فن سے وفا نہیں کرتا، بلکہ اس کا منہ چڑاتا ہے۔ فن تدریس میں

خلوص کارچاؤ ہو اور استاد شجر تعلیم کو اپنے خونِ جگر سے سینچے تو یہ درخت قابلِ رشک برگ و بار لا سکتا ہے ورنہ یہ درخت سدا بہار ہونے کی بجائے ٹنڈ منڈ نظر آئے گا۔ ہاں کسی خوش گوار ماحول میں اتفاق سے ہری بھری کونپلیں پھوٹ نکلیں تو اور بات ہے۔

پلان سازی

سلیقہ اور خلوص کے علاوہ ایک فن کار مدرس کا تیسرا امتیازی نشان اس کی تیاری اسباق ہے وہ مدرس جو سبق دیکھے بغیر اور اس کی تیاری سے بے نیاز جماعت میں آتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ اس ماہرِ فنِ تعمیر کی ہے جو بغیر نقشہ بنائے اور خاکہ تیار کیے ایک بہت بڑی عمارت کی تعمیر شروع کرا دیتا ہے اور جوں جوں عمارت بنتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہدایات جاری کرتا جاتا ہے۔ بھلا ایسے ماہر فن تعمیر کی اس سے بڑی حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک سوچے سمجھے پلان کے بغیر وہ اتنے معماروں اور مزدوروں کی محنت، ایک کثیر رقم اور قیمتی وقت یونہی بے کار کھوتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح سے بنی ہوئی عمارت اپنی ہیئت اور شکل و صورت کے اعتبار سے نہایت بے ہنگم اور غیر متناسب ہو گی۔ ایسی عمارت میں حسن و خوبی کا پایا جانا تو خیر دور کی بات ہے وہ عام تقاضوں اور ضروریات کو بھی پورا نہ کر سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا مکان بھی بنوانا مقصود ہو تو پوری محنت اور غور و خوض سے اس کا نقشہ تیار کر لیا جاتا ہے کہ عمارت میں کوئی خامی رہنے نہ پائے۔

ایک آرٹسٹ کو دیکھیے۔ تصویر شروع کرنے سے پیشتر گھنٹوں ذہن کے کینوس پہ ایک تصویر بناتا اور خیال کے موقلم سے اس میں رنگ بھرتا ہے اور پھر کہیں جا کر اسے کاغذ کی سطح یا کینوس پہ حقیقت کا روپ عطا کرتا ہے۔

ایک افسانہ نگار، افسانے کا پلاٹ سوچتا۔ واقعات کا تانا بانا اور کڑی کو کڑی سے جوڑ کر زنجیر بنا دیتا ہے۔ پلاٹ سوچے بغیر ناول اور افسانے کا جو حشر ہوتا ہے وہ کسی ناقد سے پوچھیے یا اس افسانہ نگار سے جو نقادوں کے سامنے اسے برائے تنقید پیش کرتا ہے۔ ایک بڑھئی کرسی اور میز بنانے سے پیشتر اس کا ڈھانچہ کاغذ پہ کھینچ کر اس کی موزونیت اور خوب صورتی کا جائزہ اس کے ہر پہلو سے لے لیتا ہے تو پھر کیا تدریس ہی ایسا فن ہے کہ استاد بغیر تیاری اور بغیر پلاننگ کے جماعت میں جائے۔ اور

اَن سوچے سوالات سے محل کو ریت کی بنیادوں پر استوار کرنا شروع کردے۔ ایسے معلم کی مثال جو بغیر تیاری کے جماعت میں جاتا ہے اس سپاہی کی سی ہے جو پہلے سے ترکش کو تیروں سے بھر کرلے جانے کی بجائے میدانِ جنگ میں تیر ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ وہ معلم جو نئے سبق کا خاکہ تیار کیے بغیر جماعت میں جاتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے طلبہ سے انصاف نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی مشکل میں پھنسا تا ہے، اور بارہا دیکھا گیا ہے کہ ایسا مدرس کبھی خود گمراہ ہو جاتا ہے اور کبھی اپنے شاگردوں کو غلط معلومات بہم پہنچا کر گمراہی کے غار میں دھکیل دیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ معلم جو پورے مطالعہ کے بعد نئے سبق کا ایک پلان تیار کر کے جماعت میں جاتا ہے وہ تھوڑے وقت میں ایک عظیم فائدہ حاصل کرتا ہے اس کا راستہ واضح معین اور صاف ہوتا ہے، وہ اپنے طلبہ کی مدد سے تدریس کا ایک عظیم الشان محل تھوڑے سے وقت اور معمولی سے صرف سے نہایت استوار بنیادوں پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اور ان خطرناک گڑھوں میں گرنے سے خود بھی محفوظ رہتا ہے اور اپنے طلبہ کو بھی بچاتا ہے۔ جن میں اکثر لاپروا اور غیر محتاط مدرس اپنے شاگردوں سمیت جا گرتے ہیں۔

سبق کی پلاننگ سے مراد یہ ہے کہ معلم ہر نئے سبق میں یہ سوچے کہ وہ "تحریک ذہنی" کے فریضہ کیونکر ادا کرے گا۔ نئے مواد کو کس انداز سے پیش کرے گا کہ وہ طلبہ کے لیے قابل قبول ہو۔ عبارت کے کس حصے کی وضاحت کی جائے گی۔ کون کون سے مشکل الفاظ تختہ سیاہ پر لکھے جائیں گے، اور کون کون سے بذریعہ استعمال بچوں کے عملی ذخیرۂ الفاظ میں شامل کرنے ہوں گے۔ اصلاح تلفظ کی کہاں کہاں ضرورت پیش آئے گی محاورات وضرب الامثال کی تشریح کیسے ہوگی۔ عبارت کا مفہوم کن سوالات کے ذریعہ اخذ کرایا جا سکے گا صرفی ونحوی نکات کا عملی اطلاق کیسے نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ سبق کے کون سے حصے میں سیرت و کردار تعمیر کا سبق دیا جا سکتا ہے۔ کس کس مثال، کون کون سی توضیح اور کس قسم کے چارٹ اور تصاویر سبق کو جاندار اور دلچسپ بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ سبق میں زبانی اور تقریری کام کتنا ہوگا اور عملی اور تحریری کام مدرس اگر ان تمام اقدامات کا مداوا اور ان تمام منازل کو سر کرنے کا سامان فراہم کر کے چلے تو کامیاب ورنہ اس کا حشر وہی ہوگا جو اس آرکیٹیکٹ کا ہوا جس کی کوتاہ تیاری نے ایک خوب صورت محل

معمول بھلیاں بنا کر رکھ دیا تھا۔

کامیاب تدریس کے لیے محض موادِ تدریس کی تیاری کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ معلم کو اپنے طلبہ کے طبعی اور ذہنی اختلافات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہر اس سوال کے لیے تیار کرنا ہے جو جماعت میں پوچھا جا سکتا ہے۔ اسے خود کو کسی خاص نکتہ پر بحث و تمحیص اور تبادلہ خیالات کے لیے بھی لیس کرنا ہے پھر اس تیاری میں خاصی لچک کی ضرورت ہوتی ہے۔ استاد جماعت میں اس لیے نہیں جاتا کہ جو مواد اس نے تیار کیا ہے وہ طلبہ کے سامنے اگل دے یا جن خطوط میں اس نے تیاری کی ہے وہ بڑی سختی سے انھی خطوط پر گام زن رہے اور طلبہ کے مطالبے، اور تقاضے، ان کے رجحانات اور وقتی ضروریات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی اس متعینہ راہ سے ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہو۔ ایسی پابندی اور سختی طلبہ کے لیے مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرس کو اپنے موضوع کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ طلبہ جن کی تدریس کا کام مدرس کو سونپا دیا گیا ہے وہ اس موضوع اور مواد سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی خواہشات کا احترام، ان کے مناسب تقاضوں کا پاس اور فطری رجحانات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے اگر تیاری کے اس ڈھانچے سے لچک کو خالی کر دیا جائے تو اس سے جماعت کی فطری نشو و نما اور تدریجی بالیدگی کے رک جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اور طلبہ ایسی تدریس کو جو ان کی رضامندی کے بغیر ان پر ٹھونسی جا رہی ہو اپنے اوپر جبر اور زیادتی خیال کرتے ہیں۔ انشا پردازی کے سبق میں کسی پہلے سے سوچے ہوئے موضوع کو اس طرح جماعت کے سامنے پیش کرنا کہ تمام طلبہ بطیب خاطر اس پر لکھنے کے لیے تیار ہو جائیں مدرس کے کمالِ فن کا آئینہ دار ہے۔ لیکن اگر مدرس اپنی پوری تا ورد انکلامی کے باوجود طلبہ کو اس موضوع کی طرف مائل نہ کر سکے اور تمام طلبہ کسی دوسرے عنوان پر طبع آزمائی کرنا پسند کرتے ہوں تو مدرس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہونا چاہیے کہ وہ ان کی بات کو مانے اور انھیں اپنی پسند کے موضوع پر کام کرنے کا موقع دے۔

<u>شفقت</u>:۔ مندرجہ بالا امور کے علاوہ تدریس کی کامیابی کا دار و مدار مدرس کی شفقت اور اس کے ہمدردانہ رویہ میں مضمر ہے۔ معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جماعت میں ایک ایسی فضا قائم کرے

جو طلبہ کے لیے موجب کشش اور باعث اطمینان ہو۔ ایسا ماحول جس میں طلبہ کے اذہان پر خوف مسلط رہے یا ایسی جماعت جس میں معلم اور متعلمین کے درمیان ہمیشہ ہی ایک اجنبیت اور بُعد کا پردہ حائل رہے، کامیاب تدریس کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ لڑکے استاد سے متنفر ہوں یا استاد طلبہ سے دونوں صورتوں میں طلبہ کو کسی قسم کے فائدے کا پہنچنا ناممکن ہے۔ معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمدردی کے جذبے سے سرشار اور شفقت ایسی خوبی سے متصف ہو۔ جماعت میں ہر وقت تیوری چڑھائے رہنا۔ بات بات پر ماتھے پہ بل ڈالنا۔ نفرت آلود نگاہوں سے گھورنا۔ ذرا سی کوتاہی پر بچوں کی گوشمالی کرنا۔ ایک معلم کے شایانِ شان نہیں۔ مدرس کو بردبار اور متحمل مزاج ہونا چاہیے۔ طلبہ سے لغزشوں کا سرزد ہونا تو یقینی ہوتا ہے۔ استاد کے لیے لازم ہے کہ اصلاح کے وقت اس کا لہجہ ہمدردانہ اور رویہ مشفقانہ ہو۔ لڑکوں کو سدھارنے میں قمچی کا آزادانہ استعمال اور دیگر جسمانی سزائیں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اگر معلم جسمانی سزا سے وقتی طور پر نظم و ضبط قائم کرنے یا اپنے سوال کا کوئی معقول جواب اخذ کرانے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ مدرس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جماعت میں اس کی حیثیت ایک ڈکیٹیٹر اور ایک جابر و قاہر حاکم کی نہیں ہے کہ وہ طلبہ پر ڈنڈے کے زور سے حکومت کرے۔ وہ بچے جو اس کی تحویل میں دیے گئے ہیں وہ بھی اس کی طرح جذبات کے پتلے ہیں۔ کچھ اُن میں نازک مزاج ہیں۔ کچھ بہت زیادہ حساس۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ڈھیٹ بھی ہوں۔ لیکن استاد کے غیر مشفقانہ برتاؤ اور اس کے غیر منصفانہ سلوک کو کوئی گروہ بھی پسند نہیں کرتا۔ جہاں اول الذکر دو شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ نہ صرف استاد بلکہ اس کی پوری تعلیم سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ وہاں تیسری قسم کے طلبہ ڈھیٹ سے زیادہ ڈھیٹ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اچھی اور خوش گوار تدریس اچھے اور خوش گوار ماحول کی متقاضی ہے۔ جب تک خوف و ہراس کی تلوار طلبہ کے سروں پر لٹکتی رہے گی اور جب تک سزا اور مار پیٹ کا ہوّا ان کے ذہنوں پر مسلط رہے گا، درس و تدریس کے لیے سازگار فضا مہیا نہ ہو سکے گی۔ جسمانی سزا کا خوف طلبہ کی خود اعتمادی کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ وہ پڑھتے ہوئے مدرس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے، جملے بناتے ہوئے غرض کہ ہر تدریسی فعل کی سر انجام دہی میں

جھجکتے ہیں۔ کانپتے ہیں۔ ان کے اندر احساس کہتری جنم لیتا ہے۔ ذہن طرح طرح کی نفسیاتی الجھنوں کی آماجگاہ بنتا ہے۔ وہ استاد کو ظالم، خود کو مظلوم اور تعلیم کو ذریعۂ ظلم سمجھنے لگتے ہیں۔ استاد کی غیر حاضری ان کے لیے پیغام مسرت اور مدرسہ کی تعطیل ان کے لیے مژدۂ فرحت ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہی معلم جماعت میں مہر و محبت کی فضا پیدا کر دے تو بقول نظیری بھگوڑے بچے مدرسے سے بھاگنا تو کجا چھٹی کے دن بھی اسکول دوڑے چلے آئیں گے ؎

درس ادیب گر بود زمزمۂ محبتے ÷ جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

استاد کا سلوک اور طرزِ عمل ایسا ہو کہ بچے اسے اپنا دوست، ہمدرد اور رہنما سمجھیں۔ مشکلات کے اندھیرے میں استاد ان کے لیے روشنی کا مینار، اور الجھنوں کی تاریکیوں میں معلم ان کے لیے شمع ہدایت ہو۔ علم ایک نور ہے اور استاد اس نور کا علم بردار۔ استاد جب تک طلبہ کے دلوں میں گھر نہ کر لے اور اپنے رویے سے یہ نہ ثابت کر دے کہ اس کا مقصد ان کے جسموں کو پیچو کنا نہیں، بلکہ اس نور سے ان کے دماغوں اور قلوب کو روشن کرنا ہے، وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ معلم جو کمزور طلبہ کو طنز کا نشانہ بناتا یا انھیں سرمایۂ تضحیک و تمسخر سمجھتا ہے اپنی راہ میں آپ کانٹے بوتا ہے۔ استاد اور شاگرد میں جب تک ایک ذہنی ہم آہنگی نہ ہو اور جب تک ان کے مزاجوں میں ایک خوش گوار سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک تدریس کا مرحلہ عقدہ لاینحل بنا رہتا ہے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ طلبہ کے طور طریق، مزاج اور ان کی شخصی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کرے۔ ان کے ساتھ ایک شخصی رابطہ اور علاقہ پیدا کرے اپنے اور طلبہ کے درمیان اجنبیت کی خلیج حائل نہ ہونے دے۔ یہ کام کتنا ہی کٹھن سہی لیکن اس کا پھل بڑا رسیلا ہے ؎

مڈل امتحان کے نصاب میں تخفیف

ڈائرکٹر تعلیمات حلقہ لاہور کا اعلان

مختار صادق

جناب ایم۔ اے مخدومی ڈائرکٹر تعلیمات حلقہ لاہور نے اپنے گشتی مراسلہ نمبر ۸۵/۴/۲۷۴۴ — مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ء کے ذریعہ اعلان کیا ہے کہ

سابقہ پنجاب اور سابقہ ریاست بہاول پور کے اضلاع سے جو طلبہ اور طالبات مڈل سکول کے امتحان میں سن ۱۹۵۹ء میں یا اس سے بعد شریک ہوں گے ان کے لیے نصاب کا بوجھ ہلکا کر دیا گیا ہے۔ یہ رعائتیں جن کی تفصیل نیچے درج ہے اس وقت تک نافذ رہیں گی جب تک مڈل کا موجودہ نصاب باقی ہے۔ آٹھویں جماعت کے علاوہ ساتویں اور چھٹی جماعتوں کو بھی کچھ رعائتیں دی گئی ہیں۔

مڈل سکول کے امتحان میں شامل ہونے والوں کو اب ذیل کی رعائتیں حاصل ہوں گی :—

(۱) امیدواروں کے لیے تمام مضامین میں پاس ہونا لازمی نہیں ہوگا۔ اینگلو ورنیکلر مدرسوں کے طلبہ کے لیے انگریزی، اردو، اور ریاضی (لڑکیوں کے لیے صرف حساب) میں کامیاب ہونا لازمی ہوگا اور ورنیکلر سکولوں کے طلبہ کے لیے اردو اور ریاضی میں (لڑکیوں کے لیے صرف حساب) میں کامیاب ہونا لازمی ہے۔ ان لازمی مضامین کے علاوہ جو امیدوار مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک میں کامیاب ہو جائے گا وہ امتحان میں کامیاب سمجھا جائے گا۔

(ا) معاشرتی علوم

(ب) عام سائنس

(ج) اختیاری مضامین

(۲) جو امیدوار مندرجہ بالا مضامین میں سے کسی ایک میں ناکام رہنے کے علاوہ کسی اور مضمون میں پانچ نمبروں کی کمی سے فیل ہو رہا ہوگا اسے پانچ رعائتی نمبر دے کر پاس کر دیا جائے گا۔

(۳) جو امیدوار خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ مڈل سکول کے امتحان میں انگریزی میں ناکام رہ جائے گا اسے اجازت ہوگی کہ اگلے سال صرف انگریزی کا امتحان پاس کر کے نویں جماعت میں داخل ہو جائے ایسے امیدواروں کو مڈل سکول امتحان کی سند اسی صورت میں ملے گی جب وہ انگریزی امتحان پاس کر لیں۔

نصاب میں تخفیف

(۱) انگریزی

(i) :۔ امیدواروں کو انگریزی سے اُردو میں اور اُردو سے انگریزی میں جو ترجمہ کرنا ہوگا وہ صرف اسی ذخیرہ الفاظ تک محدود ہوگا جو آٹھویں جماعت کے لیے مقرر شدہ ہے۔

(ii) مضمون نویسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ امیدواروں کو مضامین کی بجائے بیانیہ قسم کے چھوٹے چھوٹے پیراگراف لکھنے ہوں گے۔

(iii) آٹھویں جماعت کی درسی کتاب سے ذیل کے صفحات حذف کر دیے گئے ہیں:۔

۷ ، ۲۲ ، ۳۱ ، ۳۵ ، ۱۳۴ ، ۱۴۲ ،

(۲) ریاضی

امیدواروں سے مختلف قاعدوں کے ان حصوں کا مطالعہ نہیں کرانا ہوگا۔ جن کا عملی زندگی کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ امتحان میں جو سوالات بھی دیے جائیں گے وہ سیدھے سادے ہوں گے جن میں طلبہ کو لمبی چوڑی باریکیوں میں گئے بغیر ریاضی کے اصولوں سے کام لینا پڑے گا۔

(۱) حساب (مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

برائے جماعت ششم :۔ سود مفرد کے قاعدے میں صرف آسان اور سیدھے سوالات کرائے جائیں غیر ضروری کسور والے مشکل اور پیچیدہ قسم کے سوالات سے احتراز کیا جائے۔

برائے جماعت ہفتم :۔ تجارت مفرد اور تجارت مرکب کے قاعدوں میں ایسے سوالات نہ کرائے جائیں جن میں غیر ضروری اور مشکل کسور آتی ہوں، یا جن کے جوابات کسروں میں آتے ہوں۔

برائے جماعت ہشتم :- (۱) جذر کے قاعدہ میں صحیح اعداد، کسور عام یا کسور اعشاریہ کے صرف وہی سوالات کرائے جائیں جن کا پورا پورا جذر دریافت ہو سکتا ہو۔ نامکمل مربعوں اور IRRATIONAL NUMBERS مثلاً $\sqrt{2}$ $\sqrt{3}$ وغیرہ کے جذر نکالنے کے سوالات نہ کرائے جائیں (۲) سود مرکب کے سوالات میں صرف وہ سوالات کرائے جائیں جن میں سود سالانہ شمار ہو۔ ششماہی یا سہ ماہی طور پر واجب الادا رقم کے سوالات نہ کرائے جائیں۔ (۳) مسئلہ فیثا غورث لڑکیوں کے نصاب میں سے خارج کیا جائے (۴) تناسب مرکب میں سے مرد، عورتیں اور بچوں کے سوالات حذف کیے جائیں۔ (۵) وراثت اور شراکت کے صرف سادہ سوالات کرائے جائیں۔ (۶) تناسب کے کسی سوال میں دو VARIABLES سے زائد نہ ہونے چاہئیں (۷) لڑکیوں کے لیے میزانیہ میں صرف گھریلو بجٹ ہونا چاہیے۔ بہی کھاتہ متعلقہ تجارت اور کمپنیوں کا میزانیہ غیر ضروری ہیں۔ (۸) پرچہ سوالات میں کافی متبادل سوالات دینا چاہئیں

(ب) الجبرا

برائے جماعت ہفتم :- (۱) جمع کے سوالات میں تین سے زیادہ جملوں کو جمع نہ کرایا جائے۔ (۲) "کسور اعشاریہ کی مساوات"۔ حذف کیا جائے۔

(ج) جیومیٹری

برائے جماعت ہشتم (۱) مربع دار کاغذ کے ذریعے اشکال کا رقبہ دریافت کرنے کے طریقے کو حذف کیا جائے (۲) فیلڈ بک کے سوالات لڑکیوں کو نہ کرائے جائیں۔ ان کی بجائے انھیں رقبہ دریافت کرنے کے آسان سوال کرائے جائیں۔ (۳) حجامت کے قاعدے حذف کیے جائیں۔

(۳) اُردو (اردو کی درسی کتاب میں مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

(أ) برائے جماعت ششم

(۱) خطوط غالب بنام میر مجروح	صفحہ	۵ تا ۸
(۲) خواتین عرب کا استقلال (نظم)	"	۹۴ و ۹۵
(۳) حجاج اور ابن جبیر	"	۱۰۹ تا ۱۱۴

(۴)	تربیت اطفال	صفحہ	۱۵۷	تا	۱۶۱
(۵)	نافرمان بادشاہ	//	۱۷۲	//	۱۷۷
(۶)	کمال اتاترک	//	۲۱۵	//	۲۲۱
(۷)	جھینگر اور شہد کی مکھی (نظم)	//	۲۲۲	//	۲۲۴

ب) برائے جماعت ہفتم

(۱)	گھر کی خرابی (نظم)	//	۲۴	//	۲۵
(۲)	اصغری اور ماما عظمت	//	۴۶	//	۵۸
(۳)	میاں خوجی اور ماما مچھی	//	۷۱	//	۸۰
(۴)	ماہتاب (نظم)	//	۱۳۷		
(۵)	خطوط حالی بنام ظفر علی	//	۱۵۸	//	۱۶۲
(۶)	ہیمو بقال	//	۱۹۷	//	۲۰۷
(۷)	ایا صوفیہ	//	۲۳۱	//	۲۴۶
(۸)	شریف بیبیاں	//	۳۱۸	//	۳۱۹

ج) برائے جماعت ہشتم

(۱)	خطوط غالب	//	۱۶	//	۲۳
(۲)	اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے (نظم)	//	۴۱	//	۴۳
(۳)	بابر کی یلغار	//	۸۲	//	۹۱
(۴)	ذرّے کی سرگذشت	//	۱۰۲	//	۱۱۱
(۵)	خواتین عرب کا استقلال (نظم)	//	۱۴۰	//	۱۴۲
(۶)	شیخ امام بخش ناسخ	//	۲۰۰	//	۲۰۵
(۷)	بھادوں کا بادل	//	۲۰۶	//	۲۰۸
(۸)	من اور تن (نظم)	//	۲۳۴		

(۴) سائنس (مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

(ا) برائے جماعت ششم

(۱) آبی جانور کس طرح سانس لیتے ہیں — صفحہ ۲۷
(۲) آگ بجھانے کا آلہ — " ۴۵
(۳) پانی کے نل کی ٹونٹی — " ۷۱
(۴) نمکیات — " ۸۱
(۵) وٹامن — " ۸۲
(۶) کولڈ سٹوریج یعنی برقی سرد خانہ — " ۱۰۶ تا ۱۰۷

(ب) برائے جماعت ہفتم

(۱) سیسہ کا آکسائڈ تیار کرنا — " ۹
(۲) تھرمامیٹری پیالے — " ۶۵
(۳) مختلف اشیا کی ایصالیت کا موازنہ — " ۷۲
(۴) گرہن، سورج اور چاند گرہن — " ۱۰۷
(۵) علاج ہیضہ — " ۱۳۶ تا ۱۳۷

(ج) برائے جماعت ہشتم

(۱) سٹوو — " ۳۱
(۲) اینی رائڈ بیرومیٹر — " ۳۳
(۳) لیور کے اقسام — " ۵۶ تا ۶۴
(۴) برف بنانے کی مشین — " ۷۰
(۵) (i) میکسیمم و منیمم تھرمامیٹر
(ii) خشک و تر گولی کا تھرمامیٹر — " ۸۴ تا ۸۹

(۶)	قانون انعطاف	صفحہ	۹۴
(۷)	برقی گھنٹی	"	۱۲۷ و ۱۲۸
(۸)	کنڈینسر (آلہ تکاثف)	"	۱۵۰ زراعت و باغیچہ والی کتاب کا صفحہ ۸ نمبر
(۹)	ہیورٹ کا تجربہ	"	۱۶۱ " " " ۱۶۵

(ح) سائنس برائے طلباء دستی فنون

برائے جماعت ششم

دستی فنون کے چار ابواب میں سے کوئی دو پڑھائے جائیں

برائے جماعت ہفتم

دستی فنون کے چار ابواب میں سے کوئی دو پڑھائے جائیں۔

برائے جماعت ہشتم

دستی فنون کے پانچ ابواب میں سے کوئی تین پڑھائے جائیں۔

(س) سائنس برائے طلباء زراعت و باغیچہ کے مشاغل

برائے جماعت ششم

چھٹا اور ساتواں باب حذف کیا جائے۔

برائے جماعت ہشتم (مندرجہ ذیل حذف کیے جائیں)

(۱)	پودے کی زندگی کے لیے ضروری عناصر	صفحہ	۱۹۰ تا ۱۹۳
(۲)	چوتھا باب ۔ زرعی زمین کا کٹاؤ کے باعث ناقابل کاشت ہونا اور اس کا علاج	"	۲۰۷ " ۲۱۴
(۳)	عمل آسموسس	"	۲۱۵
(۴)	پھول دار پودوں کی ساخت	"	۲۴۶ تا ۲۵۱

دوسری

برائے جماعت ہشتم (سائنس - زراعت و باغیچہ کے مشاغل) مندرجہ ذیل حذف کیا جائے۔

(۱)	ٹڈا	صفحہ	۱۹۰	تا	۱۹۳
(۲)	ٹڈی، دیمک اور لٹو کا میں سے کوئی دو کیڑے پڑھائے جائیں	"	۱۹۶	"	۲۱۱
(۳)	کپاس یا گنا پڑھایا جائے	"	۲۶۲	"	۲۶۷

(س) سائنس برائے طالبات (مندرجہ ذیل مضامین خارج کیے جائیں)

برائے جماعت ششم

(۱)	مقدار کے پیمانے نمبر۲ اور نمبر۳	صفحہ	۹۴		
(۲)	پارچات (دوسرا باب)	"	۱۶۶	تا	۱۷۳

برائے جماعت ہفتم

(۱) دھلائی و رنگائی کا پہلا باب "پانی" پر سوالات پرچہ الف میں پوچھے جائیں	"	۱۷۰	تا	۱۷۶
(۲) دھلائی و رنگائی کا تیسرا باب "لیمن"	"	۱۸۵	تا	۱۸۸
(۳) پیٹی کوٹ . فراک اور رات کا لباس (صرف جانگیہ اور لیڈی سکھائی جائے)	"	۲۲۹	"	۲۳۰

برائے جماعت ہشتم

(۱) امور خانہ داری "کھانا پکانا" کے باب پنجم میں کوفتے، شامی کباب، سیخ کباب اور مرغ کا سالن وغیرہ اگر ممکن ہو تو سکول میں مشق کرائی جائے امتحان میں نہیں دینا چاہیے	صفحہ	۱۲۱	تا	۱۲۳
(۲) امور خانہ داری باب پنجم "کھانا پکانا" میں مٹھی نمک پارے اور پڈنگ		۱۲۶	"	۱۲۸

(۴) دھلائی رنگائی کے پہلے باب میں مصنوعی ریشے صفحہ ۱۷۶ تا ۱۸۱

نوٹ :- امتحان میں لڑکیوں کے لیے ڈرافٹ کی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔

⑤ معاشرتی علوم (مندرجہ ذیل حذف کردیے گئے ہیں)

برائے جماعت ششم

(تاریخ ہندو پاکستان)

(۱) ہندوستان کے اصلی باشندے (صرف مختصر حالات بتائے جائیں۔ قوموں کے نام وغیرہ بتانے کی ضرورت نہیں)

(۲) آریوں کی مذہبی کتب

(۳) بدھ مت کی ترقی کے اسباب اور بدھ مت کی مجلسیں۔

(۴) سکندر اعظم کے تحت طوائی قبیلہ سے مقابلہ

(۵) محمد بن قاسم کے حالات کے تحت مندرجہ ذیل عنوانات

سندھ کی سیاسی حالت۔ خلافت بنوامیہ۔ نیرون اور سیوستان کی فتح۔ راوڑ اور برہمن آباد کی فتح۔

(۶) محمود غزنوی سے پہلے ہندوستان کی مذہبی و معاشرتی حالت اور اس کا بھیرہ پر حملہ۔

(تاریخ اسلام)

(۷) خلیفہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کے تحت :- دمشق کی فتح۔ یرموک کی لڑائی۔ فلسطین کی فتح مصر کی فتح۔

(جغرافیہ)

(۸) براعظم ایشیا کے مندرجہ ذیل ممالک :-

لنکا، عمان۔ مسقط۔ جزائر بحرین۔ جزیرہ نما ہند چینی۔ تھائی لینڈ۔ فرانسیسی ہند چینی۔ فلپائن بیرونی منگولیا۔

معاشرتی علوم ۔ حصہ جغرافیہ جماعت ششم :۔ (مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

(۹) براعظم افریقہ کے مندرجہ ذیل ممالک :۔

وسطی افریقہ اور ساحل گنی ۔ نائیجیریا ۔ کینیا ۔ یونین جنوبی افریقہ ۔ موزمبیق ۔ جزیرہ میڈوغاسکر موریشس

نوٹ :۔ (۱) جو ممالک خارج کر دیے گئے ہیں ۔ ان کے ناموں سے بچوں کو روشناس کروا دیا جائے

(۲) مندرجہ بالا براعظموں کے متعلق پڑھاتے ہوئے ان باتوں پر زور دیا جائے جن سے ان براعظموں کے ممالک کا پاکستان سے تعلق اور تجارت کا واسطہ ہے ۔

برائے جماعت ہشتم (مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

(تاریخ ہند و پاکستان)

(۱) التمش ۔ چنگیز خاں ۔ سکندر لودھی ۔ قطب الدین بختیار کاکی ۔ خواجہ گیسو دراز ۔

(۲) بابر کے حالات کے تحت جنگ کنواہہ اور ہمایوں کے حالات کے تحت چونسہ کی لڑائی اور جنگ قنوج ۔

(۳) ہندوؤں کی تہذیب پر اسلامی اثرات ۔

(۴) اکبر اعظم کے حالات کے تحت بنگال کی بغاوت اور حکیم مرزا کا پنجاب پر حملہ ۔

(۵) جہانگیر کے حالات کے تحت خسرو کی بغاوت ۔ قطب الدین کوکہ کا قتل ۔

(۶) شاہ جہان کے حالات کے تحت قندھار کی مہمات ۔ بلخ و بدخشاں کی مہمات ۔

(۷) اورنگ زیب کے حالات کے تحت سیواجی مرہٹہ سے جنگ ۔ سیواجی کی خود مختاری ۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح ۔ راجپوتوں کی بغاوت ۔

(۸) مغربی سیاحوں کے سفر نامے ۔

تاریخ اسلام

(۹) ولید بن عبدالملک (۱۰) ہارون رشید

حصہ (جغرافیہ) (یورپ کے مندرجہ ذیل ممالک حذف کردیے ہیں)

(۱۱) بلجیم - نیوزی لینڈ۔ لکسمبرگ ۔ سکنڈے نیویا۔ پولینڈ۔ چیکوسلاویکیہ۔ آسٹریا۔ رومانیہ۔ یوگو سلاویہ بلغاریہ۔ شمالی امریکہ میں الاسکہ اور میکسیکو۔ وسطی امریکہ۔ جنوبی امریکہ میں وینیزویلا، کولمبیا۔ پیرو بولیویا یوروگوئے۔ پیراگوئے اور ارجنٹائن ۔

نوٹ (۱) جو ممالک خارج کردیے گئے ہیں ان کے ناموں سے بچوں کو روشناس کرا دیا جائے ۔

برائے جماعت ہشتم (مندرجہ ذیل حذف کردیے گئے ہیں)

(تاریخ ہندو پاکستان)

(۱) پرتگیزیوں کی آمد۔ ولندیزیوں کی آمد۔ فرانسیسیوں کی آمد۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش۔

(۲) وارن ہیسٹنگز کے حالات کے تحت روہیلوں سے جنگ۔ مرہٹوں کی پہلی جنگ

(۳) لارڈ ولزلی کے حالات کے تحت مرہٹوں کے جھگڑے۔ مرہٹوں کی دوسری لڑائی۔ مرہٹوں کی تیسری لڑائی۔

(۴) افغانستان پر حملہ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک ۔

(۵) لارڈ ڈلہوزی کے حالات کے تحت برہما کی دوسری لڑائی اور برار کا معاملہ ۔

(۶) لارڈ رپن کے حالات کے تحت افغانستان کی دوسری لڑائی۔ میسور کی واپسی ۔

(۷) لارڈ کرزن کے حالات کے تحت خارجہ حکمت عملی۔ برار کا معاملہ ۔

(تاریخ اسلام)

(۸) عثمان بن ارطغرل۔ اورخان۔ مراد اول۔ بایزید اول (بلدرم) تیمور کا حملہ۔ محمد اول - مراد ثانی۔ المغرب - مراکش ۔

(شہریت)

(۹) نوٹ - پنچائت صرف دیہاتی طلبہ کو پڑھائی جائے اور میونسپلٹی صرف قصباتی طلبہ کو پڑھائی جائے۔

(۴) اختیاری مضامین (مندرجہ ذیل حذف کر دیے گئے ہیں)

برائے جماعت ششم

سلیبس میں دی ہوئی صنعتوں کی فہرست میں سے بجائے تین کے صرف دو صنعتیں انتخاب کی جائیں۔ ہر ششماہی میں ایک ایک صنعت کا انتخاب کیا جائے تاکہ سال میں دو مختلف صنعتیں سکھائی جا سکیں۔

برائے جماعت ہفتم

سلیبس میں دی ہوئی صنعتوں کی فہرست میں سے دو کی بجائے صرف ایک صنعت کا انتخاب کیا جائے لیکن پوری ہدایات اور ٹریننگ دی جائے۔

برائے جماعت ہشتم (کوئی تبدیلی نہیں کی گئی)

نوٹ :- چھٹی اور ساتویں جماعت میں صنعتوں کے کم کرنے کا یہ مقصد ہے کہ آٹھویں جماعت میں جہاں طلبہ نے صرف ایک صنعت منتخب کرنی ہے، وہ منتخب شدہ صنعت کو زیادہ اعلیٰ معیار پر سیکھ سکیں ۔

مختار صادق

پبلیکیشنز آفیسر

برائے ڈائرکٹر، سررشتۂ تعلیم، لاہور ریجن - لاہور

نئے پڑھنے والوں کے میلان کا مطالعہ

دہلی پبلک لائبریری میں یونیسکو کے تعاون سے نئے پڑھنے والوں کے ذہنی میلان کا مطالعہ کیا جا رہا ہے بعض
ہی تدابیر کی عملی آزمائش کی جا رہی ہے جو ان لوگوں کے شوق کو بڑھانے میں مدد دیں گی۔ اس مطالعے سے دو فائدے
(د)رہوں گے، اول یہ کہ اس سے مصنفین ناشرین اور لائبریریوں کو یہ پتہ چل جائے گا کہ جنوبی ایشیا کے لوگ کس قسم
(ک)ی چیزیں پڑھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی فرمائش کے مطابق ان کو کتابیں مہیا کی جا سکیں۔ علاوہ ازیں لائبریرین اپنی
(ا)پنی لائبریریوں کو زیادہ مقبول بنا سکیں گے اس سے لوگوں کی بھلائی کا موقع ملے گا

۱۹۵۵ء میں دہلی پبلک لائبریری کی عام کارکردگی کا جائزہ لینے کے سلسلہ میں لوگوں کے شوق مطالعہ کے
(با)رے میں چند اعداد و شمار فراہم کیے گئے۔ یونسکو نے یہ رپورٹ دہلی پبلک لائبریری کی ترقیاتی رپورٹ کے نام سے
(ش)ائع کی۔ اب اس رپورٹ کے پیش نظر لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کی عادات مطالعہ کا وسیع پیمانے پر
(ج)ائزہ لیا جا رہا ہے۔

اس جائزے کے منتظمین کو مندرجہ ذیل مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لائبریریوں میں آرٹ اور فلسفہ
(ج)یسے مضامین کی کتابوں کے ہی اعداد و شمار رکھے جاتے ہیں۔ مضامین کی ضمنی شاخوں کا کوئی معقول ریکارڈ
(ن)ہیں رکھا جاتا۔ پڑھنے والے صرف انھی کتابوں سے انتخاب کرتے ہیں جو لائبریری میں موجود ہیں۔ اس لیے ان کا
(ذو)ق محدود ہو جاتا ہے۔ اور پھر کسی موضوع پر اچھی سی کتاب نہ ملنے سے شوق مدھم بھی پڑ جاتا ہے۔

بعض لوگ اپنے پڑھنے کے شوق کو مبالغے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اکثر ایسی کتابوں کے نام لیتے ہیں
(ج)ن کے پڑھنے کی خواہش ان کے ذہن میں ہوتی ہے۔ حالانکہ بتانا یہ چاہیے کہ وہ اصل کون سی کتاب پڑھتے ہیں
بعض لوگ بغیر کسی خاص مقصد کے ادھر ادھر کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے
(کہ و)ہ اتنی مختلف کتابیں کیوں پڑھتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو چونکہ کتابیں خود خریدنی نہیں پڑتیں۔ اس لیے جو
(کت)اب بھی سامنے آتی ہے اس کی ظاہری سج دھج دیکھ کر ہی لے لیتے ہیں۔ اس سے ان کے شوق کا اندازہ
(مش)کل سے ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا مقصد معلوم کرنا اس لیے مشکل ہے کہ بعض خاص ذوق کے آدمی تفریحاً

دوسری کتابیں پڑھنی شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ٹیکنیکل آدمی محض وقت کے کاٹنے کے لیے غیر فنی کتابیں پڑھنے شروع کر دیتے ہیں۔

دہلی پبلک لائبریری یہ جاننے کے لیے کہ لوگ کیا اور کیوں پڑھتے ہیں دو طریقے استعمال کر رہی ہے۔ (۱) لائبریری کے ریکارڈ کا تجزیہ (۲) سوال نامہ :- یہ جاننے کے لیے کہ پچھلے پانچ برسوں میں کن کن مضامین کو زیادہ پڑھا گیا ہے اور کن پڑھنے والوں میں کمی ہوئی ہے۔ پرانے ریکارڈ کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ دس زیادہ پڑھے جانے والے مضمونوں کا اور دس کم پڑھے جانے والے مضمونوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ ایک دن میں ان مضامین کی کتنی کتابیں جاری ہوئیں۔ ٹیکنیکل اور آرٹ کے مضمونوں کے متعلق بھی ایسی جانچ پڑتال ہو رہی ہے یہ بھی معلوم کیا جا رہا ہے کہ بعض مصنف کیوں زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور کس قسم کے ناول زیادہ کیوں پسند کیے جاتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ مطالعہ محض تفریحاً یا کسی خاص مقصد کے لیے ہوتا ہے پڑھنے والوں کے رجحانات کا ایک سہ ماہی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ پڑھنے والوں کے شوق کی وسعت اور باہمی میلانات کا اندازہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی معلوم کرنے کی سعی کی جائے گی۔ آیا پڑھنے والے کسی خاص ظاہری باقاعدگی سے پڑھتے ہیں کہ فلاں وقت فلاں مضمون پڑھا جائے یا فلاں فلاں کتاب فلاں وقت پڑھی جائے۔ یا ایک مشکل کتاب کے بعد آسان کتاب پڑھنی چاہیے یا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے

ایک تجربہ یہ جاننے کے لیے کیا جائے گا کہ بعض مضامین کے علاوہ کونسی چیزیں کتاب کے انتخاب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل عوامل کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کتاب کا سرورق۔ تصویریں۔ سائز۔ اور کاغذ کی قسم۔ ٹائپ وغیرہ۔ مختلف قسم کے تقریباً پانچ سو پڑھنے والوں کو سوال جوابات کے لیے دیے جائیں گے کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں پڑھنے والوں کی عادات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ الماریوں میں پڑی ہوئی کتابوں سے وہ کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ مضمون کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لیے مختلف مضامین کے پڑھنے والوں کی دلچسپی معلوم کرنے کے لیے لائبریری والے ایک ماہ کی تمام درخواستوں کا ریکارڈ رکھیں گے اس کے علاوہ لائبریری کے ملازمین بھی سوال نامے کے جواب دیں گے کہ پڑھنے والے کیا پسند کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے۔ ایسے ہی سوال نامے دوکانداروں کو بھی دیے جائیں گے ❊

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستا بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئیے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

ارہ ۸] لاھور [نومبر

mia Millia
15 MAR
DELHI

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم۔ اے۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش
لاہور

نومبر ۱۹۵۸ء

سالانہ چندہ

جلد ———— ۱۱
شمارہ ———— ۸

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیمی مسائل اور تحقیقی مطالعہ

ایم۔ اے مخدومی

تعلیمی مسائل میں عوامی دلچسپی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کیوں کہ جب کوئی مسئلہ توجہ کا مرکز بن جائے تو اس کے حل کی منزل نسبتاً قریب آجاتی ہے۔ ہم جمہوری قدروں کو اپنا چکے ہیں اور ایک جمہوری معاشرے میں اچھی تعلیم ہر بچے کا پیدائشی حق ہوا کرتا ہے۔ ہم اس نصب العین کو اپنی تعلیم کی آخری منزل قرار دے چکے ہیں لیکن اس منزل پر پہنچنے کے لیے ابھی ہمیں ایک لمبا راستہ طے کرنا ہے۔ ابھی ہم تمام بچوں کے لیے تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکے اور جو تعلیمی سہولتیں موجود ہیں وہ بھی عام حالتوں میں مسلمہ معیاروں سے بہت کمتر قسم کی ہیں۔ آج ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ تمام بچوں کے لیے معیاری قسم کی تعلیمی سہولتیں کس طرح مہیا کی جائیں۔ تمام دوسرے تعلیمی مسائل کی طرح تعلیمی مسائل کے حل کرنے کی طرف پہلا ناگزیر قدم یہ ہے کہ ان کے متعلق قابل اعتماد اعداد و شمار اور حقائق جمع کیے جائیں۔ ایک عام آدمی تعلیمی مسائل کے متعلق جو رائے قائم کرتا ہے، وہ کلی طور پر ذاتی تجربے پر مبنی ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم روزمرہ زندگی کے کاموں میں بالعموم ذاتی تجربے سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہیں، تعلیمی مسائل کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور ان کی وسعت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ ان کے متعلق صرف ذاتی تجربے کی بنا پر کوئی قابل عمل نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ تعلیمی مسائل ہمیشہ معاشرتی مسائل ہوا کرتے ہیں اور ان کی جڑیں معاشرتی زندگی کے سارے تانے بانے میں پھیلی ہوتی ہیں۔ ان کی گتھیاں سلجھانے کے لیے تحقیقی مطالعہ کے علاوہ کسی دوسری شے سے رہنمائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ تعلیمی مسائل کا حل اور تعلیمی تحقیق، دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔

تعلیمی تحقیق کی ذمہ داری کسی مرکزی ادارے کو ہی سونپی جا سکتی ہے جو ماہرین پر مشتمل ہو اور تعلیمی مسائل کا لگاتار مطالعہ کرتا رہے۔ علم التعلیم ایک سائنس ہے جو تحقیق و مطالعہ کی مخصوص سائنسی

ٹکنیکوں سے کام لیتی ہے۔ تعلیمی مسائل کا سائنسی مطالعہ ان عالموں کا کام ہے جو ان سائنسی ٹکنیکوں میں ماہر ہوں۔ ہمیں اس قسم کے مرکزی ادارے کی سخت ضرورت ہے جو مختلف تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر ان پر کارآمد روشنی ڈالتا رہے۔ اس قسم کی تعلیمی رہنمائی کے بغیر استاد کا کام موثر نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں دوسری ضرورت تحقیق کے نتائج کو نشر کرنے کی ہے۔ یہ کام کسی ایسے ادارے کے سپرد ہونا چاہیے جو تعلیمی کوائف اور تعلیمی تحقیق کے نتائج جمع کرے اور انھیں مرتب کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ صوبائی محکمہ تعلیم جو تعلیمی بورڈ قائم کر رہا ہے امید ہے وہ اس دوسرے کام کو بخوبی انجام دیگا۔

❊

وادیٔ پشاور

ہمارے ماضی اور حال کا آئینہ

فضل احمد

پاکستان کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کا درجہ حاصل کیے صرف گیارہ برس ہوئے ہیں۔ مگر اس نوخیز مملکت کی قومی زندگی جن بنیادوں پر کھڑی ہے وہ اس قدر پرانی ہیں کہ ان کے بیشتر حصوں کو تاریخ کے پورے اجالے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہم اس بات کے بہت آرزومند ہیں کہ ہم تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں ترقی یافتہ اقوام کے ہم دوش بن جائیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے پچھلے دس گیارہ برس میں جو کچھ کیا گیا ہے اس کے نقوش پاکستان کے گوشے گوشے میں نظر آئیں گے۔ مگر تعمیر نو کے سب سے شاندار باب غالباً وہ ہیں جو مغربی پاکستان کے شمال مغربی حصوں میں تیار ہو رہے ہیں۔ حسن اتفاق سے ملک کا یہی حصہ طویل صدیوں تک ہماری داستان ماضی کا محور بنا رہا ہے۔ ان ہر دو اسباب نے باہم مل کر پشاور کے نواح کو ماضی اور حال کا ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جو دیکھنے والی آنکھ کو ہر وقت دعوت نظارہ دیتا ہے۔

آموزش کی پچھلی اشاعت میں اس تعلیمی ورک شاپ کا ذکر کیا جا چکا ہے جو سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں ۴ جولائی سے ۱۰ جولائی تک جاری رہی۔ چوں کہ سیاحت علم و تجربہ کی توسیع اور نگاہ کی کشادگی کا ایک مسلمہ ذریعہ ہے، اس لیے فیصلہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی مذاکرات کے خاتمہ پر چند دن حلقۂ پشاور کی سیاحت میں گذارے جائیں۔ سرکاری بس کی موجودگی نے اس منصوبے کو اور بھی آسان بنا دیا تھا۔ لہٰذا ۱۱ جولائی کی صبح کو استادوں اور صدر معلموں کی وہ جماعت جو سیدو شریف میں جمع تھی، سنٹرل ٹریننگ کالج کے چند اساتذہ کی معیت میں پشاور کے لیے روانہ ہوئی اور ۱۳ تاریخ کو بعد دوپہر یہ سب لوگ راولپنڈی آپہنچے۔ یہ سیاحت ازبس سبق آموز اور دلچسپ ثابت ہوئی۔ ذیل میں اس کے اہم پہلوؤں کی مختصر سی روداد درج کی جاتی ہے۔

مالاکنڈ کی پن بجلی

سب سے پہلے پن بجلی کے ان دو اسٹیشنوں کو دیکھا گیا جن کی بدولت سابق صوبہ سرحد اور پنجاب کے ایک بڑے حصے کو سستے داموں روشنی اور قوت مہیا ہو رہی ہے۔ یہ پن بجلی درگئی اور جبّن کے مقامات پر پیدا ہوتی ہے۔ وادی سوات اور ضلع مردان کے درمیان خشک اور سنگلاخ پہاڑوں کا ایک سلسلہ حائل ہے جس کی چوٹی پر مالاکنڈ کا مشہور قلعہ واقع ہے۔ برطانوی دور سے اس قلعے میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ مقیم رہا ہے جس کا کام ان قبائلی علاقوں کا انتظام ہے جو ضلع مردان کے اُس پار آباد ہیں۔ چٹیل پہاڑوں کے پار جو وادی واقع ہے، اس کی سطح مردان کے میدان سے کم از کم ہزار فٹ اونچی ہوگی، دریائے سوات سنگلاخ پہاڑوں کے سینے کو چیر کر ایک گہری گھاٹی بناتا ہے۔ صدیوں سے اس کا حیات بخش پانی اس گھاٹی میں سے بہتا ہوا، نوشہرہ کے قریب دریائے کابل میں گر رہا ہے۔

مالاکنڈ کے منصوبے نے اس قدرتی نظام میں تھوڑی سی ترمیم کر کے دریائے سوات سے دوہری خدمت لی ہے۔ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان دریا پر بند باندھ کر درگئی اور جبّن کے مقامات پر دو آبشاریں پیدا کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر آبشار ۲ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرتی ہے۔ اس منصوبے کی بدولت مردان کے میدان کو وہ نہری پانی بھی میسر ہوا ہے جس نے اس کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ آج ضلع مردان کی سرسبزی اور شادابی دیکھ کر اس پر پنجاب کے زرخیز ترین اضلاع کا دھوکہ ہوتا ہے۔

کھانڈ کا کارخانہ

مردان میں کھانڈ کا وہ بڑا کارخانہ قائم ہے جسے ایشیا کا سب سے بڑا کارخانہ کہا جاتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں یہ کارخانہ بند رہتا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر اس کی عظمت اور معاشی اہمیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ کارخانہ گنے کی فصل تیار ہونے پر نومبر میں کام شروع کرتا ہے اور مئی کے آخر تک کام کرتا رہتا ہے، کارخانے کا انتظام ڈائرکٹروں کے ایک بورڈ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے چیئرمین والی سوات عبدالحق جہانزیب ہیں۔ مگر ڈائرکٹروں کے بورڈ نے کارخانہ چلانے کا کام ایک انگریزی تجارتی ادارے کو سونپ رکھا ہے۔

پریمیئر شوگر ملز مردان بلاشبہ ایک بہت بڑا کارخانہ ہے۔ یہ ہر سال کوئی اڑھائی لاکھ من کھانڈ تیار کرتا ہے۔ مردان کے نواح میں اب اس قدر گنا پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کارخانے کی ساری ضرورتیں پوری کرنے کے بعد بھی فاضل بچ رہتا ہے۔ اس کارخانے میں جو کھانڈ تیار ہوتی ہے وہ دنیا کی بہترین کھانڈ کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔ اگر پاکستان میں کھانڈ کا اتنا بڑا کارخانہ تیار ہونے کے باوجود ہمیں باہر سے کھانڈ منگوانی پڑتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک کارخانہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو آٹھ کروڑ آبادی کی ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔

اس کارخانے نے ۱۹۵۰ء میں کام شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اس کی پیداوار میں تقریباً لگاتار اضافہ ہوا ہے۔ مگر اب یہ اپنی انتہائی پیداوار کی حد کو پہنچ چکا ہے۔ کھانڈ بنانے کا کام اوّل سے آخر تک مشین کرتی ہے۔ گنوں سے رس نکال کر اسے نلوں کے ذریعہ بڑے بڑے حوضوں میں پہنچا دیا جاتا ہے یہاں اسے گرم کیا جاتا ہے۔ اور اس میں سے کاربن ڈائی اکسائڈ اور سلفر ڈائی اکسائڈ گذار کر اس کی کثافتیں دور کی جاتی ہیں اور اسے سفید رنگ دیا جاتا ہے۔ اب یہ رس بہت بڑے دباؤ کے نیچے پکایا جاتا ہے اور بالآخر اس سے راب الگ ہو جاتی ہے اور چمک دار سفید دانے الگ۔

پریمیئر شوگر ملز نے الکحل تیار کرنے کا منصوبہ بھی بنایا ہے۔ اس وقت اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے عمارت کی توسیع ہو رہی ہے۔ تاہم منصوبے کی تکمیل میں کچھ سال صرف ہوں گے پاکستان میں اس وقت الکحل بنانے کا کوئی کارخانہ موجود نہیں۔

پشاور یونیورسٹی

آزادی ملنے کے بعد ملک میں جو نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں ان میں پشاور یونیورسٹی کو پہلا مقام ملنا چاہیے کیونکہ اس یونیورسٹی کا مقصد جنگجو اور جفاکش قبائل کو علم و حکمت کی روشنی اور عزت کی زندگی عطا کرنا ہے، جو اجنبی اقتدار کے خلاف لگاتار جہاد میں معروف رہے۔ اور جن کے قوت بازو پر آج پاکستان کو بڑا بھروسہ ہے۔ پشاور یونیورسٹی کا قیام اس یقین کا نتیجہ ہے کہ جدید سائنسی دور میں قوت بازو کے پیچھے سائنس اور ٹکنالوجی کی قوت ہونی چاہیے۔ اکیلی قوت بازو آج جارحیت کا راستہ روکنے کے لیے کافی نہیں۔

پشاور یونیورسٹی شہر سے چند میل مغرب میں اس سڑک پر واقع ہے جو درۂ خیبر کو جاتی ہے۔ یہاں پہلے سے اسلامیہ کالج موجود تھا، اب یہ کالج پشاور یونیورسٹی کے وسیع نظام کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ یونیورسٹی کی جدید وضع کی دلکش عمارتوں اور اس کے وسیع و عریض میدانوں کو دیکھ کر اس پر ایک جدید مغربی یونیورسٹی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے لیے جدید وضع کی دو عظیم الشان عمارتیں پہلو بہ پہلو کھڑی ہیں۔ ان کے بالمقابل ایک سرسبز میدان کے پار دو عظیم الشان اقامت گاہیں ہیں جن میں ہر طالب علم کے لیے الگ الگ کمرہ تیار کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر اقامت گاہ میں ۰۰ طلبہ کے لیے گنجائش ہے۔ ان دو بڑی اقامت گاہوں کے علاوہ دو اور اقامت گاہیں بھی موجود ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے مختلف شعبوں کے علاوہ انجینیرنگ اور طب کے شعبے بھی قائم ہیں۔ ان دونوں شعبوں کی اپنی اپنی الگ عمارتیں ہیں۔ ان تمام عمارتوں کے علاوہ یونیورسٹی کے انتظامی دفتروں کے لیے ایک الگ عمارت موجود ہے۔ ان تمام عمارتوں کے علاوہ پروفیسروں، لیکچراروں اور یونیورسٹی کے چھوٹے بڑے ملازموں کے لیے بنگلے اور مکانات بھی تیار کیے گئے ہیں۔ ایک ہی درجے کے ملازموں کے لیے بنگلوں اور مکانوں کی ایک لمبی قطار دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کی اپنی بس سروس موجود ہے جو یونیورسٹی اور شہر کے درمیان واسطہ قائم رکھتی ہے۔ غرض پشاور یونیورسٹی ایک اقامتی ادارہ ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ بہترین علمی روایات قائم کرے، اور انہیں برقرار رکھے۔

یونیورسٹی کی شمالی حد سے آگے عمارتوں کی ایک اور قطار نظر آتی ہے۔ یہ پاکستان کا فارسٹ کالج ہے مرکزی حکومت کا یہ تربیتی ادارہ پہلے مری میں قائم تھا، مگر اب اسے پشاور میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہ کالج اپنے اندرونی معاملات میں ہر طرح آزاد ہے۔ مگر رسمی طور پر اسے پشاور یونیورسٹی کے ساتھ ملحق رکھا گیا۔ ہر چند کہ پشاور کے نواح میں کوئی جنگلات موجود نہیں جو طلبہ کی تعلیم و تربیت میں کام دے سکیں گے امید ہے کہ وارسک نہر کی تعمیر کے بعد اس علاقے میں کچھ جنگلات کاشت کیے جا سکیں گے۔

پشاور یونیورسٹی سابق صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ یونیورسٹی کی بیشتر عمارتوں کا سنگ بنیاد خان موصوف نے اپنے ہاتھ سے رکھا ہے۔ مگر کسی تعلیمی منصوبہ

عملی شکل دینے کے لیے اکیلی عمارتیں کافی نہیں۔ عمارتوں سے بڑھ کر پشاور یونیورسٹی کو ایسے استادوں کی ضرورت ہے جو علمی تحقیق اور اسلامی ثقافت کی بہترین روایات کے حامل ہوں۔ ایسے استاد حاصل کیے بغیر پٹھان نوجوانوں کو جدید سائنس کی روح سے آشنا نہیں کرایا جا سکتا۔

درۂ خیبر

پشاور یونیورسٹی سے صرف چند میل مغرب میں جمرود کا قلعہ واقع ہے۔ یہ قلعہ اس خشک اور بھیانک چٹان پر قدم جمائے کھڑا ہے جو شہرۂ آفاق درۂ خیبر کا مشرقی کنارہ ہے۔ جس شخص نے تاریخ کی اس انقلاب آفرین گذرگاہ کو پہلے نہ دیکھا ہو وہ اس کے متعلق عجیب و غریب تصورات ذہن میں لے کر آتا ہے وہ یہ خیال لے کر آتا ہے کہ عمیق اور سنگلاخ پہاڑی دیواروں کے درمیان چند گز یا چند سو گز لمبی ایک تنگ گھاٹی واقع ہوگی، جس کی ایک طرف پاکستانی سپاہی کھڑے پہرہ دے رہے ہوں گے اور دوسری طرف افغان سپاہی۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حقیقت حال اس سے کافی مختلف ہے۔ سنگلاخ پہاڑی دیواریں جمرود سے شروع ہو کر طورخم تک پھیلتی چلی گئی ہیں اور ان دونوں مقامات کا درمیانی فاصلہ ۲۵ میل سے زیادہ ہے۔ یہ سارے کا سارا درہ خیبر ہے۔ یہ وہ گذرگاہ ہے جس کی راہ سے فاتحین کے ان گنت ریلے برصغیر پاکستان و ہند میں آئے اور جو آج تک اس برصغیر اور وسط ایشیا کے درمیان آمدورفت اور تجارت کا واحد راستہ ہے۔

درۂ خیبر میں سے گذرنے والی پختہ سڑک اور ریل کی پٹڑی سنگلاخ پہاڑیوں کے سینوں پر بل کھاتی ہوئی گذرتی ہیں۔ مگر پہلے وقتوں کے فاتحین اور تجارتی قافلے اس پہاڑی ندی کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ سفر کیا کرتے تھے جس نے بھیانک پہاڑوں کے پہلو چیر کر وسط ایشیا اور برصغیر پاکستان و ہند کے درمیان یہ فراخ گھاٹی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ پہاڑی ندی جو عموماً خشک پڑی رہتی ہے دریائے کابل میں جا گرتی ہے۔ اس ندی میں پانی اس وقت آتا ہے جب حسن اتفاق سے اردگرد کی چٹیل پہاڑیوں پر بارش کی کچھ بوندیں گریں۔ تاہم سال بھر اس کے بعض حصوں میں پانی کے چھوٹے چھوٹے سوتے امید اور زندگی کا پیغام سناتے نظر آتے ہیں۔ اردگرد کی جھلسی ہوئی پہاڑیوں میں جو لوگ بستے ہیں ان کے لیے پانی کے

یہ سوتے آبِ حیات سے کم نہیں۔ وہ دور دور سے اس پانی کے گرد جمع ہوتے ہیں اور گھڑے
بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔

درۂ خیبر کی چوڑائی ہر جگہ ایک سی نہیں۔ اوّل اوّل یہ گھاٹی کافی تنگ ہے مگر چند میل تک
عمیق چٹانوں میں سے گذرنے کے بعد اس کی چوڑائی یک دم بڑھ جاتی ہے اور یہ کشادگی خاصے
فاصلے تک باقی رہتی ہے۔ اس سنگلاخ اور بے آب و گیاہ وادی پر بھورے رنگ کی چٹانی دیواریں
سورج کی کرنوں کو منعکس کر کے تانبے کے رنگ کی ایک تھرتھراتی ہوئی نورانی چادر تانے رکھتی ہیں
یہ چادر اس وادی کو ایک عجیب قسم کا پرہیبت حسن عطا کرتی ہے۔ وادی میں جگہ جگہ بھورے رنگ کے
قلعہ نما کچے مکان دکھائی دیتے ہیں۔ ارد گرد کے ٹنڈ منڈ پہاڑوں کی بھیانک چوٹیوں پر جگہ جگہ
قلعے قدم جمائے نظر آتے ہیں۔ اکثر مقامات پر جہاں پہاڑی دیواریں زیادہ تنگ ہو جاتی ہیں
ان کی بلندیوں پر مسلح سپاہی مینگنیں اٹھائے پہرہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان پُر وحشت نواحات
میں سے پختہ سڑک اور ریل کی پٹڑی لگاتار بل پیچ کھاتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں
ریل کی پٹڑی جگہ جگہ سرنگوں میں غائب ہو کر باہر نکلتی ہے۔ یہ پٹڑی اور سڑک اسی طرح
عمیق چٹانوں اور گہری گھاٹیوں کو عبور کرتی ہوئی لنڈی خانے تک چلی آتی ہیں۔ یہاں ریل کی پٹڑی
ختم ہو جاتی ہے۔ مگر پختہ سڑک آگے طورخم تک پہنچ کر پاکستانی سرحد کو عبور کرتی ہوئی افغان سرزمین
میں داخل ہو جاتی ہے۔

درۂ خیبر کے ارد گرد کے قبائلی علاقے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس جھلسی ہوئی سرزمین
کے باشندے گذر اوقات کیوں کر کرتے ہیں۔ ایک ایسی سرزمین جہاں گرما تو مون سون کے زمانے میں بھی
بارش کی بوند نہیں گرتی اپنے باشندوں کو زندگی کی کوئی سہولت عطا نہیں کر سکتی۔ اس پتھریلی صحرائی وادی
میں صرف تین چار چھوٹے چھوٹے نخلستان نظر آتے ہیں، جہاں سبز درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں
باقی کسی جگہ گھاس یا ہریاول کا نام و نشان نہیں۔ تاہم چاروں طرف نظر دوڑانے سے کہیں کہیں بکریاں
اور گائیں چرتی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ دیکھنے والے کے لیے یہ معمہ حل کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خشک پتھریلی

ڈھلانوں پر یکجا ہو رہی ہیں۔ تاہم پہاڑی دامن میں چھوٹی چھوٹی کھیتیوں اور کٹے ہوئے جَو کے آثار صاف دکھائی دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سردیوں کے موسم میں اس خشک وادی کو بھی تھوڑی بہت رطوبت میسر آجاتی ہے جس سے تھوڑا بہت اناج پیدا ہو جاتا ہے۔

جمرود میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ایسی زندگی سے دوچار پاتا ہے جو قرون وسطیٰ کا خاصہ تھی۔ کاروان سرائے۔ قافلے اور ان کے ساتھ وابستہ دوسرے الفاظ اب ہمارے لیے خیالی الفاظ رہ گئے ہیں مگر جمرود سے جس زندگی کی حکمرانی شروع ہوتی ہے ان میں یہ الفاظ ایک زندہ حقیقت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جمرود میں ایک سرائے موجود ہے جس کے پھاٹک میں سے گذر کر انسان اپنے آپ کو قرون وسطیٰ کی ایشیائی زندگی سے دوچار پاتا ہے۔ سرائے کے اندر دکانیں مسجد اور ان کے پیچھے رہائشی مکانوں کی ایک قطار دکھائی دیتی ہے، درۂ خیبر کو عبور کرنے والے قافلے جب سستانے کے لیے اس جگہ آن رکتے ہیں تو یہاں عجیب گہما گہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ لنڈی کوتل کی سرائے اس سے بہت زیادہ بڑی ہے۔ عام ضروریات زندگی اور کھانے کی دوکانوں کے علاوہ یہاں بڑی بڑی دکانیں بھی ہیں۔ لنڈی کوتل قبائلی علاقے کا ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ جہاں نہ صرف ارد گرد کے علاقے کی پیداوار جمع ہوتی ہے بلکہ باہر سے آئی ہوئی اشیا بھی تقسیم ہوتی ہیں۔ افغان سرحد سے بہت قریب ہونے کے سبب یہاں سرحد پار سے ناجائز طور پر لائی گئی اشیا بھی بکتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر قسم کا ولائتی کپڑا پاکستان کی دوسری منڈیوں کے مقابلے میں سستا بکتا ہے۔

طورخم درہ خیبر کا مغربی کنارہ ہے۔ یہاں سڑک پر ایک پھاٹک لگا ہے جس کے پیچھے ایک بھاری لوہے کی زنجیر سڑک کے متوازی لٹک رہی ہے۔ یہ پھاٹک پاکستانی اور افغان سرزمین کے درمیان حد فاصل ہے۔ پھاٹک سے ایک قدم آگے اٹھائیں اور آپ اپنے آپ کو افغان سرزمین میں پائیں گے پھاٹک کے اس پار ہماری فوجی چوکی ہے اور دوسری طرف افغان فوجی چوکی۔ ادھر چوکی پر پاکستانی پرچم لہراتا ہے اور اُدھر افغانستان کا ترنگا جھنڈا۔ ادھر پھاٹک پر ایک پاکستانی جوان پہرہ دے رہا ہے، اور اُدھر ایک افغان جوان وردی میں تنا کھڑا ہے۔ فوجی چوکی کے ساتھ پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کا

دفتر بھی ملحق ہے۔ درہ خیبر میں سے گذرنے والے ہر آدمی اور ہر گاڑی کو یہاں اپنا پروانہ راہداری دکھانا پڑتا ہے۔ اس دفتر کا اطمینان ہو جانے کے بعد راہ گذر کے لیے پھاٹک اٹھ جاتا ہے اور لحظہ بھر بعد وہ افغان سرزمین میں داخل ہو جاتا ہے۔

طورخم پر خیبر کی چٹانی دیواریں دوبارہ قریب تر آگئی ہیں۔ پھاٹک پر کھڑے ہو کر بائیں جانب نگاہ اٹھائیں تو ایک سفید لکیر پہاڑی دیوار کے اوپر سے گذرتی نظر آتی ہے۔ یہ مشہور ڈیورنڈ لائن ہے جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان حد فاصل تسلیم کی گئی ہے۔ بائیں جانب یہ لکیر پھاٹک کی سیدھ میں نکل گئی ہے مگر دائیں جانب یہ پھاٹک سے کوئی سو گز آگے نکل گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دائیں جانب کی پہاڑی کی چوٹی ایک نوکدار کی شکل میں افغان سرزمین کے اندر نکل گئی ہے۔ اس چوٹی پر ایک قلعہ تعمیر ہے جس پر پاکستانی پرچم لہراتا رہتا ہے۔

درۂ خیبر میں سے گذرتے وقت تخیل کی دنیا طرح طرح کی ذہنی تصویروں سے آباد ہونے لگتی ہے جن کے جلو میں عجیب و غریب ذہنی کیفیتیں امڈ آتی ہیں۔ ماضی کے دھندلکے سے لے کر حال ہی تک اس سنگلاخ گھاٹی کو تاریخ کے جن ناموروں نے پاؤں تلے روندا ہے یہاں ان کے کوئی مستقل نقش پا موجود نہیں مگر ارد گرد کی بھیانک پہاڑی دیواروں میں ان مجاہدوں کے گھوڑوں کے ٹاپ اب تک گونجتے معلوم دیتے ہیں۔ اور آنکھ بار بار اس انتظار میں اٹھ جاتی ہے کہ کوئی محمود یا محمد غوری یا احمد شاہ ابدالی ابھی سامنے کی پہاڑی اوٹ کے پیچھے سے نمودار ہوگا۔ یہ انتظار درہ خیبر کے آخری کنارے تک باقی رہتا ہے تا آنکہ آخری پاکستانی قلعہ کا "پرچم ستارہ و ہلال" اس امر کی یاد دہانی کراتا ہے کہ محمود، محمد غوری اور احمد شاہ ابدالی کے کام کو جاری رکھنے کی ذمہ داری اب اس قوم نے قبول کر رکھی ہے جس کے ہاتھ میں درۂ خیبر کی پاسبانی ہے۔ آج اس درے کی حفاظت کرنے اور جنگی فائدے حاصل کرنے کے لیے قوت ایمان کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت کی ضرورت ہے۔

درۂ خیبر میں جو گنتی کے سبز نقطے نظر آتے ہیں، ان میں سے ایک علی مسجد ہے۔ جمرود کی پہاڑیاں عبور کرنے کے بعد سڑک پہاڑی نالے کے کنارے پر آتی ہے۔ یہاں نالے کی گذرگاہ کے عین کنارے

سبز سایہ دار درختوں کا ایک جھنڈ ہے. سڑک سے نیچے اتر کر دیکھو تو اس جگہ ٹھنڈے سائے کے علاوہ پینے کے لیے صاف پانی بھی دستیاب ہے، درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک مسجد بنی ہے جو ایک کچے دالان اور کچے صحن پر مشتمل ہے. صحن کے جنوبی حصے میں ایک چھوٹا سا پست گنبد بنا ہوا ہے جس کی تین دیواروں میں محرابی دروازے بنے ہیں اور مغربی دیوار میں نماز پڑھنے کے لیے محراب. مقامی روایت یہ ہے کہ اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں تشریف لائے تھے، اور جہاں چھوٹا سا گنبد بنا ہے وہاں انھوں نے نماز ادا کی تھی. مقامی روایت یہ بھی کہتی ہے کہ تاریخ میں خیبر کا جو واقعہ حضرت علیؓ کے نام کے ساتھ منسوب ہے اس سے مراد درۂ خیبر کی تسخیر ہے. مدینے کے شمال میں یہودیوں کی بستی کو خیبر کا نام اس لیے ملا تھا کہ حضرت علیؓ اس کی فتح سے پہلے درۂ خیبر کو فتح کر چکے تھے. ہر چند کہ تاریخ ان روایات کو سہارا نہیں دیتی، مگر آزاد قبائل کو تاریخ سے کیا سروکار؟ ان کے نزدیک ہر وہ روایت ثقہ ہے جو ان کے مذہبی اعتقادات کو سہارا دے.

صوبہ گندھارا اور اس کی تہذیب

پشاور میں ایک عجائب گھر موجود ہے جو گندھارا تہذیب کے آثار سے اٹا پڑا ہے. جن علاقوں کو آجکل ریاست سوات. دیر. چترال. ضلع مردان. ضلع پشاور اور خیبر ایجنسی کا نام دیا جاتا ہے وہاں ولادت مسیح سے کئی سو سال پہلے گندھاریا نامی ایک آریہ شہزادے نے سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی جو اس کے نام گندھارا سے مشہور ہو گئی. چارسدہ کا شہر اس سلطنت کا صدر مقام تھا. ایران کے نامور شہنشاہ دارائے اوّل نے اس سلطنت کو فتح کر کے اسے اپنی وسیع قلمرو کا ایک صوبہ بنا لیا. نقش رستم کے شہرہ آفاق کتبے میں دارا اپنے اس صوبے کا ذکر بھی کرتا ہے. کہا جاتا ہے کہ دارائے اول نے جب یونانیوں پر فتح حاصل کی تو اس کی فوج کے گندھاری دستوں نے سب سے بڑھ کر دادِ شجاعت دی تھی. یونانیوں کے دلوں سے یہ خلش اس وقت مٹی جب دارائے سوم کے زمانے میں سکندر اعظم نے ایرانی سلطنت کا تختہ الٹ کر گندھارا کے پایۂ تخت چارسدہ کو پاؤں تلے روندا.

جب سکندر نے گندھارا کو زیر و زبر کیا تو یہاں بدھ مت پھیل چکا تھا. سکندر چارسدہ کو تہس نہس کرنے

کامیاب ضرور ہوا مگر اس کے حملے سے بدھ مت کو کوئی آنچ نہ آئی۔ گندھارا کے سارے علاقے میں بدھ دھرم
نے بڑا فروغ پایا۔ صدیوں کے عرصے میں اس علاقے کی وادی اور پہاڑیاں بدھ تہذیب کا گہوارہ بن گئیں
گوتم بدھ نے دنیاوی آرائشوں کے ساتھ بتوں اور مورتیوں کی بھی مذمت کی تھی۔ اس لیے
اس کی موت کے کئی سو سال بعد تک بدھ مت میں بتوں اور مورتیوں کے لیے کوئی گنجائش نہ نکل سکی
مذہبی عقیدت مندی کا جوش جب گوتم بدھ کی زندگی کو ٹھوس شکل میں پیش کرنا چاہتا تو اسے
زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جاتی کہ اس گھوڑے کا مجسمہ تیار کر دیا جاتا جس پر سوار ہو کر گوتم بدھ نے
محلوں سے فرار کیا تھا۔ مگر یہ گھوڑا سوار سے خالی دکھایا جاتا۔ بنارس کے جنگلوں میں گوتم کی نفس کش
ریاضت کا خاکہ کھینچنے کے لیے لکڑی کا وہ سنگھاسن بنا دیا جاتا جس پر گوتم آلتی پالتی مارے گیان دھیان
میں مصروف رہے۔ مگر یہ سنگھاسن ریاضت کرنے والے سے خالی دکھایا جاتا۔ سکندر کی وفات کے بعد
جب گندھارا یونانی اور رومی تہذیب کے اثر میں آیا تو بدھ مت کی ہیئت میں ایک بنیادی تبدیلی
پیدا ہونے لگی۔ گندھارا کے حکمرانوں کو اب یونانی اور رومی مصوروں اور سنگ تراشوں کی خدمات حاصل
ہو گئیں۔ جو دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بنانے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ ان فن کاروں نے پہلے پہل
بدھ روایات سے معمولی سا انحراف کیا۔ گھوڑا اور سنگھاسن بنانے کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ یونانی
اور رومی فن کاروں نے گوتم بدھ کا نقش بنا ڈالا۔ اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے
تھوڑے ہی عرصہ بعد گوتم بدھ کے بت اس کثرت سے بننے لگے کہ یہ مورتیاں دوسرے ہر معبود کی
مورتیوں سے تعداد میں بڑھ گئیں۔

گوتم بدھ کی مورتیاں بنانے اور بدھ مندروں کو ان مورتیوں سے سجانے کا جو فن یونانی
رومی اثرات کے ماتحت وجود میں آیا وہ تاریخ پاکستان و ہند میں گندھارا آرٹ کے نام سے موسوم
ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ گندھارا آرٹ نے گوتم بدھ کے جو بت تیار کیے ان کے لیے یونان
سورج دیوتا اپالو بطور نمونہ کے چنا گیا۔ رومی سنگ تراشوں کی رہنمائی کے لیے بدھ کی کوئی تصویر یا
موجود نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سورج دیوتا کا خاکہ تیار کر کے اسے ہندوستانی لباس کا تصو

رنگ دے دیا۔ بدھ کے خدوخال بالکل وہی قرار پائے جو سورج دیوتا اوپالو کے تھے۔ گندھارا آرٹ کے متعلق فنی نقادوں نے مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ اس آرٹ نے صدیوں تک بدھ ثقافت کی عکاسی کی۔

گندھارا آرٹ کو سب سے زیادہ فروغ دینے والا حکمران کشن خاندان کا راجہ کنشک تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی میں پشاور کو پہلی بار گندھارا کا پایہ تخت بنایا۔ اس کے مذہبی جوش کا یہ حال تھا کہ اس نے بڑی کوشش سے گوتم بدھ کی کچھ متبرک راکھ حاصل کی اور ان ہڈیوں کو ایک سونے کی ڈبیا میں بند کر کے ان پر ایک عظیم الشان مندر تعمیر کرایا۔ یہ مندر اور اس کے اردگرد کے حجرے تمام کے تمام گوتم بدھ کے بتوں اور اس کی مورتیوں سے مزین تھے۔ انگریزی عہد میں پشاور شہر کے ایک قبرستان کے قریب سے کنشک کے مندر کے کھنڈرات ملے تھے۔ جب ان کی کھدائی کی گئی تو سونے کی وہ ڈبیا مل گئی جس میں گوتم بدھ کی متبرک ہڈیاں بند تھیں۔ ہڈیاں ایک شفاف شیشی میں ڈال کر سونے کی ڈبیا میں بند کی گئی تھیں۔ اس وقت کے وائسرائے ہند نے برما کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے یہ ہڈیاں ملکہ برما کو تحفتہً پیش کر دیں۔ مگر بلوریں شیشی اور سونے کی ڈبیاں جن میں ہڈیاں بند تھیں، اب تک پشاور عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ ہڈیوں کو اب رنگون کے عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گندھارا آرٹ کے نمونے اب تک قدیم صوبہ گندھارا کے علاوہ پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے بہت سے پشاور اور ٹیکسلا کے عجائب گھروں میں پہنچ چکے ہیں۔ گندھارا آرٹ کے شاہکاروں کا ایک بڑا ذخیرہ تخت بائی ضلع مردان سے ہاتھ لگا تھا یہاں کھدائی کرنے پر ایک بہت بڑا بدھ مندر برآمد ہوا تھا جس کے کئی حصے دست برد زمانہ سے جوں کے توں بچ رہے تھے۔ یہ نوادرات آج کل پشاور عجائب گھر کی زینت ہیں۔

گندھارا آرٹ کے علاوہ پشاور عجائب گھر کی دوسری کشش لکڑی کے وہ مجسمے ہیں جو کافرستان سے جمع کیے گئے ہیں۔ کافرستان کا علاقہ ریاست چترال اور افغانستان کے درمیان واقع ہے۔ یہاں کے لوگ جو اپنے آپ کو یونانیوں کی اولاد کہتے ہیں۔ اب تک اوہام پرست ہیں۔ وہ مُردوں کو نہ جلاتے اور

نہ دفن کرتے ہیں بلکہ برفانی پہاڑوں کے دامن میں یونہی پھینک آتے ہیں۔ بعد ازاں وہ دیار کی لکڑی سے مردے کا ایک مجسمہ بنا کر وہاں نصب کر آتے ہیں۔ اگر مرنے والا معمولی آدمی ہو تو اسے کھڑا دکھایا جاتا ہے اگر وہ صاحب حیثیت ہو تو اسے گھوڑے پر سوار دکھایا جاتا ہے۔ اور اگر وہ غیر معمولی حیثیت اور اقتدار کا مالک ہو تو اسے دو سروں والے گھوڑے پر سوار دکھایا جاتا ہے۔ پشاور عجائب گھر کی بالائی منزل میں ان چوبی مجسموں کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ موجود ہے۔

گندھارا کی بدھ تہذیب کے متعلق بعض اسلام دشمن عناصر نے یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی تباہی مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تاریخ سے معمولی آگاہی رکھنے والا آدمی بھی فوراً کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر یلغاریں شروع کیں تو گندھارا کے علاقے پر ہندو شاہی خاندان کی حکومت تھی اور بدھ ثقافت عرصے سے مٹ چکی تھی۔ بدھ ثقافت کو ملیامیٹ کرنے والے دراصل سفید ہُن تھے۔ ان وحشیوں کے نام مہرگل وغیرہ تھے۔ اس سے بعض بے خبر مغربی مؤرخوں کو ان کے مسلمان ہونے کا اشتباہ ہوا حالانکہ یہ خونخوار وحشی اسلام کے نام تک سے بے خبر تھے۔

ایک اور غلط فہمی جو بہت عام ہے یہ ہے کہ افغانستان کی راہ سے جو لوگ بھی برصغیر پاکستان و ہند میں آئے وہ درۂ خیبر کی راہ سے آئے۔ یہ درست ہے کہ مسلمان حملہ آوروں نے درہ خیبر کا راستہ ہی پسند کیا۔ مگر قدیم زمانے کے متعلق یہ بات درست نہیں۔ پہلے وقتوں کے حملہ آور دریائے کابل کے کنارے کنارے آتے رہے ہیں۔ مشہور یونانی حملہ آور سکندر نے دریائے کابل کا راستہ ہی اختیار کیا تھا یہ دریا جمرود سے کوئی پندرہ میل شمال کو ورسک کے مقام پر پشاور کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ سکندر نے اپنی فوج کا ایک حصہ چارسدہ کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کو روانہ کر دیا تھا، اور وہ خود فوج کے بڑے حصے کے ساتھ مالاکنڈ ایجنسی اور سوات کے آزاد قبائل کی سرکوبی میں لگ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کام نے اسے تقریباً سال بھر مصروف رکھا۔ ورسک کی فوجی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ انگریزوں نے پہلے ریل کی پٹڑی دریائے کابل کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ بچھائی تھی۔ مگر بعد میں

اسے دریائے خیبر میں منتقل کر دیا گیا۔

ناصر پور کا کارخانہ

پشاور اور مردان کا میدان پھلوں کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ پشاور سے تقریباً آٹھ نو میل مشرق میں جرنیلی سڑک کے کنارے ترناب کی مشہور زراعتی تجربہ گاہ واقع ہے۔ اس سرکاری فارم میں پھلوں کی کاشت کے متعلق طرح طرح کے تجربے ہوتے رہتے ہیں اور ان کے نتائج سے کاشت کاروں کو آگاہ رکھا جاتا ہے۔ اس زراعتی فارم کی بدولت پھلوں کی کاشت کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔

ترناب کے مغرب میں جرنیلی سڑک کے بالکل اوپر ناصر پور کی بستی ہے۔ جہاں غذائیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ قائم ہے۔ غذا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ معاشی دوڑ دھوپ کا سب سے پہلا مقصد ہمیشہ شکم پُری رہی ہے۔ جدید انسان نے زندگی کے ہر میدان میں سائنس سے جو حیرت انگیز خدمت لی ہے غذا حاصل کرنے اور اسے تیار کرنے کے عمل کو بھی اس سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ جدید انسان صرف جھلسے ہوئے صحراؤں اور برفانی بیابانوں سے طرح طرح کی فصلیں حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہے بلکہ وہ اس قابل بھی ہو گیا ہے کہ ہر قسم کی غذاؤں کو ہاتھ سے چھوئے بغیر تیار کرے، اور انھیں اس طرح ڈبوں میں محفوظ کر لے کہ ان کے ذائقے اور غذائیت میں مہینوں تک فرق نہ آنے پائے۔ غذائیں تیار کرنے کی اس صنعت نے مغرب میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ہر قسم کے پھلوں اور سبزیوں کو ڈبوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ موسم ختم ہونے کے بعد بھی یہ پھل اور سبزیاں دستیاب ہوتی رہیں۔ صرف یہی نہیں، ہر قسم کے گوشت مچھلیوں اور طرح طرح کے کھانوں کو بھی اسی طرح ڈبوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جدید انسان نے سائنس سے یہ سبق سیکھا ہے کہ غذاؤں کو خراب کرنے کا موجب وہ ننھے ننھے کیڑے ہوتے ہیں جو بکٹیریا کہلاتے ہیں۔ غذاؤں تک یہ بکٹیریا انسانی ہاتھ اور ہوا کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ اگر غذاؤں کو ان دونوں چیزوں کی دست برد سے بچا دیا جائے تو وہ ایک لمبے عرصے تک خراب نہیں ہوتیں۔ چناں چہ غذا تیار کرنے والے کارخانوں میں بیشتر کام مشینیں کرتی ہیں۔ تیار شدہ غذا کو ڈبوں میں بند کرنے سے پہلے ڈبوں کو بھاپ کی مدد سے بکٹیریا سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ پھر ان میں غذائیں ڈال کر مشین کی مدد سے ان کے اندر کی ہوا

ـرج کردی جاتی ہے اور ان کے منہ پر ایک مضبوط ڈھکنا کس دیا جاتا ہے۔ اب یہ غذا مہینوں تک
ی اصل حالت میں باقی رہتی ہے۔

مغرب میں ہر قسم کی غذائیں بڑی افراط کے ساتھ ڈبوں میں بند ملتی ہیں۔ سبزیوں، پھلوں، گوشت
لی وغیرہ کو محفوظ کرنے کے لیے انھیں کافی دباؤ کے نیچے بھاپ میں سے گذارنا پڑتا ہے، تاکہ ان کی رطوبت
م ہو جائے۔ اس عمل سے یہ چیزیں نیم پختہ ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈبوں میں بند غذاؤں کو
نے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ استعمال سے پہلے ڈبے کو کھول کر غذا کو گرم کرلینا ہی کافی ہوتا ہے۔ غذاؤں
صنعت نے مغربی زندگی کو بہت سہل بنا دیا ہے۔ اس کی بدولت نہ صرف عورتوں کو ہر وقت چولہا
م کرنے کے دردِ سر سے بڑی حد تک نجات مل گئی ہے۔ بلکہ سفر اور سیر و تفریح کا کام بھی ناقابلِ یقین
تک آسان ہو گیا ہے۔ آپ کنبے سمیت باہر کھلی فضا میں چھٹی منانے نکل جائیں اور اپنے ساتھ
ند ڈبے اور ایک سٹوو لے جائیں۔ اس سے آپ کو جنگل میں بیٹھے بیٹھے اپنی پسند کا گرما گرم کھانا
سر آجائے گا۔ غرض غذاؤں کی صنعت نے مغرب کی معیشت اور گھریلو زندگی میں ایک خوشگوار
نقلاب پیدا کر دیا ہے۔

ہمارے یہاں غذائیں تیار کرنے کی صنعت ابھی تقریباً ناپید ہے۔ اگرچہ مغرب کے مقابلے میں
ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ سخت گرم آب و ہوا میں غذائیں بڑی تیزی سے خراب ہو جاتی ہیں
نتیجہ یہ ہے کہ روزانہ لاکھوں روپے کی غذا (پھل، سبزیاں اور کھانے) گل سڑ کر یا باسی ہو کر ضائع
ہو جاتی ہیں۔ بیشتر پھل اور سبزیاں چند دنوں یا ہفتوں کی فراوانی کے بعد سال بھر کے لیے غائب ہو
جاتے ہیں۔ ایک غریب ملک کے لیے یہ صورتِ حال افسوس ناک ہے۔ مگر غذاؤں کی صنعت کو
ترقی دینے کے لیے مشینوں اور فنی ماہروں کی ضرورت ہے۔ ناصر پور میں غذائیں تیار کرنے کا جو کارخانہ
قائم ہے وہ غالباً پاکستان بھر میں اپنی قسم کا واحد کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ ایک ایسی راہ کی نشاندہی
کر رہا ہے جسے اختیار کرنے کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔

ناصر پور کا کارخانہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں برطانوی حکمرانوں نے قائم کیا تھا تاکہ

برطانیہ کی مشرقی فوجوں کو حسب ضرورت غذا مہیا کی جا سکے۔ اس زمانے میں یہ کارخانہ ہندو سرمایہ دار کو ٹھیکے پر دیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہندو دفعتہً یہاں سے نکل گئے تو ناصر پور کا کارخانہ معطل ہو گیا۔ حکومت پاکستان نے برطانوی حکومت کے نقش پا پر چلتے ہوئے یہ کارخانہ ٹھیکے پر دے دیا۔ مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ کارخانے کو چالو رکھنے کے لیے حکومت نے ایک اور تجربہ آزمایا۔ اس کے ایک تہائی حصے فروخت کر دیے گئے، اور دو تہائی حصے حکومت کے پاس رہے۔ کارخانہ چلانے کے لیے فرانسیسی ماہروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مگر یہ تجربہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ آخر حکومت نے تمام حصے بیچ دیے اور کارخانہ کلی طور پر نواب ہوتی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اب یہ کارخانہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کا انتظام ایک انگریز مینیجر کے ہاتھ میں ہے۔ فنی ماہروں میں بھی کچھ انگریز شامل ہیں۔

یہ کہانی ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونی چاہیے جو تمام صنعتوں کو قومی بنانے کے حق میں ہیں۔ پسماندہ معاشروں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ قومی صنعتیں کامیابی سے چلانے کے لیے سرکاری کارندے نہیں ملتے۔ ایسے معاشرے میں صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دے دینا ان کے دکھوں کا کوئی علاج نہیں۔ قومی صنعت کو خوبی اور دیانتداری سے چلانے کے لیے ایک بلند پایہ قومی کردار کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جب تک یہ کردار موجود نہ ہو، اس وقت تک سلامتی کی راہ یہی ہے کہ صنعتیں نجی املاک بنی رہیں تاکہ ذاتی نفع کا جذبہ افراد کو کفایت اور محنت کی دوگانہ راہ پر لگائے رکھے۔

ناصر پور کا کارخانہ پھلوں کے رس تیار کرنے کے علاوہ مختلف قسم کے مربے بھی تیار کرتا ہے۔ وہ مقامی پھلوں اور سبزیوں کو ڈبوں کو محفوظ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھنے ہوئے مرغ اور بریانی کو بھی ڈبوں میں محفوظ کر کے پیش کرتا ہے۔ مگر سبزیاں، مرغ اور بریانی وغیرہ ابھی اس قیمت پر پیش نہیں کی جا سکیں کہ عوام انھیں خرید سکیں۔ یہ چیزیں ابھی دولت مند امریکیوں اور پاکستانیوں کی ضرورت کو ہی پورا کرتی ہیں۔ تاہم پھلوں کے رس اور مربے واجبی قیمتوں پر تیار ہو رہے ہیں اور بازار میں خوب بکتے ہیں۔

پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کی صنعت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

کارخانہ دار اپنے پھل خود کاشت کرے تاکہ موزوں قسم کے پھل حسب ضرورت مقدار میں بروقت مل جائیں
مغربی ملکوں میں کارخانہ دار پھلوں کی کاشت خود کرتے ہیں۔ پاکستان میں پھل کا کارخانہ جو رِسالہ خورد میں وا
ہے۔ اس طرح کرتا ہے۔ مگر ناصر پور کے کارخانہ کو ابھی یہ سہولت میسر نہیں۔ اسے بیشتر پھل مقامی منڈی
خریدنے پڑتے ہیں یا دیہات سے جمع کرنے پڑتے ہیں۔ اس صنعت کی ترقی کے لیے دوسری ضروری شے
فنی ماہرین کی دستیابی ہے۔ پاکستان میں زراعتی کالج موجود ہیں مگر وہ پھلوں کو محفوظ کرنے کے متعلق خصو
تربیت نہیں دیتے۔ یہ تربیت غیر ممالک میں ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں سردست ایسے
نوجوان تقریباً مفقود ہیں جنھوں نے زراعتی تعلیم کے بعد پھلوں کے متعلق خصوصی تربیت حاصل کی ہو۔

وارسک کا کثیر الاغراض منصوبہ

پشاور چھاؤنی سے بیس میل شمال مغرب میں اور جمرود ریلوے اسٹیشن سے پندرہ میل شمال میں وارسک
چھوٹا سا قبائلی گاؤں واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے کابل سینکڑوں میلوں کی پہاڑی مسافت
طے کرنے کے بعد چٹانی دیواروں کے شکنجے سے نجات پاتا اور ہموار وادی پشاور میں داخل ہوتا ہے۔ وار
سکندر اعظم اور تاریخ کے کئی دوسرے فاتحین کو وادی کابل سے نکل کر برصغیر پاک و ہند میں داخل ہو
دیکھا ہے۔ آج اس چھوٹے سے گاؤں کے نواح میں کوئی چھ سات میل تک باربرداری اور تعمیر کی بھا
بھرکم مشینوں نے رات دن ایک غیر منقطع گرج پیدا کر رکھی ہے۔ یہاں ایک کثیر الاغراض منصوبہ تیزی سے
عملی شکل اختیار کر رہا ہے۔ یہ منصوبہ سنہ ۱۹۶۰ء میں مکمل ہو جائے گا اور اس کے طفیل نہ صرف ایک لاکھ
چالیس ہزار کلوواٹ بن بجلی پیدا ہونے لگے گی۔ بلکہ قبائلی علاقے اور ضلع پشاور کا ایک لاکھ ایکڑ سے
زیادہ رقبہ لہلہاتے کھیتوں سے ڈھک جائے گا۔

وارسک کا منصوبہ کولمبو پلان کے ماتحت تیار کیا گیا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے کناڈا نے پاکستان
مدد دینے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ابتدائی تجویز کے مطابق اس منصوبے پر سنہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں کام شروع ہونا چاہیے
مگر ابتدائی انتظامات میں تاخیر کے باعث اس پر سنہ ۱۹۵۶ء میں کام شروع ہو سکا۔ منصوبے کی تکمیل حکومت
پاکستان اور حکومت کناڈا کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ کناڈا اس کام پر کم و بیش پانچ کروڑ ڈالر کی رقم صرف

کرے گا۔ یہ مدد مشینوں اور ساز و سامان کی بہم رسانی اور فنی ماہرین کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے
اس وقت کناڈا کے کوئی ۷۵ فنی ماہر اور انجینئر وارسک میں کام کر رہے ہیں منصوبے کی تعمیر کا کام
کناڈا کے دو مشہور تعمیری کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے جن کو نیاگرا آبشار کے متعلق وسیع تجربہ حاصل ہے اور جنھوں
نے اس سے پہلے کناڈا میں بہت سا تعمیری کام کیا ہے۔ کناڈا کے انجینیروں اور ماہروں کی مدد کے لیے کوئی آٹھ ہزار
پاکستانی کام کر رہے ہیں۔ ان میں انجینیئر بھی شامل ہیں۔ کاریگر بھی اور معمولی مزدور بھی۔ ان میں سے سات ہزار
افراد پشتو بولنے والے ہیں۔ اور باقی ایک ہزار دوسرے پاکستانی۔

وارسک کے منصوبے نے نہ صرف قبائلیوں اور پٹھانوں کے لیے باعزت روزگار کا ایک راستہ کھول رکھا
ہے بلکہ یہ انھیں جدید قسم کی فنی تربیت دینے کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے۔ جو لوگ ڈیڑھ پونے دو روپے روزانہ پر
عام مزدوروں کی طرح بھرتی ہوئے ہیں وہ فنی کام سیکھتے سیکھتے ترقی کرتے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں
جہاں اس قسم کے مزدوروں نے سال کے اندر اندر دس روپے روزانہ تک ترقی کر لی۔

دریائے کابل سندھ کا ایک معاون ہے۔ افغانستان کے پہاڑوں سے نکل کر افغانستان کے پایۂ تخت
کابل کے بیچ میں سے بہتا ہوا مشرق کا سفر جاری رکھتا ہے۔ کابل میں اس کی حیثیت ایک معمولی سی ندی کی ہے،
راستے میں دونوں طرف سے پہاڑی ندیاں اس میں آ آ کر شامل ہوتی جاتی ہیں۔ تاہم اس سے اس کی
حیثیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ مگر افغان سرحد (ڈیونڈ لائن) سے کچھ میل اوپر کابل میں چند
اور ندیاں آن ملتی ہیں اور اس طرح دریائے کابل صحیح معنوں میں ایک دریا بن جاتا ہے۔ وارسک
کے مقام پر یہ دریا اپنی پہاڑی گھاٹی چھوڑ کر میدان میں داخل ہوتا ہے اور مشرق کی طرف بہتا ہوا کوئی
سو میل آگے اٹک کے مقام پر دریائے سندھ میں جا ملتا ہے۔

ان گنت صدیوں سے دریائے کابل کا پانی خیبر ایجنسی اور ضلع پشاور کے زیر قدم بہتا چلا آیا ہے،
ان علاقوں کو اس پانی سے کوئی قابل ذکر فائدہ حاصل کرنے کا ڈھنگ معلوم نہ ہو سکا۔ ان علاقوں کی
بسی ہوئی وادیاں اپنے اندر زرخیزی کی ساری صلاحیتیں رکھتی تھیں۔ مگر ابدی تشنگی کے سبب ان کی
بڑی بروئے کار نہ آنے پائی۔ جدید سائنس نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ نظام قدرت میں

رد و بدل کر کے اس کی کوتاہیوں کا علاج کر لے۔ مگر پاکستانیوں کو ابھی سائنس پر اس قدر قابو حاصل
تاریخ کے بعض دل چسپ اتفاقات کے باعث آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں پسماندہ قوموں کی نمو
دست گیری کرنے پر مجبور رہیں۔ اس اتفاق حسنہ کے طفیل کناڈا پاکستان کو مدد دینے پر مجبور ہ
دریائے کابل کا پانی جو صدیوں سے بے کار بہہ رہا تھا پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے رام کیا جا
اس وقت وارسک سے چند میل اوپر دریائے کابل کی تنگ چٹانی دیواروں کے درمیان
اور بجری سے ایک پتھر کا سخت بند تیار کیا جا رہا ہے۔ مکمل ہو جانے پر اس بند کی اونچائی ۲۵۰
ہو گی اور لمبائی ۷۵۰ فٹ۔ اس طرح بند سے لے کر افغان سرحد تک کی گہری گھاٹی جس کی
۲۶ میل سے کم نہیں ایک جھیل میں تبدیل ہو جائے گی۔ بند کی بلندی اتنی رکھی گئی ہے کہ افغ
سرحد سے آگے دریا کی گہرائی میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ بند کے منہ پر دریا کی دائیں جانب
پہاڑی کے پہلو میں بارود کی مدد سے دو سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک سوراخ جس کی ل
۶۰۰ فٹ اور قطر ۳۹ فٹ ہے پن بجلی تیار کرنے کے لیے پانی مہیا کرے گا۔ یہ پانی ۱۸ فٹ قطر کی
آہنی نالیوں میں سے گرتا ہوا بجلی پیدا کرنے والے چھے پہیوں کو حرکت دے گا۔ ان میں سے ہ
چالیس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرے گی۔ شروع شروع میں صرف چار مشینیں چالو کی جائیں گ
باقی دو بھی کام کرنے لگیں گی۔ اس طرح وارسک کی پن بجلی دو لاکھ چالیس ہزار کلوواٹ ر
پہنچ جائے گی۔

مالاکنڈ، درگئی اور رسول کے پن بجلی اسٹیشن اس وقت مل کر جس قدر قوت پیدا کر رہے
وارسک اکیلا ان تینوں کی مجموعی قوت سے دو چند قوت پیدا کرے گا۔ اس سے مغربی پاکستان
سستی برقی قوت کی جو فراوانی ہو گی اور اس سے زراعت اور صنعت میں جو خدمت لی جا سکے گ
اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

برقی قوت پیدا کرنے والی سات سو فٹ لمبی سرنگ کے پہلو میں ایک اور سرنگ
جا رہی ہے جو آب پاشی کے لیے پانی لے جائے گی۔ یہ سرنگ جس کا قطر صرف دس فٹ

ساڑھے تین میل لمبی ہوگی۔ اس سرنگ کی کھدائی ملاگھوڑی کی پہاڑی کے دونوں پہلوؤں سے شروع ہے
اور دونوں طرف سے کوئی میل میل بھر کھدائی مکمل ہو چکی ہے۔ اس سرنگ میں سے دوڑنے والا پانی آگے
ایک اونچی نہر میں گرے گا تاکہ خیبر ایجنسی کی بلند زمینوں اور پشاور کے نواح کے خشک علاقوں کو سیراب
کیا جا سکے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس نہر کی بدولت پشاور کے نواح میں زیر کاشت رقبہ دوگنا ہو جائے گا
اور قبائلی علاقوں میں بھی ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح جو نئی فصلیں پیدا ہوں گی ان کی
سالانہ مالیت سترہ کروڑ روپے سے کم نہ ہوگی۔

دریائے کابل میں پانی کی مقدار بہت غیر یقینی رہتی ہے۔ خشک موسم میں اگر پانی کا اخراج
پانچ ہزار کیوسک کی کم از کم سطح کو جا چھوتا ہے تو یہ اخراج چوبیس گھنٹے کے مختصر عرصے میں پچاس گنا
زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دس گھنٹے کے عرصے میں دریا کی سطح بقدر دس فٹ
بلند ہو گئی۔ ایسے غیر یقینی دریا کی گذرگاہ کے آر پار سیمنٹ اور بجری سے بند تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں
تھا۔ چنانچہ گذرگاہ کو خشک کرنے کے لیے مجوزہ بند سے کوئی سو فٹ اوپر بائیں کنارے کی پہاڑی کو چیر کر
اس کے سینے میں ایک سرنگ بنائی گئی ہے جو عام موسم میں دریا کے سارے پانی کو کھینچ کر اسے مجوزہ
بند سے چالیس پچاس فٹ نیچے دوبارہ دریا میں ڈال دیتی ہے۔ برسات میں پانی کی مقدار اتنی
زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس سرنگ کے باوجود پانی بند کی طرف بھی دوڑ آتا ہے۔ بند سیمنٹ اور بجری کی چودہ
بڑی دیواروں پر مشتمل ہوگا۔ پچھلے خشک موسم میں نہ صرف ان سب کی بنیادیں قائم کر دی گئی تھیں بلکہ
پانچ کو چھوڑ کر باقی سب کو اتنا اونچا کر دیا گیا تھا کہ طغیانی کے موسم میں بھی وہ پانی سے باہر رہیں اور ان کی
تعمیر جاری رہے۔ برسات ختم ہو جانے پر ان پانچ دیواروں پر بھی کام شروع ہو جائے گا جو اس وقت
پانی میں ڈوبی پڑی ہیں اور آئندہ جنوری یا فروری تک سیمنٹ اور بجری کی یہ کوہ پیکر دیواریں مکمل ہو
جائیں گی۔ اس کے بعد صرف آہنی پھاٹک لگانے کا کام باقی رہے گا۔ یہ پھاٹک تعداد میں نو ہوں گے۔

وارسک کا منصوبہ سنہ ۱۹۶۰ء تک مکمل ہو جائے گا۔ منصوبے کو تیزی سے ختم کرنے کے لیے
دن رات کام جاری ہے۔ کام کرنے والوں کی تین جماعتیں چوبیس گھنٹوں میں باری باری

کام لیا جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہفتے میں کوئی چھٹی بھی نہیں کی جاتی۔ یہ سب تعجیل اس لیے ہے کہ پاکستان کو وہ فوائد جلد از جلد حاصل ہوں جو اس منصوبے کی تکمیل سے پیدا ہونے والے ہیں۔ منصوبے پر کل ۱۴ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ لیکن اس سے پہلے سال ہی قومی آمدنی میں پچاس کروڑ روپے کا اضافہ ہو جائے گا گویا وارسک کا منصوبہ پہلے سال ہی اپنی ساری لاگت ادا کرکے نفع دکھائے گا۔ اس کے بعد ہر سال خالص نفع ہی نفع ہوگا۔

منصوبے کے آغاز سے پہلے دریائے کابل پہاڑی گھاٹی کی گرفت سے نکلتے ہی وارسک کے نواح میں بے محابا اٹکھیلیاں کرتا ہوا دونوں کناروں پر دور دور تک مار کرنے لگتا تھا۔ برسات کے موسم میں اسے شوخی دکھانے کا خاص موقع ملتا تھا۔ اس موسم میں یہ غصے سے گرجتا ہوا جدھر جی چاہتا نکل جاتا۔ مگر وارسک منصوبے کی آمد نے اس چیز کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ہے۔ منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے اب تک کوئی چار لاکھ مکعب گز چٹانیں کاٹی جا چکی ہیں اور یہ سب کی سب دریائے کابل کے دونوں کناروں پر اس طرح بچھا دی گئی ہیں کہ دونوں طرف چٹانوں کے چوڑے پشتے تیار ہو گئے ہیں۔ ان پشتوں کے درمیان اب دریائے کابل ایسی خاموشی اور حلیم مزاجی سے بہتا ہے گویا شرارت کرنا اس کے خمیر میں داخل ہی نہیں۔

وارسک بند تیار کرنے کے لیے سیمنٹ اور بجری کی ضرورت جس مقدار میں ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اب تک کوئی پونے تین لاکھ مکعب گز سیمنٹ اور بجری استعمال ہو چکی ہے۔ سیمنٹ اور بجری کو اتنی مقدار اور اس تیزی سے تیار کرنا انسانی بس کی بات نہیں۔ چناں چہ یہ کام دیو ہیکل مشینیں انجام دے رہی ہیں۔ مشینیں ریت۔ کنکر اور سیمنٹ کو ملاتی ہیں اور برقی قوت کی مدد سے یہ مسالہ جائے تعمیر پر پہنچ جاتا ہے۔ دریا کی گذرگاہ کے آر پار دونوں پہاڑیوں کی چوٹیوں کے ساتھ ایک آہنی رسّا بندھا ہے اس کے ساتھ ایک آہنی ٹرالی لٹکتی ہے جو سیمنٹ بجری اور ریت کے مرکب کو لاد لاد کر اسے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہے

وارسک بند کی بدولت جہاں پاکستان کی معاشی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی آنیوالی ہے،

وہاں اس کے طفیل اس ملک کا جغرافیہ بھی بدلا جانے والا ہے۔ آئندہ وسط ایشیا کی کوئی فوج دریائے کابل کی وادی کے راستے پاکستان کا رُخ نہیں کر سکے گی کیوں کہ افغان سرحد سے لے کر واسک تک اس کی راہ میں ۲۶ میل لمبی جھیل حائل ہوگی۔ اس جھیل میں مچھلیاں بھی پالی جاسکیں گی اور سیر و تفریح کے لیے کشتی رانی بھی ہو سکے گی۔ اس طرح وہ سنگلاخ پہاڑی دیواریں جن کو دیکھ کر اب وحشت ہوتی ہے ایسے حسین قطعۂ آب میں تبدیل ہو جائے گی جسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کریں گے۔

واسک کا منصوبہ مکمل ہو جانے پر جدید انجینیرنگ کا ایک عمدہ شاہکار رہو گا۔ وہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہوگا کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے جغرافیائی ماحول کو حسب منشا بدلا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں پاکستانی قوم کے لیے عبرت کا ایک ناقابل فراموش سبق ہوگا واسک کا منصوبہ ہمیں ہمیشہ یہ حقیقت یاد دلاتا رہے گا کہ ایک ایسی قوم جو گنتی میں ہماری قوم کا پانچواں حصہ ہے سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت اس قدر قوی ہو سکتی ہے کہ ہماری دست گیری کرے اور ہمیں زرعی اور صنعتی راہ اختیار کرنے میں مدد کرے۔ کولمبو پلان کے ماتحت تیار ہونے والا یہ منصوبہ آزاد قبائل کو خصوصیت سے اس بات کی دعوت فکر دے گا کہ سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں ذاتی شجاعت اور فن سپاہ گری سے زیادہ اہم علوم و فنون کی وہ مہارت ہے جو قدرت کی مہیب ترین قوتوں کو رام کرنا اور ان سے خدمت لینا جانتی ہے۔

بھارت نے پچھلے دنوں دریائے ستلج کا پانی روک کر ہماری معاشی زندگی میں جو بحران پیدا کر دیا تھا اسے دیکھتے ہوئے بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کل کو افغانستان کے ہندوستان نواز حکمران بھی بھارتی صنعت پر عمل شروع کر دیں تو واسک بند کا کیا بنے گا بے شک یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کی طرف سے اطمینان ہونا ضروری ہے۔ افغانستان کے طبعی جغرافیہ پر ایک نگاہ ڈالنے سے فوراً پتہ چلے گا کہ قدرت نے افغانستان کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ واسک بند کو کھیل بنا سکے۔ وہ دریائے کابل کے پانی سے پن بجلی پیدا کر سکتا ہے۔ اس پانی کو نہروں میں

ڈال کر اس سے آب پاشی نہیں کر سکتا۔ اگر بد قسمتی پاکستان کو زچ کرنے کے لیے دریا کا پانی روکنے کی ٹھان لے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ افغان سرزمین کا ایک خاصہ رقبہ سیلاب کی زد میں آ جائے پھر دریائے کابل صرف افغان سرحد کے قریب پہنچ کر ایک دریا کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس سے پہلے اس کی حیثیت ایک پہاڑی ندی کی ہے۔ یہ ساری باتیں اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ افغانستان دا سک بند کے ساتھ کھیل نہیں سکے گا۔

وجود میں آنے کے وقت سے لے کر اب تک پاکستان طرح طرح کے خطروں سے گھرا رہا ہے۔ لیکن با عزم قوموں کے لیے خطرے مہمیز کا کام کیا کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کی حیثیت ایک بہت بڑے نخلستان کی ہے۔ جہاں زندگی کی ساری بہار ان دریاؤں سے ہے جو اس میں بہتے ہیں۔ مگر دنیا کا بہترین نظام آب پاشی رکھنے کے باوجود پاکستان میں ابھی لاکھوں ایکڑ قابل کاشت رقبہ اس لیے بنجر پڑا ہے کہ اسے پانی نہیں ملتا۔ ہندوستانی سینہ زوری کے باعث بہت سے سیراب رقبوں کو بھی یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ وہ دوبارہ خشک صحرا میں تبدیل ہو جائیں بے شک یہ مسائل ہماری معیشت کے بنیادی مسائل ہیں۔ دا سک کے عظیم الشان منصوبے سے اگر ہم بطور قوم کوئی سبق سیکھ سکتے ہیں تو وہ سبق یہ ہے کہ عزم و جستجو کے سامنے طبعی ماحول کی بڑی سے بڑی دشواریاں بھی سر جھکا دیتی ہیں۔ یہ وہ سنہری سبق ہے جس کی مدد سے ہم اپنے مشکل سے مشکل مسائل کے عملی حل تلاش کر سکتے ہیں۔

سبق کے محرمات

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر ۲

سبق کی منصوبہ بندی میں اگر چند امور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے تو چند ایسی باتیں بھی ہیں جن سے احتراز اچھی تدریس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان سے گریز نہ کیا گیا تو یہی سبق کے نقائص بن جاتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ غیر ضروری تفصیلات سے احتراز

پڑھاتے وقت مدرس اپنی تقریر کی رو میں ضروری اور غیر ضروری سب کچھ پڑھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اس قسم کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے جب پڑھانے والے نے سرے سے منصوبہ بندی کی ہی نہ ہو۔ سبق کی تفصیلات ضروری ہیں۔ لیکن یہ تفصیلات موضوع سے متعلق ہوں، ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں نہ ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سبق میں غیر ضروری تفصیلات سے تدریس میں گنجلک اور ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ بات کچھ ہوتی ہے لیکن طلبہ اسے صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے۔ نئے مدرسوں کو اکثر اس قسم کی دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان سے عہدہ برا ہونے کی صورت یہ ہے کہ سبق کے منصوبے میں تفصیلات اس قسم کی درج کی جائیں جو موضوع سے متعلق ہوں اور طلبہ اس سے کماحقہ، فائدہ اٹھا سکیں۔ مثلاً اگر جماعت نہم کے طلبہ کو جملۂ اسمیہ کی ترکیب نحوی پڑھانی ہو تو افعال ناقصہ کی تشریح کر کے صرف اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ جملہ کس طرح بنتا ہے اور اس کی پہچان کیا ہے اور پھر یہ کہ اس کے اجزا کو کس طرح علاحدہ کیا جا سکتا ہے۔ جملۂ فعلیہ کے کسی پہلو پر بحث طلبہ کے ذہنوں کو پراگندہ کر سکتی ہے۔

۲۔ غیر ضروری اجزا سے احتراز

سبق کی منصوبہ بندی میں بعض مدرسین بالخصوص نو مشق اور تازہ وارد ایک ... مثلاً ایک فہرست ... کہ

سبق کو بے شمار حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ تدریس مشق کے زمانے میں ایک متعلم مدرس کی تدریس اور اشارات سبق دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ سبق کے ضروری اجزا کی ترتیب اس طرح کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تدریس اور سبق کی منصوبہ بندی میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ایک صفحے پر تین چار غیر مربوط سے جملے ۱، ۲، ۳ کے تحت جلی حروف میں لکھے ہوتے اور بس اس پر مستزاد تدریس اتنی روکھی پھیکی کہ مدرس تختے پر کچھ لکھ رہا ہے اور بچے اپنے مشاغل میں مصروف بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مدرس کو یہی یاد نہ رہا کہ اس کے آگے اسے کیا پڑھانا ہے

اس قسم کی منصوبہ بندی سے اشاراتِ سبق کا نہ تیار کرنا بہتر ہے۔ سبق کے چند اجزا کے ماتحت دو تین غیر مربوط جملوں میں تیار کر لینا اتنا ہی مضرت رساں ہے جتنا اس کے بے شمار اجزا کر کے بے جا تفصیل کا رنگ بھرنا ہے۔ سبق کے اشارے مختصر مگر جزوی لحاظ سے مفصل ہوں۔ یہ نہیں کہ صرف یہ لکھ دیا گیا ہو۔

بابر

(۱) بابر۔ فرغانہ ۔ ابتدائی مشکلات

(۲) کابل ۔۔ ہندوستان کی فتح

(۳) ہندوستان میں لڑائیاں ——— اس کی موت

اس سے نہ تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مدرس کیا پڑھانا چاہتا ہے اور کس طرح پڑھانا چاہتا ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بابر کی شخصیت کے کن پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سبق کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ (ا) بابر کی ابتدائی مشکلات اور حصول تخت کے لیے جد و جہد۔ (ب) ہندوستان پر حملے۔ پانی پت، کنواہا اور گھاگھرا کی لڑائیاں (ج) بابر کی شخصیت اور ہر جزو کے تحت اس کی ضروری تفصیلات اس طرح لکھی جائیں کہ بابر کی شخصیت کا ہر پہلو نمایاں ہو جائے۔

کہنہ مشق مدرس ممکن ہے ان تفصیلات کے بغیر بھی اپنی پرانی معلومات اور تجربے کی بنا پر سبق میں دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن نو مشق مدرس کے لیے مشکل ہے کہ مفصل نوٹ لکھے بغیر سبق کو عمدگی سے پڑھا سکے۔

۳- یکسانیت سے احتراز

سبق کی کامیابی کا سب سے بڑا راز طلبہ کو سبق پڑھنے کے لیے آمادہ کرنا ہے۔ طلبہ کے جذبۂ تعلیم
و تحریک میں لانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جائیں تو اس سے ان کی دلچسپی بھی قائم رہتی
ہے اور طلب و جستجو کی خواہش بھی کام کرتی رہتی ہے۔ اگر ہر مرحلے پر کچھ نئی باتوں کے معلوم ہونے کی توقع
ائم رہے تو تدریس کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اب کیا ہوگا اس کے بعد کیا ہوگا۔ منصوبہ بندی اس قسم کی ہو
۔ یہ آرزو طلبہ کو مسلسل بے تاب کرتی رہے۔ یکسانیت جذبات کو متحرک کرنے کی بجائے منجمد بنا دیتی ہے
دروہ ذوق و شوق جو تعلم کے لیے ضروری ہے اس میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس سے عمداً
حتراز کرنا ضروری ہے۔

۴- نصابی کتابوں کی بے جا متابعت سے احتراز

ہمارے ملک میں عموماً سبق پڑھاتے وقت یا اشاراتِ سبق تیار کرتے وقت مدرسین کے ذہنوں پر
صابی کتابیں سوار رہتی ہیں۔ یہ بات جو اس کتاب میں درج ہے صحیح ہوگی، اس لیے کہ یہ کتاب منظور شدہ
ہے اور اس پر ایک مقتدر مدرس کا نام لکھا ہے۔ اس طرح کتاب کا منظور شدہ ہونا، اور کسی جانے پہچانے
یس کا نام لکھا ہونا، اس کی صحت کی سند ہے۔ اگرچہ کتابوں کے سلسلے میں یہ کہہ دینا کہ یہ بات حتمی اور
ری ہے کسی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں۔ ممکن ہے ایک بات جو اس کتاب میں بیان کی گئی ہے بعد کی
میقات نے اسے باطل قرار دے دیا ہو۔ یا اس میں مزید تحقیقات کی گنجائش ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے
طباعت کی غلطی کی وجہ سے کسی بیان میں ابہام پیدا ہو گیا ہو۔ اب اگر ان خدشات کے باوصف نصابی
اب کو حرفِ آخر سمجھ لیا جائے تو یہ بہت بڑی بھول ہوگی۔

ایک سمجھدار مدرس نصابی کتاب کے مندرجات کو من و عن قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ اس کا مواد
یب مضمون، اور صحت بیان یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر اس کی نگاہ ہوگی، اور جب یہ چیزیں اس کے
ار تنقید پر پوری اتریں گی تو وہ اسے تسلیم کرے گا ورنہ دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرے گا۔ اور
میں سے اپنے کام کی باتیں نکال کر طلبہ کے سامنے واقعے کی نیم بریدہ اور مسخ شدہ تصویر نہیں،

بلکہ مکمل اور خوب صورت تصویر پیش کرے گا کہ اس کے پڑھانے میں مدرس کو بھی لطف آئے طلبہ بھی اس کی لذت کو محسوس کرسکیں۔

۵۔ حوصلہ مند منصوبے سے احتراز

سبق کو اس نہج پر پڑھانا کہ اس کے ضروری پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہو جائے، اچھی تد کی نشانی ہے۔ لیکن ایک وقت میں اتنا کچھ پڑھا دینے کی کوشش کرنا جسے طالب علم آسانی سے سمجھ سکے یا جو اس کی ذہنی ترقی میں اس کی اعانت نہ کر سکے، سعی بے جا ہوگی۔ تعلم کی رفتار سست مگر مستقل ہوتی ہے۔ قطرہ قطرہ۔ جرعہ جرعہ اس طرح آگے بڑھنا چاہیے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ تیزی سب کچھ برباد کر دیتی ہے۔ ان خطرات سے بچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سبق کی منصوبہ میں یہ خیال رکھا جائے کہ اس مختصر سے وقفے میں جو کچھ پڑھایا جائے گا اس کی تفہیم میں طلبہ کو د نہ ہوگی اور وہ مستعدی کے ساتھ آگے بڑھتے جائیں گے، بہتر ہوگا کہ تھوڑا پڑھایا جائے لیکن ا انداز میں کہ جو کچھ پڑھایا گیا ہے اس سے طلبہ نے واقعی فائدہ اٹھایا ہے۔

منصوبے کا صحیح استعمال

۱۔ منصوبہ ایک رہ نما ہے

مدرس کے لیے سبق کے منصوبے کی حیثیت رہ نما کی ہوتی ہے۔ جو اشارات لکھے گئے انھیں کے تا سبق پڑھانا ہے اور چوں کہ یہ تجویز کار ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق عمل میں آئی ہے، اس۔ اسے بروئے کار لانے میں قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اگر منصوبے کی حیثیت اس سے کچھ قرار دے دی گئی اور ہم نے اسے اس بوڑھے کی بیساکھی کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا جو ا اعانت کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتا تو سبق کی رفتار میں ایک ایسا جھٹکا لگے گا کہ یہ بھی صرف ٹھکیا ہوا آگے بڑھے گا۔ اس قسم کی غلطی کا احتمال بالعموم نئے مدرسین کے لیے زیادہ ہوتا ہے۔

پڑھانے وقت حالات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ مدرس کو اپنے سبق سے ہٹ کر عارضی طور پر کسی اور بات کی جانب رجوع کرنا پڑے، یا مم

طلبہ کی دل چسپی قائم رکھنے کے لیے کوئی ایسی بات کہنی پڑے جس کا سبق سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو یا کوئی طالب ایسا سوال پوچھ لے جس کا اگرچہ نفس مضمون سے اتنا تعلق تو نہ ہو، لیکن اس کی جستجو طلب طبیعت کے اطمینان کے لیے اس کی تشریح ضروری ہے۔ مدرس کو اس کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور ایسے حالات میں اگر سبق کے منصوبے سے قدرے انحراف کرنا پڑا تو اس پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی۔

اس قسم کی رہ نمائی کی شروع میں ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب طبیعت میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور مدرس اعتماد و ایقان کے ساتھ سبق پڑھانے لگتا ہے تو وہ اپنے اشاروں پر صرف اس قدر تکیہ کرتا ہے کہ اپنے موضوع سے بھٹکنے نہ پائے۔ ممکن ہے اسے اپنے متعینہ منصوبے میں تھوڑی بہت ترمیم کی ضرورت پیش آ جائے۔ اور حسب ضرورت وہ اس میں ترمیم کر لیتا ہے۔ اگر مدرس منصوبے کی متابعت کا خوگر ہو گیا تو اس کے سبق میں تدریس کی لذت ممکن نہیں اور یہ متابعت اسی وقت دور ہو سکتی ہے جب پڑھانے والا مستعد ہو اور موقع و محل کے اعتبار سے اپنے سبق میں ضروری ترمیم و اضافے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ یہ ترمیم اس سرعت سے ہوتی ہے یا اس میں ایسی برق رفتاری کی ضرورت ہے کہ سبق کی روانی میں فرق نہ آنے پائے۔

ہم بعض اوقات عادتاً آزادی یا متابعت کے خوگر بن جاتے ہیں۔ افراط اور تفریط دونوں نامناسب ہیں۔ تدریس میں عادت ایسی ڈالنی چاہیے جو حالات سے مطابقت پیدا کر سکے۔ یہ سوچ سکے کہ اب اسے کیا کرنا ہے اور اسے کس طرح نبھانا ہے۔

۲۔ منصوبے میں ترقی کی گنجائش نہ ہو

متوقع حالات کے تابع سبق کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ نویں جماعت ہے شہری بچے ہیں۔ ان کی عمر تیرہ اور چودہ کے بین بین ہے، ان کے تعلیمی تقاضوں کے مطابق سبق کا منصوبہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر منصوبے کو حرف آخر سمجھ لیا جائے تو یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔ منصوبے میں ترقی و توسیع کی گنجائش کا ہونا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مدرس مسلسل کئی سال تک ایک کلاس میں ایک سبق پڑھاتا رہتا ہے۔ اس کلاس کے طلبہ بھی ہر سال تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سبق کے

منصوبے پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے جو مواد پچھلے سال جمع کیا گیا ہے وہ اس سال کے لیے صحیح نہ ہو یا اور ادھر ادھر ترمیم و اضافے کی ضرورت پیش آئے۔ وقت کے تقاضوں متابعت کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک مدرس نے ایک سبق میں اپنے موضوع کی توضیح کے لیے برطانیہ کی برتری کی مثال پیش کی اور زبان کے چٹخارے لے لے کر اسے اس طرح بیان کیا گویا یہ زمانہ برطانیہ کی سیاسی سیادت اور صنعتی تفوق کا نصف النہار ہے۔ اس مدرس کی نگاہیں وقت کے بدلتے ہوئے نہ دیکھ سکیں اور نہ اس میں اتنی حق شناسی کہ یہ سمجھ سکے کہ انگریز کی سیاست مفلوج ہو چکی ہے۔ دولت کی ہوس اور حصول آسائش اور صدیوں کی سیاسی بازی گری نے اسے حالات سے اندھا بنا دیا ہے اور اب وہ یو۔ایس اے کی اعانت کے بغیر دو قدم نہیں چل سکتا۔

میں نے ان سے گذارش کی، وقت بدل چکا ہے۔ انگریز اس سرزمین سے رخصت ہو چکا ہے اس کی سیاست کو گھن لگ چکا ہے، اب یہ قصۂ پارینہ ہے، اسے چھوڑیے اور کوئی ایسی مثال دیجیے جو اس عہد کی علم بردار ہو۔۔۔۔۔ مدرس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ انھیں یہ بات بڑی ناگوار معلوم ہوئی اور بالکل اس طرح جیسے اللہ یار بیگ اپنے بیٹے سے یہ کہتا تھا "گرتو نادر شاہ را ندانی"۔ میرے کانوں میں کچھ اس قسم کی آواز گونجنے لگی۔

مگر تم انگریز کو نہیں جانتے

۳۔ حالات سے مطابقت

اس موضوع پر مختلف ضمنی عنوانات کے تحت بحث ہو چکی ہے۔ منصوبے کی قطعی متابعت ممکن نہیں۔ اس سے انحراف لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ خواہ طلبہ کے سوالات ہوں یا ان کی عدم تفہیم ہو یا خود مدرس کا وجدان ہو سبق میں اس کی گنجائش ضروری ہے۔ عدم گنجائش کی صورت میں غیر متوقع حالات سے عہدہ برا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے آزادی فکر کے ساتھ ساتھ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی اہلیت کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس آزادی سے مراد بے راہ روی نہیں ہے کہ بھٹکتے بھٹکتے کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ اس میں احتیاط، میانہ روی اور اعتدال کی ضرورت ہے جس کا پرکھنا اور اپنے لیے ایک راہ متعین کرنا

مدرس کا اپنا فرض ہے۔

۴ - انفرادی تقاضے

نفسیاتی لحاظ سے دو طالب علموں کی ذہنی افتاد اور ان کا ردعمل ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اختلافات ناگزیر ہیں۔ بالعموم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ سبق کی تدریس کے بعد طلبہ کا ردِّ عمل تقریباً ایک جیسا ہوگا۔ اور اس مفروضے کے پیش نظر سبق کا منصوبہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود طلبہ کے انفرادی تقاضوں کی متابعت بھی ضروری ہے۔ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کی ضروریات کیا ہیں؟ تدریس کے منصوبے کے اس پہلو کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سبق کا ایک ایک نکتہ تحریر میں نہ آیا ہو، بلکہ بعض غیر مکمل حصوں کی تکمیل کی ضرورت باقی ہو۔

ہر لڑکے کا مزاج مختلف، سوچنے کا انداز جدا، اور چیزوں کے ماننے یا نہ ماننے کی اہلیت کا معیار بھی ایک نہیں۔ اس اختلاف کے پیش نظر ان انفرادی تقاضوں کو پورا کرنا پڑھانے والے کا فرض ہے۔

۵ - معینہ وقت

سبق کی تدریس کا وقت مقرر ہوتا ہے اور اس مقررہ وقت سے زیادہ وقت ملنا بھی ممکن نہیں کہ مدرسے کے وقت نامے میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ سبق کا منصوبہ ایک پیریڈ کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس مقررہ وقت میں منصوبے کی تکمیل ہو جائے۔ مگر بعض اوقات کلاس کے غیر متوقع حالات کے پیش نظر اس کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے غیر متوقع حالات میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس کی تعیین آسان نہیں۔ اور بالفرض اس کے تعیین کی کوشش کی جائے تو غالباً اس کے ناپنے کے لیے ریاضی کا کوئی اصول ہماری رہنمائی نہیں کر سکے گا۔ اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ ایک محنتی مدرس مستقل ریاضت اور پڑتال کے بعد ایک اندازہ لگا لے کہ ان حالات میں ایک سبق کی تدریس میں کتنا وقت صرف ہوگا اور اس اندازے کو اپنی منصوبہ بندی کی اساس بنا لے۔

کمزور طلباء کی تدریس

محمد حسین

خالق کائنات نے تمام انسانوں کو برابر آزادی اور مساوات پر پیدا کیا ہے۔ یہ حقیقت قانون کی رو
سے بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ لیکن حیاتیات اور نفسیات کی یہ ایک واضح اور تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ سب ذ
ایک ہی سانچے میں ڈھالے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ جسمانی دماغی اور ذہنی طور پر ان میں زمین و آسمان کا
پایا جاتا ہے۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو پنگوڑے میں ہی اپنی ذہانت کے کرشمے دکھانا شروع کر دیتے ہیں جو
کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں جو بالغ ہونے پر بھی بدھو ہی رہتے ہیں۔ تیسری قسم ان دونوں کے بین بین
ہے۔ ان کو متوسط کہا جاتا ہے۔ جماعت میں معلم کو ان تینوں قسم کے طلبا سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن
ذہنی طور پر پسماندہ طلبا کو وہ اکثر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ان کی تعلیم کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کا ملا
ازبس ضروری ہے۔

اس قسم کے طلبا ہر سکول میں پائے جاتے ہیں، خواہ وہ سکول ابتدائی ہو یا ثانوی۔ دیہاتی یا ش
منظور شدہ یا غیر منظور شدہ۔ پیشہ ورانہ یا غیر پیشہ ورانہ۔ اقامتی یا شبینہ غرضیکہ ان کی بنیادی تعل
ضروریات ایک جیسی ہیں اور طلبا اپنی محدود صلاحیتوں کے پیش نظر معلم کے ہمدردانہ سلوک کے ہم
ہوتے ہیں۔

ذہنی پسماندگان کی تعریف

ذہنی طور پر پسماندہ وہ بچے ہوتے ہیں جو پست ذہنی قویٰ کی وجہ سے مقرر کردہ معیار کی باقا
جماعتوں میں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ ان میں کسی چیز یا مسئلے کو سمجھنے کی صلاحیت ت
مفقود نہیں ہوتی، بلکہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے ذہنی قویٰ کا عمل بہت سست ہوتا ہے
ذہنی قویٰ زنگ آلود ہوتے ہیں۔ وہ معلم کی مشفقانہ کوششوں اور خاص توجہ کے مستحق ہوتے ہیں ا
یہ فرض عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہنی طور پر پسماندہ شاگردوں کے قویٰ کو اس دلجوئی سے صیقل

جہاں اُس کا شاگرد افق آسمان پر ستارہ بن کے چمکے وہاں اس کی اپنی روح کو بھی تسکین حاصل ہو۔

ذہنی پسماندگان کی پہچان

یوں تو ذہنی پسماندگان کی تعریف اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ معلم ان کو کس طرح پہچان سکتے ہیں اور یہ کام ان کے لیے کوئی زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ دوران تدریس وہ ان کو "پھسڈی" ، "کام چور" جیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ جو سکول میں معلم ہوم ورک کے لیے دیا ہوا کام کر کے نہیں آتے۔ معلم سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ ان میں شرمیلا پن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ناقابل اور ناکارہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی ذہانت نہیں ہوتی۔ اور اکثر و بیشتر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ معلم کے بار بار پرسش کرنے پر ندامت سے چہرہ پسینہ آلود ہو جاتا ہے۔ ایک نامعلوم قسم کا خوف ان کے دلوں پر قبضہ جمائے رہتا ہے۔

مختلف ملکوں کے بچوں میں ذہنی برتری

یورو پین ممالک اور امریکہ میں ایسے طلبا کی تعداد کوئی دو فی صد کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی شماریاتی جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ پھر بھی ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ تناسب دس فی صد سے کسی طرح کم نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں ذہنی پسماندگی کی اتنی بڑی نسبت کیوں ہے؟ کیا ہمارے ملک کے بچے دوسرے ممالک کے بچوں سے ذہنی طور پر کمزور رہیں؟ یقیناً اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ تمام ممالک کے بچے یکساں قسم کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ہمارے بچوں میں ذہنی پسماندگی زیادہ پائی جاتی ہے

ا۔ یورپ کے تمام ممالک میں ہر ملک کا اپنا ایک مربوط تعلیمی نظام رائج ہے جو وہاں کے ماحول کے مطابق طلبا کی صحیح نشوونمائی اور نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں انگریزی دور حکومت کا بنایا نظام تعلیم چل رہا ہے اور ہمارے طلبا کی صحیح نشوونمائی تو در کنار ان کی نشوونما کو بھی روکتا ہے۔ بچوں میں تجسس اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں ناکام رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اچھے سائنس دان ریاضی دان اور موجد بہت کم کم پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) یورپین ممالک کے سکولوں میں پرائمری اور مڈل تک طلباء پر اسی قدر تعلیمی بوجھ ڈالا جاتا ہے جس قدر وہ بخوبی اٹھانے کے قابل ہوں۔ کھیل ہی کھیل میں تعلیم دے کر ان کی بنیاد پختہ کر دی جاتی ہے اور دماغ پر کم سے کم بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ ہائی سکول اور کالج میں جا کر ان کے کام کا تناسب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ابتدائی جماعتوں میں طلبا کو کتابوں کا ایک انبار اٹھانا پڑتا ہے۔ شروع میں ان کی قابلیت یورپین ممالک کے طلبا کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن بنیاد خام رہ جاتی ہے کہ رٹنے کے سبب سے امتحان کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ جب وہ ہائی سکول یا کالج میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی ترقی کا تناسب خوفناک حد تک کم ہو جاتا ہے۔ جس کا اندازہ اوپر دیے ہوئے گراف سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

پرائمری تعلیم — ثانوی تعلیم — کالج کی تعلیم — مزید اونچی تعلیم

(۳) یورپین ممالک کے سکولوں میں طلبا کو معلم کی انفرادی توجہ حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جماعتوں میں کثیر تعداد کے پیش نظر معلم ذہنی طور پر پسماندہ طلبا کی طرف توجہ نہیں دے سکتا جس کے وہ مستحق ہیں۔

(۴) یورپین ممالک و امریکہ میں جدید طریقہ ہائے تعلیم سے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اسی پرانے اور فرسودہ (رٹنے کے طریقے) سے تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں ذہنی طور پر پسماندہ طلباء کا تناسب بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں چونکہ تمام تر سہولتیں موجود ہیں۔ بلکہ اس حد تک بھی انتظام کیا گیا ہے کہ جو طلبا آسانی کے ساتھ کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے ان کے

اس قسم کے سامان ایجاد کیے گئے ہیں جو ان کے ذہنی قویٰ کو متاثر کر کے انھیں مسائل کے سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی سامان نہ تو ایجاد کیا گیا ہے اور نہ ہی مہیا کیا جاتا ہے۔

(۵) ترقی یافتہ ممالک میں بہت سے سالوں سے طلبا کا سائنسی اور نفسیاتی طریقوں سے مطالعہ کیا جاتا رہا ہے اور ان سے حاصل کردہ نتائج کی روشنی میں وہ اپنے نظام تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کے جائزے اور مطالعے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

پس طلبا خواہ پاکستان کے ہوں یا انگلستان کے دونوں کی ذہنی سطح ایک ہی ہوتی ہے۔ البتہ ان کی خفیہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اجاگر کرنے والا ساز و سامان اور ماحول جس ملک کا بہتر ہوگا اسی ملک کے بچوں میں ذہنی پسماندگی کی نسبت بھی کم ہوگی۔

ذہنی پسماندہ بچوں کی صلاحیتیں

سب بچوں میں چیزوں، اشاروں اور مقرون نشانوں کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ذہین طلبا تو فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں متوسط طلبا کچھ سوچ بچار کے بعد اور ذہنی طور پر پسماندہ طالب علم معلم کی مدد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ دراصل ان کی راہ میں جسمانی صحت کی کمزوری اور ناموافق ماحول جیسی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں جن کے دور کرنے سے ان کی ذہنی پسماندگی کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کا بچہ سولہ سال کی عمر تک سکول میں پڑھائے جانے والے مضامین کی کچھ نہ کچھ سمجھ رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی تعلیم کو اس کی زندگی کا مقصد قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ کہیں زیادہ مناسب ہوگا اگر اس کی توجہ اُن فعالیتوں کی طرف منعطف کرائی جائے جو آنے والی زندگی میں اس کی معاون و مددگار ثابت ہوں۔ ذہنی طور پر پسماندہ بچے اور نوجوان زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی کم مائگی کا اظہار نہیں کرتے۔ ان میں سے بیشتر سامان، ٹھوس چیزوں اشاروں اور مثالوں کی مدد سے کام سیکھنے کی بہتر استعداد رکھتے ہیں۔ پس ذہنی پسماندہ طلبا کی تعلیم دو چیزوں کی حاصل ہونی چاہیے۔

(۱) دماغی طور پر کمزور طلبا ٹھوس چیزوں اور ساز و سامان کی مدد سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے کام سرانجام دینا سکھایا جائے۔ بجائے اس کے کہ ان کو الفاظوں کے حسین چکر میں پھنسایا جائے۔

(۲) اشاروں اور معقول مثالوں سے وہ بطور گروہ یا جماعت اتنا ہی سیکھ سکتے ہیں جتنا ان کی ذہنی عمر ظاہر کرتی ہے۔ یا جو متوسط بچے اس عمر تک حاصل کرتے ہیں۔

ذہنی طور پر پسماندہ بچوں میں بھی تحریک کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ ان کے بھی احساسات ہوتے ہیں جو کہ عام انسان کے احساسات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ بھی دوسروں کی طرح سوچ سکتے ہیں۔ ان کی خواہشات کو پورا کرنے پر وہ خوش ہونا بھی جانتے ہیں۔ اپنی کئی خواہشوں کی عدم تکمیل کی صورت میں ناراض اور رنجیدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ غرضیکہ عام انسانوں میں پائے جانے والے تمام محسوسات اور محرکات ان میں موجود ہوتے ہیں۔

ہم ان سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں

ہم ان سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ سکول میں اپنے سے بہتر طلباء کا مقابلہ کر سکیں گے۔ لیکن اس کے باوجود جب انھیں ان کی صلاحیت سے کہیں زیادہ مشکل کام جسے وہ نہ سمجھ سکتے ہوں اور نہ کر سکتے ہوں دے دیا جاتا ہے اور پھر اکثر اوقات جماعت بندی کے وقت ان کے کام کا جائزہ لیے بغیر ان کو اگلے درجے میں ترقی دے دی جاتی ہے۔ اس طرح نہ تو ان کی اپنی تسلی ہوتی ہے اور نہ ان کے اساتذہ کی۔ پھر ڈر کے مارے کلاس سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں، جس سے سکول کا نظم و ضبط خراب ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب معلم بغیر سوچے سمجھے طالب علم کو اس کی استعداد سے کہیں زیادہ کام دے دیتا ہے۔ اس سے طلباء کی صحیح قسم کی رہنمائی کی مدد سے اور ایک اچھا نصاب مقرر کر کے معاشرے کے لیے ایک اچھا شہری بنانے میں مدد کی جا سکتی ہے۔

ان کی تعلیم کا مقصد

ذہنی طور پر پسماندہ طلباء کی تعلیم کا مقصد کسی طرح بھی عام طلباء کی تعلیم کے مقصد سے مختلف نہیں جو یہ ہے کہ ہر بچے کو یہ سکھایا جائے کہ بہتر زندگی کیسے گذاری جاتی ہے۔ اس کو اس کی تمام صلاحیتوں کو زندگی کی جدوجہد میں بہتر طریقے سے بروئے کار لانا سکھانا چاہیے۔ اور سماجی طور پر سوسائٹی کا مفید اور کارآمد ممبر ہونا سکھایا جائے۔ سماجی گروہ جس کا وہ رکن ہے وسیع نظروں میں تو تمام معاشرہ بھی ہو سکتا ہے اور محدود معنوں میں اس کا اپنا سکول بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں ساری توجہ اس طرف مبذول ہونی چاہیے

کہ جس ماحول میں وہ رہتا ہے اس کا بہتر اور مفید ممبر ہو سکے۔

عام مدعا

مندرجہ بالا مقصد کے تحت ذہنی طور پر پسماندہ طلبا کی تعلیم کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ اس سے مفید نتائج برآمد ہوں۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہم نصاب ترتیب دیں تو ان کا خاص خیال رکھیں۔ ان نتائج کا زیادہ تر انحصار ان کی علمی مجالس میں شرکت، پیشہ ورانہ زندگی، سماجی اور معاشی تعلقات اور فالتو وقت کو صحیح طریقے پر صرف کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔

معلم کی مشکلات

تمام بچوں کو ان کی صلاحیتوں، خامیوں اور دلچسپیوں کے پیش نظر زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ایک بڑا ہی عزم ہے۔ ذہنی طور پر پسماندہ طلباء کے سلسلے میں تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے، کیوں کہ اوسط طلباء کے مقابلے میں ان کی استعداد اور دلچسپیاں کم اور خامیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ معلم کو اس وقت بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ جب اس کا کوئی شاگرد ایک ایسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرنا شروع کرتا ہے جس میں اس نے پہلے کبھی رتی برابر بھی دلچسپی نہ لی ہو اور جو اس کے سمجھنے کی استعداد سے باہر ہو۔ یہ معلم کے لیے بھی بے سود ہے کہ اس پر علمیت سے پُر اور پیچیدہ مسائل ٹھونسنے کی کوشش کرے جو اس کی دماغی پہنچ سے باہر ہوں۔ عام تعلیم ہر بچے کو اس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔ اگر وہ سکول کا معیاری کام کرنے میں ناکام رہے تو نصاب میں اس کے لیے ایسی چیزوں اور فعالیتوں کی گنجائش رکھی جائے جو بہتر طریق پر اس کی دلچسپی کا مرکز بن سکے۔

معلم ہر بچے کو کسی حد تک زندگی کی تگ و دو میں حصہ لینے کا سبق بھی دیں، بشرطیکہ بچے کی خامیاں اتنی زیادہ نہ ہوں کہ وہ بالکل ہی دنیا کے کاروبار میں حصہ لینے سے محروم رہ جائے۔ بہر کیف اس کی تمام صلاحیتوں اور دلچسپیوں کو معلوم کیا جائے اور پھر مفید طور پر استعمال میں لایا جائے۔ ایسا کرنے کے لیے معلم تمام بچوں کو سماجی شہری، ثقافتی قدروں کا احساس دلائے، اور ان کی اپنی پہنچ تک ان میں حصہ لینے کی رہنمائی کرے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا، شہری ذمہ داریوں میں ایک دوسرے سے تعاون

گروہی فعالیتوں میں ایک دوسرے کی صحت مندانہ شرکت اور فارغ وقت کو خوش اسلوبی کے ساتھ صرف کرنے کے اوصاف فرد اور معاشرہ دونوں کی بھلائی کے لیے ضروری ہیں۔ ذہنی طور پر پسماندہ طلبا میں ان اوصاف کے علاوہ موسیقی سے رغبت یا جسمانی کسرتوں اور کھیلوں سے دلچسپی بھی بدرجہ غایت موجود ہوتی ہے جنھیں ان شعبوں میں کچھ مقام حاصل ہے۔ وہ سوسائٹی کی گہما گہمی سے بے حد محفوظ ہوتے ہیں۔ اور اکثر سوسائٹی کے لیے بھی باعث لطف ہونے ہوتے ہیں۔ ذہنی پسماندہ بچوں میں فعالیتوں کا ابھارنا اور شوق دلانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ ان کو تعلیم دینا یا اس کو روزگار فراہم کرنے کی کوشش کرنا۔

خاتمہ کلام

اب ہمیں ایک ایسے ذہنی طور پر پسماندہ طالب علم یا طالبہ کا تصور کرنا چاہیے جو عنقریب سکول چھوڑنے والا ہو۔ سکول میں اس کی ضروری ابتدائی تعلیم سے مزین کر دیا گیا ہو تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے خسارے میں نہ رہے۔ وہ حساب کے سوالات بھی حل کر سکتا ہے۔ لکھ سکتا ہے۔ پڑھ سکتا ہے اور ہاتھ سے کچھ دستکاری بھی خرید سکتا ہے۔

بظاہر اس قسم کی تعلیم بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آئندہ زندگی میں پیش آنیوالے مسائل کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو پھر یہ حاصل کردہ تعلیم ان تمام مسائل کے حل کرنے کے لیے ناکافی ہے اس کو ایسی تعلیم ملنی چاہیے جس کے تجربے سے وہ دن بدن ترقی کرے۔ لہٰذا ذہنی طور پر پسماندہ طلبا کو تعلیم دیتے وقت مندرجہ نکات کو مدنظر رکھنا چاہیے (۱) ان کی تعلیم اس بات کی متقاضی ہو کہ وہ اپنی جسمانی صحت کو برقرار رکھ کر اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ سکھ چین اٹھا سکیں (۲) وہ سماجی تعلقات میں خوشی اور آسانی محسوس کر سکیں جس سے وہ اچھے دوست بنانے میں کامیاب ہوں اور سماجی اور شہری قدروں کو پہچان سکیں مثلاً دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنا تعاون کی قدر و قیمت کا جاننا۔ حلال کی روزی کمانے کی خواہش کرنا اور جس ملک کا وہ باشندہ ہو اس کے قانون کا احترام کرنا (۳) اس میں قابلیت پیدا ہو کہ وہ اپنے فارغ وقت کی فعالیتوں کو عقلمندی سے گذارنے کے لیے اچھی تجویز منتخب کر سکے۔ (۴) اس میں یہ وصف بھی ہونا چاہیے کہ وہ خاندان یا پڑوس کو مدد دینے والا فرد ہو۔ وغیرہ یہ وہ ابتدائی اصول ہیں جو اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا

قطب جنوبی پر موسم سرما

ادریس احمد

سائنس کا معجزہ

سائنس نے انسان کو ایسے ایسے کارنامے انجام دینے کے قابل بنا دیا ہے جو صرف چند برس پہلے امکان کی حدود سے خارج سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک حالیہ کارنامہ یہ ہے کہ انسان نے ۱۹۵۷ء کا موسم سرما جنوبی قطب پر گذارا۔ یہ سال بین الاقوامی جغرافیائی طبعی سال تھا۔ مختلف ملکوں کے سائنس دانوں نے اس سال رضاکارانہ طور پر یہ خدمت اپنے ذمہ لی تھی کہ وہ دنیا کے سربستہ جغرافیائی اور طبعی رازوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اس پروگرام کا ایک حصہ یہ تھا کہ سردیوں میں جنوبی قطب کی موسمی کیفیتیں معلوم کی جائیں۔ اگرچہ انسان ایک عرصہ سے قطبین پر پہونچ چکا تھا۔ مگر وہ وہاں گرمیوں میں ہی جاتا رہا تھا جب قطبوں پر چھے مہینے کا لگاتار دن ہوتا تھا۔ اس سال انسان نے قطب جنوبی پر سردیاں گذارنے کا عزم کیا۔ چناں چہ دنیائے سائنس کے اٹھارہ مجاہد اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ لوگ چھے مہینے کے گھٹا ٹوپ اندھیرے۔ ناقابل یقین سردی اور نہ تھمنے والی آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور اس مقابلے میں کامیاب نکلے۔

جنوبی کرے کے موسم ہمارے موسموں سے الٹے ہیں جس وقت ہمارے ہاں سردی کا زمانہ ہوتا ہے اس وقت قطب جنوبی پر چھے مہینے کا دن جاری ہوتا ہے۔ لیکن لگاتار چھے مہینے تک چمکنے کے باوجود سورج اس برفانی بیابان میں زندگی کی بہار پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی ترچھی شعاعیں اس قدر کم درجہ حرارت کی حامل ہوتی ہیں کہ قطب جنوبی کا یخ بستہ چہرہ جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ تاہم گرمی کے اس زمانے میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ نیز سورج کی روشنی نقل و حرکت کا کام آسان بنا دیتی ہے۔ سائنس دانوں کی جماعت یہاں گرمی کے موسم میں ہی پہنچی تھی۔ چھے مہینے کی اس مہلت میں انھوں نے اپنے رہنے کے لیے مکان بنائے۔ سامان تعمیر اور ہر قسم کا سامان رسد پیراشوٹوں کے ذریعہ گرایا گیا۔ ہر قسم کی ضرورتوں کا سامان کر لینے کے بعد اور طرح طرح کے

سائنس دانوں نے لیس ہو کر یہ لوگ موسم سرما کی انتظار کرنے لگے حتی کہ چھ مہینے لمبی رات کا آغاز ہو گیا۔

خوشی کا دن

ستمبر کا مہینہ چڑھنے کے ساتھ ہی طویل رات کے ختم ہونے اور دن کے چڑھنے کا ذکر ہونے لگا تھا۔ اٹھارہ ستمبر کی صبح کو سورج افق کے پردے سے باہر نکلنے والا تھا۔ اس لحاظ سے اٹھارہ ستمبر کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ مگر اس دن نے ایک اور لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔ جب سے سردی کا موسم شروع ہوا تھا، درجہ حرارت نیچے ہی نیچے گرتا چلا گیا تھا۔ چودہ ستمبر کو درجہ حرارت صفر سے ۹۱ درجے نیچے چلا گیا اور ۱۷ ستمبر تک اسی جگہ جا رہا۔ ۱۷ ستمبر کو یہ مزید گرنے لگا حتی کہ شام تک یہ صفر سے ۹۸ درجے نیچے چلا گیا۔ یہ اتار بدستور جاری رہا حتی کہ یہ صفر سے ۱۰۲ درجے نیچے تک گر گیا۔ انسان نے اس سے پہلے کبھی اتنے کم درجہ حرارت کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔

سائنس دانوں نے رہنے کے لیے جو مکان بنائے تھے وہ موسم سرما کی برف باری سے چھت تک برف میں چھپ گئے تھے۔ ان لوگوں نے باہر آنے جانے کے لیے یخ میں سرنگیں کھود رکھی تھیں۔ مکانوں کے پاس ہی ایک بلند گنبد نما مینار موسمی اور طبعی حالات کے مشاہدے کے لیے بنا تھا۔ اس گنبد میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جسے کھول کر سوراخ میں سے ستاروں اور سیاروں کے فوٹو لیے جا سکتے تھے۔ لیکن اس چھوٹی سی کھڑکی کے کھلنے سے بھی کاٹنے والی سرد ہوا کے جھونکے اس طرح اندر داخل ہوتے تھے جیسے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے کسی سوراخ میں سے مکان کے اندر آئیں۔ ان جھونکوں کی کاٹ بالکل وہی احساس پیدا کرتی تھی جو آگ کے شعلے پیدا کرتے ہیں۔

سائنس دانوں کا خیال تھا کہ سرمائی رات میں قطبی آسمان کا چہرہ بالکل نکھرا ہوا رہے گا اور اجرام فلکی کے فوٹو لینا بہت آسان ہو گا۔ لیکن یہ خیال درست ثابت نہ ہوا۔ بسا اوقات زمین و آسمان کے درمیان کثیف آبی بخارات کی ایک چادر تنی رہتی تھی جو اجرام فلکی کے چہرے کو صاف نظر نہ آنے دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ستاروں کی روشنی بعض اوقات یوں ایک سبز فوارے کی شکل اختیار کر لیتی تھی کہ ستارے کا صاف فوٹو لینا ممکن نہ رہتا تھا۔

بلا کی سردی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کے علاوہ قطبی رات کی ایک اور خصوصیت وہ لگاتار جھکڑ اور آندھیاں ہیں جو ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ ان کی شدت کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات ان کی رفتار ۹۰ میل فی گھنٹہ تک جا پہونچتی ہے ان کی اوسط رفتار بھی پندرہ سولہ میل فی گھنٹہ سے کم نہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ سائنس دانوں میں سے کسی کو بھی جب تھوڑی سی دیر کے لیے باہر نکلنا پڑتا تھا تو بدن کو چیرنے والی ٹھنڈی ہوا، اس کا استقبال کرتی تھی۔ جسم کا جو حصہ ننگا ہوتا یہ اس میں یوں سرایت کرتی جیسے ایک تیز سوئی گوشت میں دھنس جاتی ہے۔ اس آفت خیز سردی میں ناک یا دوسرے اعضاء کا سن ہو جانا محض چند سیکنڈوں کی بات تھی۔ یہی حال عام اشیاء کا تھا۔ ان لوگوں نے جو جوتے پہن رکھے تھے وہ ایک خاص طور پر تیار کی گئی ربڑ سے بنے تھے۔ مگر قطبی رات کی دوپہری کی سردی میں یہ جوتے چند قدم چلنے کے بعد منجمد ہو کر یوں اکڑ جاتے تھے، جیسے یہ لوہے کی چادر کے بنے ہوں۔

بہر حال ۱۸ ستمبر کو سورج نکلنے سے کئی گھنٹے پہلے سائنس دانوں کی بستی میں کافی چہل پہل نظر آتی تھی۔ خون منجمد کر دینے والی رات کے چھ مہینے ختم ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر میں سورج نکلا چاہتا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں افق پر سے گذر کر آسمان کے بڑے حصے کو نارنجی رنگ کا لباس پہنائے ہوئے تھیں۔ اس دن کے پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ قطب جنوبی کے جغرافیائی نقطے کا پوری صحت کے ساتھ مقام مقرر کیا جائے سائنس دانوں کی بستی سے یہ مقام صرف آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ رات کے اندھیرے میں یہ لوگ اپنے مکانوں میں بیٹھے طرح طرح کے سائنسی آلوں سے اس نقطے کی تلاش میں لگے رہے تھے اور بالآخر اس تلاش میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مگر زمین کا محور صرف ایک فرضی خط ہے۔ قطب شمالی یا قطب جنوبی پر کوئی میخ باہر نکلی ہوئی نظر نہیں آ سکتی۔ ایک ایسے بڑے کرے پر جس کا محیط ۲۵ ہزار میل ہو ایک چھوٹے سے نقطے کا مقام پوری صحت سے معین کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاہم سائنس دان لگاتار محنت سے اس قابل ہو گئے کہ اس سو فٹ لمبی جگہ کی نشان دہی کر سکیں، جس کے اندر جغرافیائی جنوبی قطب واقع ہے۔ چنانچہ اسی جگہ سو فٹ نصف قطر کے دائرے کی شکل میں تیل کے خالی ڈھول رکھ دیے گئے۔ جغرافیائی قطب جنوبی اس دائرے کے اندر واقع تھا۔ تاریخ میں پہلی بار انسان نے اتنی صحت کے ساتھ قطب کا پتہ لگایا ہے قطب شمالی کا پتہ لگانا ویسے ناممکن ہے کیوں کہ وہ متحرک برف کی چادر پر واقع ہے

دو منٹ میں دنیا کے گرد چکر

جدید ذرائع آمد و رفت کی ترقی کے بعد جب انسان پہلی بار اس قابل ہوا کہ کوئی تین مہینے میں دنیا کے گرد چکر لگا لے تو اس چیز نے دنیا میں تہلکہ ڈال دیا۔ لیکن آج جٹ تیارے آواز سے تیز تر رفتار کے ساتھ پرواز کر سکتے ہیں اور انسان اس قابل ہے کہ دنیا کے گرد چوبیس گھنٹے میں چکر لگا لے۔

تاہم دنیا کے گرد چکر لگانے کا عام مطلب یہ ہے کہ کرۂ ارض کے پچیس ہزار میل محیط کے گرد چکر لگایا جائے لیکن قطب پر مسئلے کی نوعیت مختلف قسم کی ہے۔ یہاں جغرافیائی قطب کے نقطے کے گرد گھوم لینے سے دنیا کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا سائنس دانوں نے قطب جنوبی کے گرد سو فٹ نصف قطر کا جو دائرہ تیل کے خالی ڈھولوں سے تیار کیا گیا تھا، اس کے گرد گھوم لینے سے دنیا کے گرد چکر مکمل ہو سکتا تھا۔ یہ چکر کاٹنے میں صرف دو منٹ صرف ہوتے تھے۔

۱۸ ستمبر کی صبح کو سورج کی زندگی بخش کرنوں کے چاروں طرف پھیل جانے پر چند سائنس دان قطب جنوبی کی طرف بڑھے جو صرف آدھ میل جنوب میں تھا۔ کیمپ سے قطب تک ہر سو گز کے فاصلے پر ایک جھنڈی نصب تھی تاکہ چلنے والوں کو راستہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ مگر یہ آدھ میل کا سفر بھی ایک خاصا کٹھن سفر بن رہا تھا کیونکہ بلا کی سردی اور آندھی کے علاوہ برف اور یخ کے راستے دشوار گذار ہو رہے تھے۔ قطبی آندھیاں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ وہ جس سمت میں چلیں اسی سمت میں یخ کی مرمریں سطح پر گہرے کٹاؤ پیدا کر دیتی ہیں جیسے کسی کھیت میں ہل کے ذریعہ کٹاؤ پیدا کر دیے گئے ہوں۔ یہ کٹاؤ دو دو فٹ تک گہرے ہو جاتے ہیں۔ غرض آندھیاں اس سفید براق سطح کو توڑ مروڑ کر اس پر عجیب و غریب قسم کے نقوش ثبت کر دیتی ہیں۔ چھ ماہ لمبی رات کے بعد جب سورج کی سنہری کرنیں ان مرمریں نقوش میں جو کا چوند پیدا کرتی ہیں تو روشنی اور سائے کی آمیزش سے ایسا عجیب البیلا حسن پیدا ہوتا ہے، جس پر نگاہ ٹھہر نہیں سکتی۔

سنسان بیابان

قطب جنوبی کے گرد انٹارکٹکا کا وسیع براعظم واقع ہے۔ لیکن خشکی کا یہ وسیع و عریض قطعہ ایک برفانی بیابان ہے جو ہر طرح کی زندگی سے خالی ہے۔ اس براعظم کو یخ کی سفید چادر اپنی لپیٹ میں لپیٹے رکھتی ہے۔ نہ یہاں کوئی روئیدگی ہے نہ جانور اور نہ انسان۔ قطب کے گرد کا علاقہ ایک بلند سطح مرتفع ہے۔ باقی براعظم میں بھی سطح مرتفع

کے علاوہ وسیع میدان بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن سارے براعظم پر ہمیشہ ہُو کا عالم طاری رہتا ہے اس میں زندگی کی کہیں کوئی علامت نظر نہیں آتی۔

بین الاقوامی جغرافیائی طبعی سال کے سلسلے میں اس براعظم میں سینکڑوں سائنس دان پہنچ چکے تھے اور انہوں نے اس کے مختلف نقطوں پر بستیاں قائم کر لی تھیں۔ ان کو ۱۹۵۷ء کا سرما بھی برفانی بیابان میں گذارنا تھا۔ جن ملکوں نے بین الاقوامی جغرافیائی طبعی سال منانے میں حصہ لیا ان میں امریکہ۔ برطانیہ۔ روس اور فرانسیسی قابل ذکر ہیں۔ ان ملکوں کے سائنس دانوں نے الگ الگ بستیاں قائم کر لی تھیں۔ قطب جنوبی کے بالکل قریب کی بستی امریکی سائنس دانوں کی تھی۔ سائنس کے ان مجاہدوں نے ۱۹۵۷ء کا موسم سرما جس تنہائی میں گذارا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ قطب پر واقع امریکی بستی کے قریب ترین پڑوسی ۷۰۰ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ مہینوں لمبی اندھیری رات، بلا کی سردی اور حد درجہ کی تنہائی یہ تھے وہ مصائب جن سے ان سائنس دانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ جو لوگ براعظم کے شمالی حصوں میں تھے ان کی رات کچھ پہلے ختم ہو گئی۔ لیکن سائنس دانوں کی بعض بستیاں ایسی بھی تھیں جن میں صرف گنتی کے آدمی موجود تھے۔ مثلاً ایک برطانوی سٹیشن پر صرف تین سائنس دان موجود تھے۔ لاکھوں مربع میل کے سنسان برفانی بیابان میں صرف چند آدمیوں کا ایسی جگہ رہنا جس کے ارد گرد سینکڑوں میلوں تک انسان کا وجود نہ ہو، بڑے عزم اور بلند ہمتی کی بات ہے۔

عجیب و غریب سراب

ریتلے صحراؤں کا سراب ایک مشہور چیز ہے۔ مگر سائنس دانوں نے دنیا کو پہلی بار اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ برفانی صحرا بھی سراب سے خالی نہیں۔ البتہ اس سراب کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔

طلوع آفتاب سے گھنٹوں پہلے آسمان پر شفق کی سرخی اس بات کی دلیل تھی کہ سورج دیوتا چلے آ رہے ہیں افق پر کچھ پتلے پتلے بادل بھی پھیلے ہوئے تھے، ناگاہ ایک سائنس دان کی نگاہ ایک عجیب و غریب روشنی پر پڑی۔ بادلوں کے درمیان صاف آسمان کا ایک چھوٹا سا دریچہ واقع تھا۔ اس میں سے ایک چندھیا دینے والا شعلہ دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو اس طرف دیکھنے کو کہا۔ مگر وہ شعلہ غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے ایک اور شعلہ نکلا۔ یہ سلسلہ لگاتار اسی طرح جاری رہا۔ یہ روشنی کے شعلے مختلف رنگوں کے تھے۔ کبھی سبز، کبھی نیلے، کبھی خون جیسے

رنگ۔ لیکن زیادہ تر شوخ نارنجی نارنگ کے۔

سائنس دان حیران تھے کہ یہ روشنی کیسی ہے۔ آخر انھیں خیال گذرا کہ یہ سورج کا سراب ہے۔ اپنے خیال کی
ئید کے لیے وہ قریب کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور روشنی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے لگے۔ کبھی بلندی پر کھڑے
کر اور کبھی نیچی جگہ بیٹھ کر۔ جلد معلوم ہو گیا کہ زاویہ نگاہ کے بدلنے سے روشنی کی کمیت اور کیفیت دونوں میں فرق
یدا ہو رہا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ روشنی فی الحقیقت ایک سراب ہے۔

واپس کیمپ میں جا کر ان لوگوں نے ساتھیوں کو خبر دی کہ سورج نکلنے والا ہے۔ اس کی آمد سے
پہلے اس کا سراب بطور نقیب آن موجود ہوا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی تمام لوگ سورج دیوتا کو خوش آمدید کہنے کے لیے
ار ہو گئے اور تھوڑی دیر میں اپنے اپنے کیمرے لے کر چھت پر چڑھ گئے تاکہ چھ مہینے کی غیر حاضری کے
بعد نمودار ہونے والے سورج کی تصویر حاصل کریں۔ اس اثنا میں چمکیلی روشنی کے سراب ختم ہو چکے تھے
لیکن تھوڑی دیر میں ایک اور کرشمہ دیکھنے میں آیا۔ سورج ابھی افق سے دو درجے نیچے تھا اور اس کے
لوع میں چند دنوں سے زیادہ وقت باقی تھا۔ لیکن افق سے اوپر اس کا چمکیلا گول کنارہ اٹھتا ہوا دکھائی دیا
ب نے سمجھا سورج دیوتا آن پہنچے اور جھٹ ہاتھ کیمروں کی طرف بڑھے۔ مگر اگلے ہی لمحہ معلوم ہو گیا کہ اسکی
کیلی قوس کو قرار نہیں۔ وہ اوپر نیچے ہچکولے کھا رہی ہے۔ نیز اس کی حدود واضح اور متعین نہیں۔ یہ چمکیلی
وس حجم میں بڑھتی گئی جیسے سورج افق کے پیچھے سے رفتہ رفتہ نمودار ہو رہا ہو۔ آخر کار ایک چمکیلا گولہ
فق سے اوپر آ گیا مگر یہ سورج نہیں تھا کیونکہ اس کی سنہری طشتری ناچنے والی روشنی کی لکیروں سے
نی تھی اور اس کے کنارے اندر چمکتے اور باہر نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر یہی منظر جاری رہا
س کے بعد افق کو برفانی دھند کی ایک موٹی چادر نے نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی درجہ حرارت
بدم بڑھنے لگا۔ پچھلے تین دن میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت صفر سے ۹۱ درجے نیچے رہا تھا۔ مگر اب
یکھتے ہی دیکھتے یہ صفر سے ۷۹ درجے نیچے رہ گیا۔ درجہ حرارت کا یوں یکدم اوپر چلے جانا ظاہر کرتا تھا
ہ گرم ہوا کی ایک رو قطب جنوبی کی طرف بڑھ آئی ہے۔ فی الحقیقت یہ گرم ہوا سورج کی کرنوں کو منعکس کر رہی تھی۔

سورج کا یہ سراب اسی طرح کئی دنوں تک نظر آتا رہا۔ اس سراب کا ایک اور عجیب و غریب

پہلو یہ تھا کہ ہر روز مشرق کے افق سے نکلتا اور بلند ہوتا ہوتا نصف النہار کی بلندی پر پہنچ کر ڈھلنے لگتا اور آخر مغرب کے افق کے نیچے جا چھپتا۔ قطب پر سورج کا یہ روزانہ سفر ایک ان ہونی چیز ہے کیونکہ یہاں جب سورج نکل آئے تو وہ لگاتار چھے ماہ تک افق کے دائرے سے اوپر گھومتا رہتا ہے۔ روزانہ نکلتا نہیں اور نہ کبھی افق سے نیچے غائب ہوتا ہے۔

سورج کا یہ عجیب و غریب سراب آخر پیدا کس طرح ہوا؟ سائنس دان اس سوال کا کوئی قطعی جواب معلوم نہ کر سکے۔ ایک بات یقینی تھی۔ وہ یہ کہ کرۂ سطح زمین پر بلا کی سردی تھی۔ کئی دنوں سے درجہ حرارت صفر سے نوّے یا اس سے زیادہ درجے کم تھا۔ اور آخر میں یہ صفر سے ۱۰۲ درجے کم ہو گیا۔ لیکن ہوا کے بالائی طبقے کافی گرم تھے۔ سائنسی آلے اس بات کا قطعی ثبوت پیش کر رہے تھے کہ ہوا کے بالائی طبقوں اور سطح زمین کے درجہ حرارت میں بہت بھاری فرق موجود ہے۔ مثلاً جس روز سطح زمین پر تھرمامیٹر صفر سے ۱۰۲ درجے نیچے ظاہر کر رہا تھا، اس روز چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوا کا درجہ حرارت صفر سے صرف ۳۰ درجے نیچے تھا گویا بالائی ہوا نیچے کی ہوا سے بقدر ۷۲ درجے زیادہ گرم تھی۔ اس تفاوت نے بالائی ہوا کو ایک آئینے کی شکل دے دی تھی جو کسی دور دراز ایشیائی ملک میں طلوع اور غروب ہونے والے سورج کا عکس قطب پر پھینک رہا تھا۔

ایک خیال یہ بھی تھا کہ سورج کا یہ سراب براعظم انٹارکٹکا کے اندرونی حصوں کی بالائی ہوا پیدا کر رہی ہے اس براعظم کے اندرونی حصوں کے متعلق انسان کو ابھی کچھ معلوم نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب امریکی ہوائی جہازوں نے اس کے اندرونی حصوں پر پرواز کی تو وہ ایک ایسے حصے میں بھی جا نکلے جس کی بلندی چودہ ہزار فٹ تھی۔ یہ حصہ قطب جنوبی سے بہت زیادہ اونچا ہے۔ کیونکہ قطب پر سطح مرتفع صرف نو ہزار فٹ اونچی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اندرونی بلند حصے کے اوپر کی ہوا آئینہ کا کام دے رہی ہو اور کسی دور دراز ملک کے سورج کا عکس قطب پر ڈال رہی ہو۔

سورج کے اس سراب نے سائنس دانوں کی بستی کو پورے پانچ روز تک حیرانی میں ڈالے رکھا۔ آخر ۲۲ ستمبر کو سورج فی الحقیقت نکل آیا۔ قطب جنوبی پر مقیم سائنس دانوں نے پورے ۱۸۶ دن کے

بعد اس کی تشکیل دیکھی۔ ان میں سے کئی ایک اس سے پہلے بھی براعظم انٹارکٹیا یا شمالی قطب کے علاقوں میں سردی کا موسم گزار چکے تھے۔ لیکن یہ علاقے قطبوں سے کافی دور تھے۔ اس لیے وہاں رات کی لمبائی چار مہینے سے زیادہ نہ بڑھی تھی۔ تاریخ میں پہلی بار انسان نے قطب جنوبی کے عین اوپر موسم سرما بسر کی تھی اور چھ مہینے لمبی رات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔

انسانی قوت برداشت

سردی کی شدت انسانی جسم میں درد کا جو احساس پیدا کرتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سائنس دانوں نے قطب کی یہ خوفناک سردی کس طرح برداشت کی۔ اندھیری رات اور طوفانی جھکڑوں میں انہیں اکثر مکانوں سے باہر نکلنا پڑتا تھا اور بعض اوقات گھنٹوں تک باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود وہ صحیح سلامت اور تندرست و توانا رہے۔ یہ چیز کس طرح ممکن ہوئی ؟

آج تک دنیا کا سرد ترین مقام سائبیریا کا شہر اومیاکن شمار ہوتا تھا۔ جہاں سردیوں میں درجہ حرارت صفر سے ۸۹ درجے نیچے تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ دنیا کے کم از کم درجہ حرارت کا ریکارڈ تھا۔ لیکن اومیاکن کا شہر ایک نیچی وادی میں واقع ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سردیوں میں سرد بھاری ہوا اس وادی پر مسلط ہو جاتی ہے اور لگاتار وہاں جمی رہتی ہے۔ چناں چہ سردیوں میں وہاں بہت شاذ حرکت کرتی ہے لیکن قطب جنوبی پر درجہ حرارت صفر سے ۱۰۲ درجے نیچے گر گیا۔ مگر اس کے باوجود آندھی کی شدت کا یہ حال تھا کہ اس کی اوسط رفتار پندرہ میل کے درمیان رہتی تھی۔ اس اختلاف کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جہاں اومیاکن ایک پست وادی میں واقع ہے۔ قطب جنوبی کی سطح ۹۲۰۰ فٹ بلند تھی۔

جن لوگوں نے قطب جنوبی پر سردیاں گزاریں ان میں سے کئی ایک نے براعظم انٹارکٹا کے بیرونی کناروں پر پہلے بھی سردیاں بسر کی تھیں۔ مگر وہاں یہ لوگ صفر سے چالیس درجے کم درجہ حرارت پر بھی باہر نکلنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے۔ خواہ موسم پرسکون ہی کیوں نہ ہو اور جب درجہ حرارت صفر سے ساٹھ درجے نیچے گر جاتا تو باہر نکل کر کام کرنا کلی طور پر رضاکارانہ کام رہ جاتا۔ مگر قطب جنوبی پر پورے ۱۶۹ دن ایسے گذرے جب درجہ حرارت لگاتار صفر سے ۶۰ درجے کم تھا۔ سب سے سرد مہینے کا اوسط درجہ حرارت صفر سے

۰۰ درجے نیچے تھا۔ اس کے باوجود لوگ بخوشی باہر نکلتے اور کام کرتے رہے۔ ایک شخص صفر سے ۱۰۰ درجے کم درجہ حرارت پر باہر نکلا اور پورے چار گھنٹے باہر رہا مگر اسے کوئی گزند نہ پہنچا۔

اس بظاہر ناقابلِ تشریح صورتِ حال کی شرح سائنسی حقائق میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ قطب جنوبی پر سر مالبسر کرنے والے لوگ نو ہزار فٹ کی بلندی پر مقیم تھے۔ اس مقام پر ہوا بے حد پتلی ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے اس کی قوت جذب بھی بہت کم ہوتی ہے۔ یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ اس بلندی پر تیز و تند ہواؤں اور صفر سے اسّی بلکہ سو درجے کم درجہ حرارت پر بھی سردی اتنی تکلیف دہ نہ تھی جتنی میدانی علاقوں میں۔ اس کے علاوہ دوسرا قابلِ لحاظ نکتہ یہ ہے کہ سردی کا تکلیف دہ ہونا یا نہ ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ جسم کو کس قدر احتیاط کے ساتھ کپڑوں میں لپیٹا گیا ہے۔ باقی رہا سردی کے کم یا زیادہ شدید ہونے سے جسمانی تکلیف کا محسوس ہونا تو اس کے متعلق سائنسی شہادت یہ ہے کہ چالیس درجے فارن ہیٹ پر بھی جسم کو سردی کا بالکل وہی احساس ہوتا ہے جو صفر سے چالیس درجے کم فارن ہیٹ پر۔ وجہ یہ کہ سردی محسوس کرنے والے اعصاب چالیس درجے کا فارن ہیٹ پر پوری شدت کے ساتھ کام کرنے لگتے ہیں۔ سردی کے اس درجے پر وہ اپنی زیادہ سے زیادہ استعداد کے ساتھ جسم کو خطرے سے آگاہ کرنے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ درد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس انتباہ کی نوعیت محض خطرے کی گھنٹی کی ہے اور بس۔ جب گھنٹی پورے زور شور سے بجنے لگے تو پھر اس کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ اس سے زیادہ بلند آواز پیدا کرے۔ خواہ خطرہ کئی گنا بڑھ جائے

قطب جنوبی پر سر گذارنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ اس مقام پر رات کا اندھیرا دوسرے مقامات سے کہیں زیادہ تھا۔ جو لوگ اس سے پہلے چار مہینے کی رات دیکھ چکے تھے وہ جانتے تھے کہ ان چار مہینوں میں سے صرف دو مہینے ہی گھپ اندھیرے کے تھے۔ پہلا اور چوتھا مہینہ شام اور پو پھٹنے کے دھندلکے کا تھا۔ اس دھندلکے میں باہر نکل کر چلنا پھرنا اور کام کرنا بالکل آسان تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں سورج افق سے گیارہ یا اس سے کم درجے نیچے تھا، اور اس کی کرنیں ہوا کے بالائی طبقوں کو برابر منوّر کیے رکھتی تھیں۔ قطب پر بھی پہلا اور چھٹا مہینہ دھندلکے کا آیا۔ لیکن درمیانی چار مہینے گھپ اندھیرے کے تھے۔

(باقی آئندہ)

اسرارِ خوشخوانی

کوثر حسین

مطالعے کی دو قسمیں

زبان و ادب کے سیکھنے سکھانے میں مختلف اصنافِ سخن سے واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی نظم ہے تو کبھی نثر۔ کبھی ڈراما ہے تو کبھی افسانہ۔ اور کبھی اور اور کچھ۔ مگر باعتبارِ کیفیت ان کے مطالعے کی دو ہی صورتیں ہیں: اول سرسری مطالعہ۔ دوم گہرا مطالعہ۔ مطالعے کی ان ہر دو اقسام کا مواد، مقصد اور منہاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

جو قطعۂ نظم یا پارۂ نثر سادہ و سلیس ہو، اس کا سرسری مطالعہ کفایت کرتا ہے۔ رنگین و ادق اندازِ بیان سمجھنے کے لیے گہرے مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر زیرِ مطالعہ مواد کے ہر پہلو سے آگاہی مقصود ہو تو گہرے مطالعے کے بغیر کام نہیں چلتا۔ البتہ معمولی واقفیت جو آسان عبارت کے مفہوم تک محدود ہو سرسری مطالعے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

سرسری مطالعہ

سرسری مطالعے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ پیشِ نظر عبارت کا مفہوم جلد از جلد سمجھ لیا جائے۔ عبارت کی زبان اور اندازِ بیان سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ صرف زود خوانی اور زود فہمی ملحوظ رہتی ہے اور مطالعے کی رفتار تیز کرنے کے لیے حرکتِ زبان اور جنبشِ لب سے بھی اجتناب کیا جاتا ہے۔ عبارت کو دیکھ کر دل ہی دل میں (بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں) قرأت کی جاتی ہے۔ گویا سرسری مطالعہ ایک خاموش مطالعہ ہے

دیکھا جائے تو سرسری مطالعے کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ بہت کچھ ہے۔ اس قسم کا مطالعہ ہماری معاشی اور معاشرتی ضرورت کی ایجاد ہے۔ اخبار دیکھنا۔ رسائل اور مراسلات پڑھنا۔ کچہریوں اور دفتروں میں بے شمار رپورٹوں کا معائنہ کرنا۔ خاموش مطالعے کا ہی منت پذیر ہے۔ اسی لیے مدرسے میں طلبہ کو خاموش مطالعے کی تربیت دی جاتی ہے۔ معلم سبق (مثلاً کہانی) کا ابتدائی حصہ زبانی بتا کر، اور

اور سبق کی افادیت سمجھا کر طلبہ کو پڑھنے کا شوق دلاتا ہے اور جب طلبہ پڑھ چکتے ہیں تو معلم سوالات کے ذریعے اس کا جائزہ لیتا ہے کہ طلبہ عبارت کا مفہوم سمجھ گئے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے مطالعے میں نہ عبارت کو بآواز پڑھنے کی نوبت آتی ہے نہ طلبہ کی استعداد قرأت اور ان کے لب و لہجہ کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔

گہرا مطالعہ

گہرے مطالعے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ نظم یا نثر کا اچھی طرح پڑھنا سمجھنا، اور اس کی لفظی اور معنوی خوبیوں کا پرکھنا آجائے۔ اس لیے گہرے مطالعے کی تین منزلیں ہیں۔ قرأت تفہیم اور استحسان

معلم مناسب تحریکِ ذہنی کے سہارے طلبہ کو سبق کی طرف مائل کرتا ہے، سوالات کے ذریعہ ان کی سابقہ معلومات کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اصل سبق (یعنی پیشِ نظر عبارت) کی طرف گریز کرکے سبق کا عنوان بتانا، اور سبق کی اہمیت اور اس کے قابلِ غور نکات پر توجہ دلاتا ہے۔ اس کے بعد معلم عبارت کا ایک حصہ پڑھ کر نمونہ قرأت پیش کرتا ہے۔ دو تین طالب علم یکے بعد دیگرے جماعت کے سامنے نمونہ قرأت کے مطابق بلند آواز سے عبارت خوانی کرتے ہیں۔

دوسری منزل تفہیم سے تعلق رکھتی ہے جس میں معلم اپنے نفسیاتی علم کی روشنی میں، اخذِ معانی، تشریح و توضیح یا تلخیص کی مُہر سر کرتا ہے۔

تیسری منزل استحسان عبارت سے متعلق ہے۔ ایک بار پھر عبارت کی قرأت کی جاتی ہے اور معلم اندازِ بیان کی خصوصیات اور الفاظ و معانی کے محاسن کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ استحسان کے بعد، اب تک جو کچھ کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نئے الفاظ و محاورات کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ اس طرح سبق کا اعادہ ہو جاتا ہے۔

گہرے مطالعے کا کوئی سبق قرأت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ قرأت نہ صرف قرأت کے لیے ضروری ہے بلکہ تفہیم و استحسانِ عبارت کے لیے بھی ناگزیر ہے اور قرأت کی تصحیح معلم کے نمونۂ قرأت کی محتاج۔ وہ قرأت جو گہرے مطالعے سے مخصوص ہے بلند خوانی کہلاتی ہے اور سرسری مطالعے کے برعکس

اعضائے صوت کی مدد سے عمل میں آتی ہے۔ اس وقت صرف بلند خوانی کے متعلق تفصیل سے کچھ عرض کرنا ہے۔ اچھی بلند خوانی کو خوشخوانی کہا جاتا ہے۔

خوش خوانی کے مقاصد

خوش خوانی کا پہلا مقصد ادبی استحسان میں اعانت کرنا ہے۔ خوش خوانی اپنی دل کشی اور دل آویزی سے نہ صرف سامعہ نوازی کرتی ہے بلکہ ذہن کو بھی سرور بخشتی ہے۔ نظم کا پورا حسن و جمال، غنائی کمال، اور معانی میں غلطاں زیر و بم، صرف اسی وقت محسوس ہو سکتا ہے جب نظم کو باواز بلند پڑھا جائے۔ بلکہ نثر بھی اچھی بلند خوانی کی بدولت زیادہ پُراثر اور خوش تر ہو جاتی ہے۔ خوش خوانی کی قابلیت کا حصول ایک چشمۂ لطف و سرور کی دریافت کے مماثل ہے۔ سچ پوچھیے تو خوش خوانی اپنے اس مقصد کے تحت لطافت کی کان اور استحسان کی جان ہے۔ جسے اس کا چسکا پڑ گیا وہ "من تو شدم تو من شدی" کے مصداق ایک دن ادبیات کی روح رواں بن کر رہے گا۔

خوش خوانی کا دوسرا مقصد خالص تدریسی نوعیت رکھتا ہے۔ جس کی تکمیل ایک طرف خوش خوانی کرنے والے طالب علم کو اس عمل کا پھل دیتی ہے۔ دوسری طرف سننے والے طلبہ کو ان کی خاموش توجہ اور تنقید کا صلہ بخشتی ہے یہ کیا ہے؛ صحیح اندازِ تکلم کی تربیت اور ترتیل کی انوٹ۔ جو باواز بلند پڑھنے سے بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے سننے سے بھی، یہ قاری اور سامع، دونوں کو اسرارِ تلفظ بتاتی اور گفتگو کی موسیقی سکھاتی ہے۔

حسنِ صورت

بلند خوانی تحریری علامات کو اصوات میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ کام ہر عبارت خواں کر سکتا ہے لیکن ہر شخص کی آواز منفرد ہوتی ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ یہ آواز حسین و جمیل بھی ہو سکتی ہے اور قبیح و کریہہ بھی۔ اس کا تعلق اگر قسمت یا عطیۂ فطرت سے نہیں تو جسمانی صحت اور مناسب ورزشوں اور مشقوں سے ایک حد تک اعضائے صوت کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس وقت ہمیں خوش خوانی کی صرف ان خوبیوں سے بحث ہے جو تمام تر اکتسابی ہیں۔ یعنی توجہ، محنت اور مشق و مزاولت سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔

خوش خوانی کے اجزائے ترکیبی

خوش خوانی کا دار و مدار مندرجہ ذیل امور پر ہے۔ انھیں خوانی کے عناصر یا اجزائے ترکیبی سمجھنا چاہیے۔

ا۔ صحت تلفظ

خوش خوانی میں صحت تلفظ کی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ تلفظ کی غلطی پوری قرات پر پانی پھیر دیتی ہے اور قاری کی علمیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اس لیے تلفظ کی نگہداشت سب سے مقدم ہے۔

الفاظ حروف پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے حروف ہجا کو صحیح مخرج سے ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور قریب المخرج حروف میں امتیاز کر لیا جائے۔ کم سے کم ق۔ک، ا۔ ع اور س۔ ش کی آوازوں کو غلط ملط نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حروف کے صحیح اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش) کا خیال بھی ضروری ہے حرف متحرک کو ساکن، اور حرف ساکن کو متحرک پڑھنے کی غلطی عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ مثلاً فَلَک بجائے فَلْک۔ غَلَط بجائے غَلْط۔ عَصَر بجائے عَصْر۔ بعض لوگ مقامی بولی کے اثر سے، زبان کو اس طرح دگڑا کر بولتے ہیں کہ جس سے خواہ مخواہ تشدید کی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ٹوپّی۔ بوتّل وغیرہ۔ اس سے پرہیز لازم ہے صحت تلفظ کے لیے حروف شمسی، حروف قمری، اور واؤ معدولہ (جو بولا نہ جائے) کا علم اور تنوین۔ حرفِ موقوف (یعنی جس حرف کا ماقبل جزم والا ہو۔ جیسے اُشپ کی پ) حرفِ مدہ (یعنی جس حرفِ علت کی حرکتِ ماقبل موافق ہو (جیسے فُدَ۔ باغ اور دین کی و۔ ا۔ ی) حرف لین (یعنی جس حرفِ علت کی حرکتِ ماقبل موافق نہ ہو۔ جیسے مور، شور کا واؤ اور دیر، شیر کی ی) نونِ مخلوط (جو کلمے کے درمیان، حرف ماقبل سے مل کر آواز دے۔ جیسے آہنگ۔ سنگ کا نون) نون غنہ (جو کلمے کے درمیان الف کے ساتھ اور کلمے کے آخر میں حرفِ علت کے ساتھ ناک میں بولا جائے۔ جیسے خواند، مانند، جہاں، یہیں، کانوں) یائے معروف و مجہول۔ واؤ معروف و مجہول وغیرہ کی آوازوں سے پوری واقفیت ضروری ہے۔

اردو میں اعراب لگانے کا رواج کم ہے اس لیے مبتدی کو قرأت میں سخت دشواری ہوتی ہے۔ مزید برآں اردو میں اپنی آوازیں بدل چکے ہیں۔ مثلاً عربی کا مَوسِم اردو میں مَوسَم ہے۔ لہٰذا تلفظ کی تحقیق کے لیے عربی اور فارسی لغات کی بجائے فرہنگِ آصفیہ یا فرہنگِ عامرہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

۲۔ ادراکِ رکن

بعض الفاظ یک رکنی ہوتے ہیں یعنی ان کا تلفظ منہ کی صرف ایک آواز سے ادا ہو جاتا ہے۔ مثلاً دِل تُل۔ اور بعض الفاظ میں کئی کئی رکن ہوتے ہیں۔ مثلاً دَلدَل۔ بُلبُل۔ کوشش جن میں دو دو رکن ہیں۔ اور "طریقہ" جس میں تین رکن ہیں۔ اس طرح جب کسی لفظ میں ایک سے زیادہ رکن ہوں تو بالعموم کسی رکن کی آواز ثقیل ہوتی ہے اور کسی رکن کی آواز خفیف، اور کبھی کبھی دو رکنی الفاظ کا تلفظ لحن کی ایک ہی سطح پر رہتا ہے۔ نہ کوئی رکن خفیف ہوتا ہے نہ کوئی رکن ثقیل، کیوں کہ ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً دَلدَل، بُلبُل۔ لیکن جیسا (جے۔ سا) پُورا (پُو۔ را) اور لہجہ (لہ۔ جہ) کے تلفظ میں پہلا رکن ثقیل ہے اور دوسرا رکن خفیف۔ اگر تلفظ کے وقت اس کا لحاظ نہ رکھا جائے تو تلفظ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔ "سلیقہ" میں تین رکن ہیں۔ پہلا خفیف ہے۔ دوسرا ثقیل ہے اور تیسرا خفیف۔ رکن خفیف جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نسبتاً آہستہ سے بولا جاتا ہے اور ثقیل نسبتاً زور سے۔

وہ رکن جس میں صرف ایک ہی حرف ہو۔ وہ ہمیشہ خفیف ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ضرورت (ض۔ رُو۔ رت) میں ض اور کلام غالب میں "ک" اور "م"۔ حروف مغیرہ (مثلاً سے۔ ہے۔ تک۔ پر۔ میں۔ کو وغیرہ) کی آواز بھی کبھی رکنِ خفیف ہی بناتی ہیں۔ دراصل کسی لفظ کے تلفظ کے لیے صرف حرکات و سکنات کو ملحوظ رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ ارکان کی نوعیت کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جس رکنِ خفیف یا رکنِ ثقیل کا ذکر ہو رہا ہے اس کا فنِ عروض کی اصطلاحوں سے کوئی تعلق نہیں۔ فنِ عروض میں خفیف و ثقیل سبب و تد کی نوعیت کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ رموزِ اوقاف کی نگہداشت

خوش خوانی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ پڑھتے وقت رموزِ اوقاف کو ملحوظ رکھا جائے۔ اگرچہ رموزِ اوقاف قواعد کے تجویز کردہ نشانات ہیں جن کا اصلی مقصد جملے کی ساخت بتانا اور مختلف اجزائے جملہ کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض نشانات ایسے ضرور ہیں جو عبارت خوانی کے دوران میں دم لینے کی منزل بتاتے ہیں۔ ان سے نگاہ اور زبان دونوں کو سہارا ملتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک خالص لسانی کام بھی انجام دیتے ہیں۔ یعنی معانی پیرا فزا انداز ہوتے ہیں۔ وہ درمیان میں آکر ان الفاظ میں فصل پیدا کر دیتے جن کے

گلا ٹھ ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

جس لفظ پر سکتے کا نشان (،) ہو، اس کے آخری رکن پر زبان ذرا اوپر مڑ جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ وقفے (؛) اور رابطے (:) پر آواز ایک ہی سطح پر سنبھلے رہنے کا میلان ظاہر کرتی ہے۔ یہاں آواز ذرا زیادہ توقف کرتی ہے اور جملہ خاتمے کی جانب بڑھتا ہے۔

۴۔ تغیرِ لحن

تکلم کا لحن سے وہی تعلق ہے جو موسیقی کا سُرگم سے ہوا کرتا ہے۔ اور جس طرح سروں کا تال میل موسیقی کو وجود میں لاتا ہے اسی طرح لحن بھی تکلم کی نقش بندی کرتا ہے۔ سُرگم سے ناواقف شخص موسیقی سے محظوظ ہو تو ہو سکتا ہے مگر اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ شخص جو زبان کے لب ولہجہ سے ناواقف ہو زبان کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تکلمی زبان پر پوری توجہ دی جائے اور کانوں کو گفتگو کے اچھے نمونے سننے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ صحیح نمونوں کا سننا اور اُن کی تقلید کرنا ہی صحیح لسانی عادات پیدا کر سکتا ہے۔

یہ مانا کہ عام طور پر لہجے کی لغزش ایسی نہیں ہوتی کہ کلام کو بالکل ہی ناقابلِ فہم بنا دے۔ لیکن اس سے مفہوم ضرور مجروح ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لہجے کے فرق کی بدولت ایک ہی لفظ سے سامع کے ذہن میں نہ صرف مختلف بلکہ متضاد معانی متبادر ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ خوب مدح کے موقع پر بھی بولا جا سکتا ہے اور ذم کے ذیل میں بھی۔ بلکہ اسی لفظ سے مدح و ذم کے مختلف مدارج کا اظہار بھی ممکن ہے اور اس اظہار کی خوبی طرزِ ادا کے ہاتھ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لب ولہجہ گفتگو کی موسیقی کو نہ صرف خارج از آہنگ ہونے سے باز رکھتا ہے۔ بلکہ اس موسیقی کے اثر کی نگہداشت بھی کرتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ غلط لب ولہجہ سے الفاظ و معانی میں مغائرت پیدا ہو جاتی ہے اور لہجے کی نرمی یا سختی الفاظ کی معنویت کو کم یا زیادہ کر سکتی ہے۔ مہربانی کے الفاظ اگر درشت لہجے میں کہے جائیں تو طعن و تشنیع بن جاتے ہیں۔

خبریہ جملے کا لہجہ اور ہے، استفہامیہ کا اور۔ خبریہ جملے میں آواز بلندی سے پستی کی طرف آتی ہے

مد استفہامیہ جملے کا آخری لفظ، اس جملے کے لحن کا نقطۂ عروج ہوا کرتا ہے۔ اگر لحن کے اس سوالی و جوابی انداز میں فرق آ جائے تو جملہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ ذرا اس کا تصور کیجیے کہ ایک شخص جواب کے لہجے میں سوال کرتا ہے اور دوسرا شخص سوال کے لہجے میں جواب دیتا ہے۔

سوال ۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

جواب ۔ میں بازار جا رہا ہوں ؟

حکم اور درخواست میں بالعموم لحن ہی مابہ الامتیاز ہوا کرتا ہے۔ اگر دعائیہ جملے میں حکم کا سا لہجہ آ جائے تو خطا نہیں گناہ ہے۔ "واہ" کہنے کا انداز کچھ اور ہے "آہ" کہنے کا انداز کچھ اور۔ استعجابیہ جملہ اگر استعجابی انداز سے ادا نہ ہو تو بے معنی ہے یا گمراہ کن۔ حیرت، غم، خوشی اور اضطراب کی کیفیات، اپنے اظہار کے لیے الفاظ سے زیادہ تغیرِ لحن کا سہارا لیتی ہیں۔

مسلسل عبارت میں اگر کوئی جملہ معترضہ، یا بصورتِ اقتباس کوئی قول آ جائے تو بیان کا لہجہ بدلنا پڑتا ہے۔ تاکہ نقل قول کی تازگی قائم رہے اور غلط مباحث نہ پیدا ہو۔

۵۔ صفتِ روانی

خوش خوانی میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جملے اس طرح ادا ہوں جس طرح عام طور پر گفتگو میں منہ سے نکلتے ہیں۔ جھجک یا رکاوٹ نہ ہو۔ جھٹکے نہ لگیں اور جملے کے درمیان بے موقع توقف نہ ہو۔ قرأت میں روانی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب پڑھنے والا الفاظ کی شکلوں اور ان کے مفہوم سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور کوئی خارجی عامل مثلاً عبارت کا غیر واضح ہونا یا فضا کا ناسازگار ہونا مانع نہ ہو۔

اگر عبارت خوانی کی رفتار بہت ہلکی ہو تو سننے والوں کو اس سے کوفت ہوتی ہے اور پڑھنے والا خود بھی اسے دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ روانی کی صفت، ذوقِ ادب کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے علم و ادب میں ترقی کرنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

۶۔ اہتمام ترتیل

خوش خوانی میں صرف روانی کافی نہیں۔ کیوں کہ پڑھنے کی حد سے زیادہ رفتار، عبارت کی خوبیوں کو ملیامیٹ

کر دیتی بعض کم ذوق شعراس تیزی سے پڑھ جاتے ہیں کہ شعر کی لطافت کا محسوس ہونا تو درکنار مطلب کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سننے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ الفاظ کو ایک دوسرے سے سر ٹکراتا دیکھ کر جملوں میں گڈمڈ پڑ جاتی ہے اور معانی و مطالب کچل کر رہ جاتے ہیں۔ اس بے پروائی کے ہاتھوں نہ معلوم، روز کتنے خون ہوتے ہیں۔ مفہوم عبارت کی وضاحت کے لیے، عبارت خوانی کی رفتار کو متدل رکھنا نہایت ضروری ہے۔

۷۔ تعیینِ تاکید

ہر جملے میں ایک لفظ مفہوم کے اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ مفہوم کی وضاحت کے لیے پڑھتے وقت اُس پر زور دینا ضروری ہے۔ اس زور یا تاکید کی بڑی اہمیت ہے۔ کیوں کہ ایک ہی جملے میں، مختلف الفاظ پر زور دینے سے معانی بالکل مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً :-

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی آج سے پہلے مضمون لکھ لینا چاہیے تھا۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی اس سے قبل تو اور لوگ یا اور قسم کے لوگ مضمون لکھا کرتے تھے۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی آج کا دن تو کچھ اور لکھنے یا کچھ اور کرنے کا تھا۔

آج آپ مضمون لکھ رہے ہیں = یعنی پہلے تو لکھوایا کرتے تھے یا آج لکھ رہے ہیں۔

۸۔ اصلی اور تعارفی جملوں میں امتیاز

مکالمے کی بلند خوانی میں ایک اور اصول ملحوظ رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جو جملے مکالمے کی اصل عبارت کو متعارف کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں انھیں نسبتاً دھیمے اور غیر متغیر لحن کے ساتھ ادا کیا جائے۔

۹۔ جملوں کی گروہ پسندی کا لحاظ

عبارت کے صرف وہی جملے بلا توقف یا لگاتار پڑھنے چاہئیں جو معنوی حیثیت سے ربط رکھتے ہوں۔ بالعموم دو تین جملوں میں ربط خاص ہوتا ہے، انھیں جملوں کا ایک گروہ سمجھنا چاہیے۔ ایک کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے چناں چہ ایک ہی پارۂ نثر میں متعدد گروہ ہو سکتے ہیں۔ ہر گروہ کے درمیان نمایاں وقفہ ضروری ہے۔ جب ایک گروہ ختم ہو جائے تو قاری اطمینان سے پورا سانس لے سکتا ہے۔ درمیان میں سانس لینے سے قرأت کے فطری مد و جزر میں فرق آجائے گا اور وہی بے کیفی پیدا ہو گی جو کسی مصرع کے مسکوت ہونے سے پیدا ہوا

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

اُستادوں کی کمی کا عالم گیر مسئلہ

تعلیمی عملے کی کمی پچھلے چند سال میں بری طرح محسوس ہوتی رہی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے بلکہ زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے اور کسی ایک علاقے تک محدود نہیں ہے۔

صحیح قسم کی تعلیم دینے کے لیے جتنے استادوں کی ضرورت ہے اور جتنے دستیاب ہو سکتے ہیں یا جو تربیت پانے کے لائق ہیں ان کی تعداد میں زبردست تفاوت پایا جاتا ہے اور اس زمانے میں خصوصاً اقتصادی اعتبار سے کم ترقی یافتہ ملکوں اور علاقوں میں یہ مسئلہ نازک بن گیا ہے اور سوچا جائے تو دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اسے خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

یہ الفاظ اس رپورٹ میں شامل ہیں جو بین الاقوامی ادارۂ عمال نے ماہرین کی اس جماعت کے لیے مرتب کرائی تھی جس کا ایک خاص اجلاس ۲۰ اکتوبر اور یکم نومبر کے درمیان جنیوا میں استادوں کے بعض اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ رپورٹ میں عام قسم کی اطلاعات شامل ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایجنڈے میں شامل فنی موضوعات کی جانچ پڑتال میں ماہرین کی مدد ہو سکے۔

رپورٹ میں استادوں کی کمی کے بہت سے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ بہت سے ملکوں میں تعلیمی سہولتوں کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئی ہیں اور اس طرح مدرسوں میں طلبا کی تعداد بڑھ گئی ہے دوسرے یہ کہ علاج معالجے اور صحت و صفائی کے میدان میں ترقی نے یقین دلا دیا ہے کہ بچوں کی توقع حیات بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ بحیثیت مجموعی رفتار پیدائش میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔

اگر ان مختلف اسباب کی بنا پر مدرسوں میں طلبا کا اضافہ ثابت ہو جائے تو جزوی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ استادوں کی کمی کیوں محسوس کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت بڑی حد تک رہن سہن اور کام کاج کے

وہ حالات بھی قابل غور ہیں جو استادوں کے لیے فراہم کیے جاتے ہیں اور اکثر صورتوں میں اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے لیے بہت کم رقم صرف کی جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم :- ابتدائی تعلیم کے بارے میں رپورٹ میں لکھا ہے کہ استادوں کی کمی کے مسئلے کو عارضی طور پر حل کرنے کے لیے ان بہت سے ملکوں میں مناسب اقدامات سے کام لیا جا رہا ہے جو عرصے سے صنعتی ترقی کی راہ پر ہیں اور ان ملکوں میں بھی جو اقتصادی اعتبار سے کم ترقی یافتہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ تعلیمی پیشے میں عارضی یا مستقل حیثیت سے ان لوگوں کو شامل کیا جا رہا ہے جن کی لیاقت کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں استادوں کی حقیقی کمی پر اس لیے پردہ پڑ جاتا ہے کہ جماعتوں میں طلباء کی تعداد بڑھا دی جاتی ہے۔ یا استادوں سے فالتو وقت میں مزید کام کرایا جاتا ہے۔

ثانوی تعلیم :- ثانوی تعلیم کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ مناسب لیاقت حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے یہ عام بات ہو گئی ہے کہ وہ استادوں کی حیثیت سے کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیں اور کوئی ایسا پیشہ اختیار کر لیں جو ان کے لیے زیادہ جاذب نظر ہو۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ صنعتی اداروں میں کام کرنے والے فن کاروں کے لیے چوں کہ شرائط روزگار زیادہ قابل قبول ہوتے ہیں یا کم سے کم استادوں کے مقابلے میں بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیے طلباء چاہتے ہیں کہ کسی خاص علم یا فن میں خصوصیت حاصل کرنے کے بعد صنعتی کاروباری اداروں میں چلے جائیں اور استاد نہ بنیں۔

استادوں کی حالت :- رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر لوگوں کو بڑی تعداد میں تعلیمی پیشے کی طرف مائل کرنا ہو اور انھیں یہ موقع نہ دیا جائے کہ ان کی توجہ کسی اور شغل کی طرف مبذول ہو تو اس کے لیے لازمی ہے کہ استادوں کی حیثیت کو بلند کیا جائے اور ان کے حالات سدھار دیے جائیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کریں۔ ان کو وہی سہولتیں، مراعات اور معاوضے دیے جائیں جو دوسرے پیشے اختیار کرنے کی صورت میں ممکن ہو سکتے ہوں۔

اس کے بعد رپورٹ میں استادوں کے روزگار سے متعلق کچھ شرائط درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی

بھرتی، دورانِ ملازمت میں حفاظت۔ ترقی۔ کام کے اوقات اور تعطیلات وغیرہ۔

کام کے اوقات :- استادوں کے کام کے اوقات کے بارے میں رپورٹ میں لکھا ہے کہ عام طور پر لوگوں کا رجحان یہ ہے کہ وہ دوسرے سرکاری ملازمین کے اوقاتِ کار سے اپنے کام کے اوقات کا موازنہ کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مقابلۃً انھیں زیادہ آسائش میسر نہیں ہے۔ ایک استاد کو جس قدر کام کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے نہیں ہو سکتا کہ اس نے روزانہ کتنی دیر کام کیا اور سال کے کتنے دن صرف کیے۔ بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں طلبہ کے ساتھ مغز کھپانے میں اس پر تھکن کا کتنا اثر ہوتا ہے۔ پھر پڑھانا ہی اس کا واحد فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی اسے استادوں کے جلسوں میں شرکت کرنے، عام نظم و نسق کا خیال رکھنے اور طلبا کے والدین سے مراسم پیدا کرنے کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے میدانِ عمل میں جو ترقیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں ان سے باخبر رہنے کے لیے اسے اپنا بھی مطالعہ وسیع کرنا پڑتا ہے، تاکہ جدید ترین خیالات کی ضیا میں شمعِ علم کو روشن رکھا جا سکے۔ ان سب کاموں میں بھی اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے جو کلاس میں طلبا کو تعلیم دینے کے مساوی کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہر ہفتے تعلیم اور حاضری کے اوقات کا اوسط نکالا جائے تو پتہ چلے گا کہ عموماً ابتدائی مدرسوں میں ۲۰ اور ۳۶ گھنٹے کے درمیان، ورثانوی مدرسوں میں ۲۴ اور ۳۰ گھنٹے کے درمیان اور ثانوی مدرسوں میں ۲۴ اور ۳۰ گھنٹے کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔

چند سال ہوئے ریاست ہائے متحدہ میں ایک جائزہ تیار کیا گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ہر ہفتے ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو ۴۷ گھنٹے ۵ منٹ اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کو ۴۷ گھنٹے ۸ منٹ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس مدت میں تعلیم کے علاوہ ان کاموں کا وقت بھی شامل ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اجلاس کا ایجنڈا :- بین الاقوامی ادارۂ عمال کے اجلاس کے ایجنڈے میں پہلی شق کا عنوان تھا۔ استادوں پر اثر انداز ہونے والے معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا عام جائزہ۔ اس کے علاوہ دوسری شقوں کے موضوعات یہ ہیں (۱) اساتذہ کی تنخواہوں کا تعین کرنے کے لیے اصول اور (۲) اساتذہ کے لیے پیرانہ سالی میں پنشن ادا کرنے کے انتظامات سے متعلق اصول۔

ادارے کے اجلاس میں بائیس ملکوں کے جن ماہرین نے حصہ لیا وہ زیادہ تر عموماً استاد یا ایسے خاص تھے جن کو تعلیمی ارباب اقتدار نے نامزد کیا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ ان مسائل پر غور کرنے کے بعد سفارشات پیش کریں تاکہ ادارے کو اس کے کام میں مدد ملے۔ اور ان منصوبوں میں رہنمائی ہو جو اکثر ملکوں میں سرکاری طور پر شروع کیے جا رہے ہیں۔

ماہرین کی سفارشات ادارے کی مجلس انتظامیہ کے سامنے جانچ پڑتال کے لیے پیش کی جائیں گی۔

ایشیا میں یونی سیف کی خدمات

"یونی سیف بچوں اور ماؤں کی تندرستی اور فلاح و بہبود کو ترقی دینے کے لیے دنیا کا سب سے بڑا بین الاقوامی ادارہ ہے۔ یونی سیف کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں بہت سے ملک انسان دوستی کے جذبے کے ماتحت جمع ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد ان بیماریوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا یا ان کی روک تھام کرنا ہے جو بچوں کو بری طرح لاحق ہوتی ہیں۔ ان قوموں کا عقیدہ ہے کہ ایک بیمار شہری نہ تو اپنے خاندان کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور نہ اپنے ملک یا ساری دنیا کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ دوائیں، ٹرک، موٹریں۔ دوا چھڑکنے کے آلات۔ پچکاریاں۔ دائیوں کے سامان کے تھیلے۔ خالص غذا۔ مثلاً دودھ یا مچھلی کا تیل اور فی الحقیقت وہ سب چیزیں جو کسی ملک میں درآمد کرنی ضروری ہوں بہم پہنچاتا ہے"۔

بحرالکاہل اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے ہیں، جسے یونی سیف کے خطہ ایشیا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان ۲۳ ملکوں اور علاقوں کو امداد دی گئی ہے۔

پاکستان۔ افغانستان۔ برما۔ کمبوڈیا۔ سیلون۔ چین (تائیوان) بھارت۔ انڈونیشیا۔ جاپان۔ کوریا۔ ملایا فلپائن۔ تھائی لینڈ۔ ویت نام۔ فیجی جزائر۔ گلبرٹ اور ایلیس۔ ہانگ کانگ۔ نیدر لینڈز نیوگنی۔ نیو ہیبرائڈز، شمالی بورنیو۔ سراوک۔ سنگاپور۔ جزائر سلیمان اور مغربی ساموا۔

یونی سیف کو قائم ہوئے تقریباً دس سال گذرے ہیں۔ اس عرصے میں ساڑھے پانچ کروڑ ڈالر سے زیادہ مالیت کی امداد بچوں کی نگہداشت سے متعلق پروگراموں کے سلسلے میں اس علاقے کو دی گئی ہے۔

دوسرے کم ترقی یافتہ علاقوں میں یونی سیف کے کارناموں کی طرح ایشیا میں بھی اس کی امداد کو متعدد ...

مدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) بیماریوں کی روک تھام (ب) ماؤں اور بچوں کی صحت و تندرستی (ج) غذائی بہتری (د) ہنگامی امداد۔

(ا) **بیماریوں کی روک تھام**:۔ بیماریوں کی روک تھام کے ضمن میں، ملیریا کی روک تھام اور اس کا استیصال تپ دق۔ خارش۔ نزول الماء۔ جذام اور مرض گھینگا کی روک تھام قابل ذکر ہیں۔

ملیریا:۔ بعض دوسری بیماریوں کی بہ نسبت ملیریا سے مرنے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملیریا میں مبتلا ہونے والوں کی قوت مقابلہ کم ہو جاتی ہے اور وہ اس منزل میں آجاتے ہیں جہاں دوسری بیماریاں اپنا رنگ جمالیتی ہیں۔ ملیریا زدہ علاقے میں رہنے والے لوگ معمولی معیار زندگی پر گذارہ کرتے ہیں اور اس طرح مفاد مشترک میں پوری طرح حصہ نہیں لے سکتے۔ بیماری کے اقتصادی اور معاشرتی مذموم نتائج سب کو معلوم ہیں۔ یہ تحقیق ہونے کے بعد سے کہ ملیریا مچھروں کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے تک پوری نصف صدی میں، ملیریا کی روک تھام کا کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں ہو سکا ہے جو کم خرچ ہو۔ کیڑے مار سفوف تیار ہونے کے ساتھ ساتھ پتہ چلا کہ اگر گھروں کی اندرونی دیواروں پر یہ سفوف اچھی طرح چھڑک دیا جائے تو ملیریا کی روک تھام ممکن ہے۔ ان دیواروں پر ملیریا پھیلانے والا مچھر انسانوں اور جانوروں کا خون چوسنے سے پہلے اور اس کے بعد بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا ان دیواروں پر اگر سفوف چھڑک دیا جائے تو مچھر وقت سے پہلے مر جاتے ہیں اور دوسرے انسانوں میں ملیریا کے جراثیم منتقل کرنے کا موقع انھیں نہیں ملتا۔ بیماری کی منتقلی کو روک دینے سے ملیریا کا یکسر استیصال ممکن ہو سکتا ہے۔

ملیریا کے خلاف جد و جہد کرنے میں یونی سیف نے افغانستان، برما، نیدرلینڈ، نیوگنی اور شمالی بورنیو کو ڈی ڈی۔ ٹی سفوف۔ گاڑیاں۔ پچکاریاں اور ادویات فراہم کی ہیں۔ یونی سیف نے آلات و سامان فراہم کر کے ڈی ڈی ٹی بنانے کے دو کارخانے بھی قائم کر دیے ہیں ان میں سے ایک بھارت میں اور دوسرا پاکستان میں ہے۔

خارش:۔ ایک قسم کی خارش جو عام طور پر یَوز کہلاتی ہے۔ صرف گرم علاقوں میں پائی جاتی ہے اس سے انسان مرتا نہیں بلکہ اپاہج اور بدشکل ہو جاتا ہے۔ اگر جسم کے کسی حصے پر خراش آجائے تو اس بیماری کے جراثیم کھال کے ذریعہ سرایت کر جاتے ہیں۔ پھر جلد پر پھنسیاں وغیرہ نمودار ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کا اثر ہڈی تک پہنچ

ہے جب کسی شخص کے تلووں پر یہ خارش ہو تو وہ چل پھر نہیں سکتا اور اگر ہتھیلیوں پر اثر ہو تو کام کاج نہیں کر سکتا
اگر لاپرواہی برتی جائے تو وہ ساری عمر کے لیے اپاہج ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری زیادہ تر دیہات کے علاقوں میں
پھیلتی ہے جہاں صحت و صفائی کے انتظامات ناپید ہوتے ہیں۔ پنسلین کا ایک انجکشن جس کی قیمت تقریباً
ڑھے نو آنے ہوتی ہے ایسی خارش کے ایک مریض کو تندرست کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ مرض ابتدائی منزل میں
علاقہ ایشیا میں یونی سیف نے گیارہ حکومتوں کو ان کی مہموں میں امداد دی ہے۔ ساڑھے گیارہ کروڑ
زیادہ انسانوں کا جو زیادہ تر انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کے باشندے ہیں معائنہ اور مکرر معائنہ ہوا ہے
تقریباً نوے لاکھ کا باقاعدہ علاج ہوا ہے۔

تپ دق :- تپ دق ایک بہت ہی شدید قسم کی متعدی بیماری ہے جو ہر عمر کے انسان پر حملہ
ہے لیکن بچے اور نوجوان زیادہ تر اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایشیا کے گنجان آباد شہروں میں دق کا
بہت عام ہے۔ اس کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ بہت عرصے تک ہسپتال میں قیام کیا جائے
طرح تیمارداری ہو اور مہنگی دوائیں اور غذائیں استعمال ہوں جو اوسط درجے کے ایشیائی باشندوں
بے ممکن نہیں ہیں۔ یونی سیف نے تپ دق کی تشخیص کے مرکز قائم کرانے کے علاوہ بی سی جی کے ٹیکے لگانے
کام میں بھی ایشیا کے ۱۸ ملکوں کو امداد دی ہے۔ اب تقریباً ۹ کروڑ نوجوانوں کا معائنہ ہوا ہے اور
ڑ۔ لاکھ سے زیادہ کے ٹیکے لگائے گئے ہیں۔ گیارہ ملکوں کو اب بھی اس ضمن میں یونی سیف کی امد
ہی ہے۔ تپ دق کے انسداد کے لیے جو نئی دوا آئی سونیازڈ ایجاد ہوئی ہے وہ بھی اس بیماری کے
ج کے سلسلے میں ایشیا کی چار حکومتوں کو فراہم کی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ یہ دوا یا اور ایجاد ہونے والی
دوایات دق کے علاج میں موثر اور شفا بخش ثابت ہوں گی۔

نزول الماء :- دنیا میں جو بیماریاں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہیں ان میں ایک آنکھوں کی
نزول الماء ہے۔ ایشیا کے لاکھوں انسان خصوصاً بچے اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کا سبب ایک
ہے۔ نزول الماء سے پپوٹوں کی اندرونی سطح پر تکلیف دہ ورے پڑ جاتے ہیں جو بعد میں زخم کی صورت
کر لیتے ہیں اور آنکھ کا نقشہ بگڑ جاتا ہے اور اکثر لوگوں کی بصارت جاتی رہتی ہے۔ عموماً شیرخوارگی امد

بچپن کے زمانے میں یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔

اس بیماری کے خلاف جدوجہد کرنے میں یونی سیف۔ تائیوان۔ بھارت اور انڈونیشیا کی مدد کر رہا ہے۔ تائیوان میں اندازاً بیس لاکھ بچوں کا معائنہ ہوا ہے اور تقریباً پانچ لاکھ کا علاج ہو چکا ہے۔

جذام:۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والے خوف اور شرم کے مارے اپنا حال بیان کرنے سے اجتناب کرتے ہیں اسی لیے اس خوفناک بیماری سے متعلق صحیح اعداد و شمار جمع نہیں ہو سکے۔ جذام کا حملہ بھی زیادہ تر بچپن میں ہوتا ہے۔ لیکن اس بیماری کے جراثیم کو پروان چڑھنے میں دس سال یا اس سے بھی زیادہ مدت لگ جاتی ہے۔ اس مرض کو دور کرنے کے لیے یونی سیف بڑے پیمانے پر تھائی لینڈ، برما، فلپائین اور انڈونیشیا کی حکومتوں کو امداد دے رہا ہے۔

گھینگا:۔ غذا میں خرابی یا کمی کے باعث عام طور پر گھینگا نامی بیماری پیدا ہوتی ہے، اور ایشیا کے اکثر دیہی علاقوں میں اس کے حملے عام ہیں۔ یونی سیف نے بھارت کو آلات و سامان فراہم کیا ہے تاکہ ایک خاص قسم کا نمکین مرکب تیار کیا جا سکے جو اس مرض کو دور کرنے کے لیے مفید ہوتا ہے۔

(ب) ماؤں اور بچوں کی صحت و تندرستی:۔ یونی سیف کے وسائل کا بہت بڑا حصہ ایشیا میں ماؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص ہے۔ دیہات کی ماؤں اور بچوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اگر یونی سیف کے ایشیائی علاقہ میں صحت و تندرستی کے خیال سے ہر دس ہزار انسانوں کے لیے ایک مرکز قائم کیا جائے تو ایسے ۷۵ ہزار مرکزوں کی ضرورت ہوگی۔ فی الحال ان کی تعداد پندرہ اور سترہ ہزار کے درمیان ہے۔

(ج) غذائیات:۔ ایشیا میں غذائی معیار بہت ہی پست ہے۔ بیشتر بچوں اور ان کی ماؤں کو ایسی غذا میسر نہیں آتی جس میں لحمی اجزا کافی مقدار میں ہوں۔ یونی سیف کی طرف سے خشک دودھ عام طور پر مدرسوں، صحتی مرکزوں، ہسپتالوں اور دوسرے اداروں کے ذریعہ تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

(د) ہنگامی امداد:۔ اگرچہ یونی سیف نے اب اپنی توجہ طویل المدت پروگراموں پر مبذول کر رکھی ہے تاہم ہنگامی حالات میں اگر کبھی اس سے استدعا کی جائے تو اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سیلاب آنے، قحط پڑنے یا فصلوں کو نقصان پہنچ جانے کی صورت میں امداد دی جاتی ہے۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش

۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

[شمارہ ۹ ، ۱۰] **لاہور** [دسمبر ۱۹۵۸]

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین } عبدالغفور چو

تعلیمی ماہ نامہ

JAMIA LIBRARY
DELHI

آموزش

لاہور

دسمبر ۱۹۵۸ء

…د —— ۱۱

…ارہ —— ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈمی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

پرائیویٹ سکولوں کا مسئلہ

ایم۔ اے مخدومی

آزادی کی آمد کے بعد ہر قسم کی تعلیم کی مانگ جس تیزی سے بڑھی ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے میٹرک کے امتحان میں شریک ہونیوالے امیدواروں کی تعداد سال بسال جس رفتار سے بڑھ رہی ہے وہ تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ کا ایک اچھا خاصہ آئینہ ہے۔ پچھلے دس گیارہ برس میں یہ تعداد کوئی انیس ہزار سے بڑھ کر ساٹھ ہزار کے لگ بھگ جا پہنچی ہے۔

تعلیم کی یہ روز افزوں مانگ ایک اعتبار سے نہایت خوش آئند چیز ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ملک میں علم کی روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے اور پاکستان کے آئندہ شہری زندگی کے مسائل زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ حل کر سکیں گے۔ لیکن معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ کیا تعلیمی سہولتیں بھی اسی تیزی سے بڑھ رہی ہیں جس تیزی سے تعلیم کی مانگ؟ اگر ایسا نہیں تو غالب یہ ہے کہ بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کو موزوں قسم کی تعلیم نہیں مل رہی۔ بے شک وہ میٹرک کے امتحان میں بیٹھتے اور اس میں سے نکل بھی جاتے ہیں۔ لیکن جس قسم کی تعلیم و تربیت انھیں میٹرک کی سند دلاتی ہے وہ شاید پسندیدہ قسم کی نہیں۔

اصل صورت حال فی الواقعہ یہی ہے۔ ثانوی تعلیم کی مانگ اس تیزی سے بڑھی ہے کہ نئے کھلنے والے مدرسے اس ضرورت کے مقابلے میں بالکل ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ حکومت نے بہت سے نئے ہائی سکول خود قائم کیے ہیں۔ کچھ نئے ہائی سکول لوکل باڈیوں اور عوامی انجمنوں نے بھی کھولے ہیں۔ لیکن اپنے بہترین ارادوں کے باوجود یہ منظور شدہ ہائی سکول اپنے آپ کو ہر سال اس بات پر مجبور پاتے ہیں کہ سینکڑوں طلبہ کو اپنے ہاں داخل کرنے سے انکار کر دیں۔ ان طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے شہروں اور قصبوں میں جگہ جگہ پرائیویٹ مدرسے کھل گئے ہیں

یہ مدرسے منظور شدہ نہیں کیوں کہ وہ عموماً عمارت۔ ساز و سامان۔ اساتذہ کی تعلیمی قابلیت غرض کسی لحاظ سے بھی مقررہ معیاروں پر پورے نہیں اترتے۔ ان کی حیثیت عام حالتوں میں کاروباری اداروں سے زیادہ نہیں۔ وہ والدین اور طلبہ کی ایک ناگزیر ضرورت کے پیش نظر اپنا کاروبار جاری کرتے ہیں۔ وہ جو فیسیں مناسب سمجھیں وصول کرتے ہیں اور امتحانی نتائج کے بل بوتے پر اپنے کام کو ترقی دیتے ہیں۔

اس قسم کے پرائیویٹ سکولوں کے متعلق بعض لوگوں کو شدید شکایات ہیں۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ یہ مدرسے تعلیم و تربیت کے مقررہ لوازمات کے معاملے میں کسی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ فیسوں اور چندوں کے معاملے میں وہ بعض اوقات ایسی ایسی زیادتیاں کر گذرتے ہیں جن سے عوام کو حقیقی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اس صورت حال کا علاج بعض لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ پرائیویٹ مدرسے قانوناً بند کر دیے جائیں۔ یا کم از کم انھیں اس حد تک حکومت کی نگرانی میں لے آیا جائے کہ وہ تعلیم کو تجارت کا ذریعہ نہ بنا سکیں۔

تعلیم کو تجارت کا ذریعہ بنانا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن پرائیویٹ سکولوں پر بحث کرتے وقت ہمیں یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ وہ ایک حقیقی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا ان کے متعلق بہترین طریق کار ان کی اصلاح ہے نہ کہ ان کا فوری خاتمہ۔ اصلاح کا کام لامحالہ حکومت کے ہاتھوں انجام پانا چاہیے جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ پرائیویٹ سکولوں پر کسی نہ کسی قسم کی نگرانی قائم کی جائے تاکہ وہ تعلیمی لوازمات اساتذہ کی قابلیت اور فیسوں کی شرح کے معاملے میں مقررہ معیاروں سے حتی الامکان قریب تر لائے جا سکیں جب تک قومی بجٹ تنہا پوری تعلیم کا سارا بوجھ خود اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا اس وقت تک نجی تعلیمی کوششوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی رہنمائی ہی بہترین طریق کار رہے گا۔

امریکی اور روسی نظامِ تعلیم کا موازنہ

فضل احمد

فتح کی قیمت جب سے روس نے مصنوعی چاندوں اور خلائی سفر کے معاملے میں اپنی ڈرامائی برتری کا مظاہرہ کیا ہے، روسی نظامِ تعلیم دنیا کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ کیوں کہ آخری تجزیے میں ہر قسم کی ترقی اور پیش قدمی کا انحصار کسی قوم کے نظامِ تعلیم پر ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مغربی ممالک سے سائنس اور ٹکنالوجی کے سبق سیکھنے کے لیے روسی حکمرانوں نے حیرت انگیز چابک دستی سے کام لیا ہے۔ مثلاً جرمنی پر روسی قبضہ ہو جانے کے بعد روسی حکمرانوں نے پہلی توجہ اس بات پر صرف کی کہ چوٹی کے جرمن سائنس دانوں اور فنی ماہروں کو مٹھی میں لیا جائے۔ یہ مقصد مغربی طاقتوں کے پیشِ نظر بھی تھا۔ مگر جس وارفتگی کے ساتھ روسیوں نے جرمن سائنس دانوں کی تلاش کی وہ انھی کا حصّہ تھا۔ جرمن سائنس دان خیال کیے بیٹھے تھے کہ روسی انھیں جی بھر کر زچ کریں گے۔ مگر روسی افسروں کے برتاؤ نے انھیں دم بخود کر دیا۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جو روسی افسر انھیں ملنے آئے وہ بلا تکلف جرمن زبان میں بات چیت کرتے تھے اور بڑے ادب سے پیش آتے تھے۔ جرمن سائنس دانوں اور فنّی ماہروں کو قدرتی طور پر مستقبل کی فکر تھی۔ اعلیٰ روسی افسروں نے ان کی دل جوئی کی اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ انھیں اسی کام میں مصروف رہنے دیا جائے گا جس کے لیے وہ زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔ انھیں گراں قدر مشاہرے پیش کیے گئے اور جرمنی میں ہی ایسے سائنسی اور فنّی مراکز قائم کر دیے گئے جہاں وہ تحقیقی کام جاری رکھیں۔

جرمنی کے بہترین دماغوں کو رام کر لینے کے بعد ایک صبح اچانک ماسکو جانے کا حکم دیا گیا اور ان کے وہاں پہنچنے تک ان کی تجربہ گاہیں بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ہر جرمن سائنس دان کے ساتھ ایک روسی لگا دیا گیا تاکہ وہ اس کا کام کرنا سیکھ جائے۔ اس طرح جرمنی پر فتح پا لینے کے جلد ہی بعد روس میں ماہروں کی ایک ایسی جماعت تیار

ہو گئی جو راکٹ کے معاملے میں وہ سب کچھ جانتی تھی جو مغربی ملکوں کو معلوم تھا۔ یہ تھی وہ قیمت جو روس نے جرمنی سے وصول کی۔ اس بنیاد پر روس نے چند ہی برس میں سائنسی پیش قدمی کی جو عمارت تیار کی وہ آج دنیا کے سامنے ہے تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے مغربی راز معلوم کرنے کا سہرا اگر روسی ڈپلومیسی کے سر ہے تو ان رازوں سے بھرپور خدمت لینے کا کام روسی نظام تعلیم نے انجام دیا ہے ۔

بنیادی فلسفے کا موازنہ

بہر نوع سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں روس کی ہوش ربا ترقی نے روسی نظام تعلیم کو دنیا کی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ پچھلے چند برس میں اس کے متعلق جس قدر لکھا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہ لکھا گیا تھا۔ اس موضوع پر سب سے زیادہ لٹریچر غالباً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیار ہوا ہے، وجہ یہ کہ امریکہ کو نہ صرف آزاد دنیا کی رہنمائی کا مقام حاصل ہے، بلکہ سائنسی تحقیق کے میدان میں بھی امریکہ ایک عرصے سے دنیا کا امام چلا آرہا ہے اس چیز نے امریکہ کو مجبور کیا کہ اپنے نوخیز حریف کے تعلیمی نظام کا اچھی طرح جائزہ لے۔ مگر امریکہ میں جو کتابیں اور مضامین اس موضوع پر لکھے گئے ہیں وہ عام حالتوں میں روسی تعلیم کا خاکہ کھینچنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ روسی اور امریکی تعلیم کے معنی خیز موازنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حال ہی میں ایک امریکی ماہر تعلیم نے اس قسم کا ایک مختصر سا موازنہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں اس موازنے کے بنیادی پہلو درج کیے جا رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی اور روسی تعلیم کے تمام اختلافات زندگی کے مختلف فلسفوں کی پیداوار ہیں۔ روس ایک ایسا ملک ہے جہاں صرف ایک ہی فلسفۂ زندگی کی مکمل حکمرانی ہے۔ یہاں کسی دوسرے فلسفۂ حیات کے سر اٹھانے کا سرے سے کوئی سوال نہیں۔ اس کے برعکس امریکہ آزادئ خیال کا گہوارہ ہے۔ یہاں نہ صرف مختلف اور متضاد فلسفہ ہائے حیات کے لیے ایک ساتھ رہنا ممکن ہے۔ بلکہ وہ حقیقی طور پر موجود ہیں۔ یہ وہ بنیادی فرق ہے جس نے دونوں ملکوں کے تعلیمی نظاموں کو مختلف شکلیں دی ہیں۔

بنیادی اختلافات

نظریہ حیات کے اس بنیادی اختلاف سے امریکہ اور روس کے تعلیمی نظاموں میں جو تباین پیدا ہوا ہے، اسے ذیل کی اہم شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **نظم و نسق**:۔ امریکی نظام تعلیم کا ایک نمایاں پہلو اس کا کسی مرکزی نگرانی سے پورے طور پر آزاد ہونا ہے۔ یہ روایت نوآبادیاتی زمانے سے چلی آتی ہے۔ ہر بستی اور ہر آبادی تعلیم کو ہمیشہ اپنی مقامی ذمہ داری خیال کرتی رہی ہے اور یہ صورت حال بدستور باقی ہے۔ امریکہ کی ہر ریاست بہت سے تعلیمی اضلاع میں بٹی ہوئی ہے اس ضلع میں بسنے والے شہری اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے ہیں، وہ اس مطلب کے لیے ٹیکس لگا کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ مدرسے قائم کرتے ہیں۔ بچوں کو مدرسے میں لانے کے لیے بسوں کا بندوبست کرتے ہیں اور تعلیمی معاملات کا انتظام کرنے کے لیے ایک تعلیمی بورڈ منتخب کرتے ہیں۔ یہ تعلیمی بورڈ اپنے مشیر کے طور پر ایک سپرنٹنڈنٹ آف سکولز مقرر کرتا ہے۔ غرض مدرسے کی تعلیم کلی طور پر مقامی آبادی کے اپنے ہاتھ میں رہتی ہے۔ ہر ریاست میں ایک محکمہ تعلیم بھی موجود ہے۔ مگر اس محکمے کی حیثیت محض مشیر کی ہے اسی طرح مرکزی حکومت نے بھی ایک محکمہ تعلیم مقرر کر رکھا ہے۔ مگر اس کا کام بھی محض فنی رہ نمائی اور مشورہ ہے امریکی ریاستیں اپنی تعلیمی خود مختاری کی اس حد تک حریص ہیں کہ بعض اوقات وہ مرکزی حکومت سے محض اس بنا پر مالی امداد قبول کرنے سے پہلوتہی کرتی ہیں کہ اس سے مرکزی حکومت کو ریاست کے تعلیمی معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جائے گا۔

اس کے مقابلے میں روسی مدارس بالواسطہ مرکزی قیادت کی زیر نگرانی ہیں۔ سوویٹ یونین ۱۵ جمہوریتوں پر مشتمل ہے ان میں سے ہر جمہوریہ کی اپنی الگ وزارت تعلیم موجود ہے۔ سرکاری طور پر ہر جمہوریہ کی وزارت تعلیم اپنے معاملات میں خود مختار ہے۔ مگر یہ خود مختاری محض نام کی ہے۔ کیوں کہ تمام تعلیمی وزارتوں کے اوپر مرکزی کمیونسٹ پارٹی کی تعلیمی کمیٹی موجود ہے۔ جو ان وزارتوں کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرتی اور ان کے کام کی نگرانی کرتی ہے۔ اس طرح روس کے ابتدائی اور ثانوی مدرسے جن کی مدت تعلیم دس سال ہے۔ براہ راست ایک مرکزی نگران ادارے کی رہ نمائی میں کام کرتے ہیں۔

اس صورت حال کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں امریکہ میں مدرسوں کی باگ ڈور عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہے، روس میں یہ باگ ڈور تعلیمی ماہروں کے سپرد ہے۔ امریکی سکول بورڈ کے اراکین عام شہری ہوتے ہیں جنھیں تعلیم میں دلچسپی ہوتی ہے مگر مرکزی کمیونسٹ پارٹی کی سکول کمیٹی غالباً ماہرین تعلیم پر مشتمل ہے ۔

مدرسوں سے آنکھ اٹھا کر جب اعلیٰ تعلیم کی طرف دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی فرق نمایاں نظر آتا ہے امریکی یونیورسٹیاں، کالج اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے ادارے بیسیوں قسم کے ہیں۔ ان میں سے بعض ادارے مرکزی حکومت کے ہیں۔ کئی ایک ریاستی حکومتوں کے کئی کلیسا کے اور کئی پرائیویٹ انجمنوں کے۔ ان اعلیٰ تعلیمی اداروں نے باہم مل کر علاقائی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ ان تنظیموں کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے عمارت، سازوسامان اور اساتذہ کے متعلق بعض مقررہ معیار پورے کرنے پڑتے ہیں۔ جو یونیورسٹی یا کالج یہ معیار پورے کر دے اسے دوسرے ہر قسم کے معاملات میں پوری آزادی حاصل رہتی۔

سوویٹ یونین میں اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی مدرسوں کی طرح مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ روس کے اعلیٰ تعلیمی ادارے دو طرح کے ہیں (۱) وہ ادارے جو وزارت اعلیٰ تعلیم چلا رہی ہے (۲) وہ ادارے جو مرکزی یا مختلف ریاستی وزارتیں اپنی مخصوص ضرورتیں پوری کرنے کے لیے چلا رہی ہیں۔ پہلی قسم کے اداروں میں روس کی اکتیس یونیورسٹیاں اور کم و بیش ۳۰۰ انسٹی ٹیوٹ ہیں، جو ٹکنالوجی، زراعت اور جنگلات وغیرہ کے متعلق اعلیٰ نصاب پیش کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے اداروں میں کوئی پانچ سو انسٹی ٹیوٹ شامل ہیں، یہ ادارے بھی کالج کے درجے کی تعلیم دیتے ہیں اور طب، علم التعلیم وغیرہ کی خصوصی تربیت دیتے ہیں۔

(۲) **ساخت کا فرق**:- امریکی اور روسی نظام تعلیم کا انتظامی فرق دونوں کی ساختوں میں بھی فرق پیدا کرتا ہے۔ امریکی مدرسے کی نگرانی کلی طور پر سکول بورڈ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ بورڈ مقامی نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے ہر سکول بورڈ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ آیا مدرسہ ۸ – ۴ قسم کا ہو یا ۶ – ۳ – ۳ قسم کا۔ پہلی صورت میں پرائمری مدرسہ ۸ سالہ اور ثانوی ۴ سالہ ہوگا۔ دوسری صورت میں پرائمری ۶ سالہ، جونیئر ہائی سکول ۳ سالہ اور سینئر ہائی سکول ۳ سالہ۔ اس بات کا فیصلہ بھی سکول بورڈ کرتا ہے کہ آیا پرائمری جماعتوں سے پہلے کنڈرگارٹن جماعتیں بھی جاری کی جائیں یا نہ۔ نیز نصاب مدرسہ کا فیصلہ بھی سکول بورڈ کی مرضی پر موقوف ہے۔ ہر سکول بورڈ مقامی ضرورتوں کو دیکھ کر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے ماتحت چلنے والے مدرسے یا مدرسوں میں کون کون سے مضامین پڑھائے جائیں۔ غرض امریکی مدرسوں میں تنظیم اور نصاب کے اعتبار سے وسیع اختلافات موجود ہیں۔ ان مدرسوں میں اگر کوئی یکسانیت نظر آتی ہے تو محض اس لیے کہ کالج میں داخلے کی شرائط یا اس قسم کی دوسری عملی ضرورتیں کسی نہ کسی حد تک یکسانیت کا

مطالبہ کرتی ہیں۔

اگر امریکی مدرسوں کا خاصہ ان کی رنگارنگی ہے تو روسی مدرسوں کا خاصہ ان کی یکسانیت ہے۔ سوویٹ یونین کی سولہ کی سولہ جمہوریتوں میں تعلیم کی تنظیم ایک سی ہے۔ قبل از پرائمری مدرسہ کے لیے کنڈرگارٹن مدرسہ ہے جس میں سات سے دس برس کی عمر کے بچے پڑھتے ہیں۔ پرائمری مدرسہ چار سالہ ہے جس میں سات سے دس برس کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ اس کے آگے ثانوی مدرسہ ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ نامکمل ثانوی مدرسہ صرف پانچویں سے ساتویں جماعت تک تعلیم دیتا ہے۔ مگر ایک مکمل ثانوی مدرسہ ان تین جماعتوں کے علاوہ آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح ثانوی مدرسے کی تعلیم سولہ برس کی عمر میں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک عام روسی نوجوان سترہ برس کی عمر میں ثانوی تعلیم ختم کر لیتا ہے۔ روس کی اکتیس یونیورسٹیوں میں تمام تعلیم بارہ شعبوں میں منقسم ہے۔ مگر صرف ماسکو کی یونیورسٹی ایسی ہے جس میں یہ بارہ کے بارہ شعبے موجود ہیں باقی تیس یونیورسٹیوں میں تعلیم کے تمام شعبے موجود نہیں۔

(۳) نظام کار :- امریکی مدرسوں کو اس بات پر فخر ہے کہ انھیں اپنا نظام کار طے کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ ہر مدرسہ بلکہ ہر استاد اس بات کی پوری آزادی رکھتا ہے کہ نصاب مدرسہ کو جس طرح چاہے مکمل کرے۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی مدرسے میں کام کرنے والے دو استاد جو ایک ہی جماعت کے دو فریقوں کو پڑھا رہے ہوں، اپنا اپنا الگ طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں روسی مدرسوں کا نظام کار چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک بھی ایک ہی نہج پر چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ملک بھر میں ایک ہی نصاب رائج ہے اور اس نصاب کی جزئیات اس حد تک طے شدہ ہیں کہ کسی خاص دن کے کسی خاص وقت پر ملک بھر کے مدرسوں میں کوئی ایک جماعت کسی ایک مضمون کا ایک خاص حصہ پڑھتی ہوئی دیکھی جا سکتی ہے۔ استادوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ مقررہ نصاب یا اس کی طے شدہ تفصیلوں سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہٹیں۔

روسی تعلیم کی یہ یکسانیت آگے چل کر نظریاتی ہم آہنگی کو تقویت دیتی ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ علوم و فنون یا سائنسی تحقیق کسی ایسے نظریے کو سہارا نہ دے جو مارکس اور لینن کے فلسفے سے ٹکراتا ہوا دکھائی دے۔ گویا ہر قسم کے سائنسی علوم کو اس فلسفے کے تابع رکھا گیا ہے جس پر روسی حکومت

کی بنیاد قائم ہے۔ سائنسی تحقیق و جستجو کے میدان میں اس قسم کا نظریاتی ضبط آزادی فکر و عمل کے لیے زنجیر ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اس بارے میں ابھی کوئی قابل اعتماد شہادت ہاتھ نہیں لگ سکی۔ تاہم یہ امر بہت معنی خیز ہے کہ روسی ماہرین تعلیم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا ہوا ہے کہ ذہانت کی آزمائشیں بہترین قومی مفاد کے منافی ہیں۔

امریکی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ علمی آزادی امریکی پروفیسر کا ایک ایسا مقدس حق سمجھا جاتا ہے جس سے وہ کسی صورت میں دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ علمی آزادی سے مراد یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کو یہ حق حاصل ہے کہ حق و صداقت کی تلاش میں ہر قسم کے مسائل کا بے لاگ تجزیہ کریں اور ہر قسم کے سیاسی اور معاشی دباؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مطالعہ کے نتائج لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا یہ حق ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے، اور ان لوگوں نے اپنا یہ حق سائنسی اور علمی تحقیق کے میدانوں میں جی کھول کر استعمال کیا ہے۔

(۴) **تبدیلی کی نوعیت** :- نظام تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کا پیدا ہونا اگزیر ہے۔ اس قسم کی تبدیلی امریکی نظام تعلیم میں بھی ہوتی رہتی ہے اور روسی نظام تعلیم میں بھی، مگر دونوں صورتوں میں تبدیلی کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔

امریکی نظام تعلیم میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ فلسفہ تعلیم میں تبدیلی پیدا ہونے سے ظہور میں آتی ہیں۔ ماہرین تعلیم جب حقائق و شواہد کی روشنی میں فلسفہ تعلیم میں کوئی تبدیلی ضروری سمجھتے ہیں تو اس کے حسب حال نئے طریقہ ہائے تدریس تجویز کرتے ہیں اور نصاب میں رد و بدل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں تجربتاً کچھ مدرسوں میں آزمائی جاتی ہیں۔ ان تعلیمی تجربوں کے نتیجے تعلیمی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ دوسرے اساتذہ ان نتائج کی پرکھ اپنے مخصوص ماحول میں کرتے ہیں۔ اس طرح نئے تعلیمی تجربوں کا پورے طور پر عملی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر نصاب اور طریقہ ہائے تدریس کی یہ تبدیلیاں مستند درجہ حاصل کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکی نظام تعلیم میں جو تبدیلی آتی ہے، رفتہ رفتہ آتی ہے یک دم نہیں آ جاتی۔

اس کے برعکس روسی نظامِ تعلیم میں جو تبدیلی آتی ہے فوری انقلاب کی شکل میں آتی ہے۔ وہ نہ صرف یکدم آتی ہے بلکہ مکمل تشکل میں آتی ہے۔ مثلاً ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک روسی حکمرانوں کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ کمیونسٹ پارٹی سکولوں کو پورے طور پر مٹھی میں کر لے۔ دوسرے لفظوں میں مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں کو علوم پڑھانے کی بجائے انھیں اشتراکی عقائد سکھائے جائیں۔ چناں چہ بہ یک قلم درسی کتابیں ختم ہو گئیں۔ جماعتی تدریس کا خاتمہ ہو گیا۔ طلبہ کو کام دینا بند کر دیا گیا۔ پاس فیل ہونے کا سوال سرے سے ختم کر دیا گیا۔ جب حکومت کو اطمینان ہو گیا کہ نئی پود پورے طور پر اشتراکی عقاید کی گرفت میں آ چکی ہے تو ۱۹۳۲ء میں تعلیمی پالیسی میں یکدم ایک اور انقلاب آ گیا۔ تعلیمی مقاصد از سرِ نو مقدم ہو گئے اور موجودہ نظامِ تعلیم کی داغ بیل پڑ گئی۔

(۵) **مقصد کی نوعیت :-** بنیادی فلسفہ زندگی کے اختلافات نے امریکی اور روسی تعلیم کے مقصد میں بین فرق پیدا کر دیا ہے۔ جہاں امریکی تعلیم کا پہلا مقصد انفرادیت کی نشوونما ہے روسی تعلیم کا پہلا مقصد اجتماعی بہبود کی ترقی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ امریکی تعلیم کو اجتماعی بہبود سے کچھ سروکار نہیں۔ ہر معاشرہ تعلیم کو اپنے دوام کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہ تعلیم کی مدد سے اپنی مخصوص اجتماعی زندگی کو ابدیت بخشنا چاہتا ہے۔ لیکن امریکی تعلیم یہ مقصد بالواسطہ طور پر حاصل کرتی ہے۔ وہ فرد کی ہمہ جہتی ترقی کو اجتماعی بہبود کا ذریعہ بناتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ فرد کی صلاحیتیں اس طرح بڑھیں اور پھلیں پھولیں کہ وہ ان سے بھرپور خدمت لے اور یوں انفرادی منفعت کی تلاش میں ہی وہ دوسروں کی بھلائی کا ذریعہ بھی بنے۔

انقلاب روس ایک نیا معاشرہ پیدا کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے خونی انقلاب کے بعد روسی حکمرانوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اشتراکی معاشرے کو جنم دینے اور اسے مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنے کی کیا صورت ہو۔ انھوں نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے تعلیم کو ذریعہ بنایا۔ اوپر کہا گیا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک روسی تعلیم نے سارا زور اس بات پر صرف کیا کہ اشتراکی عقاید نئی پود کے رگ و ریشے میں بس جائیں۔ روسی تعلیم آج بھی اس مقصد سے غافل نہیں۔ اس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ روس کے ہر شہری کو ایک سچا انقلابی بنایا جائے۔ یہ مقصد بڑی کامیابی سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں نے روسی تعلیم کا قریب سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح ایسے نوجوان پیدا کر رہی ہے جو اشتراکی نظریہ حیات میں مذہبی

جنون کا سا یقین رکھتے ہیں اور ایک اس نظریے کی اشاعت کے لیے کتنا قوی تبلیغی جذبہ رکھتے ہیں۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ روسی تعلیم فرد کی نشو و نما کو کچھ اہمیت نہیں دیتی۔ وہ فرد کی بھرپور ہمہ جہتی ترقی کی قائل ہے۔ مگر وہ اس انفرادی نشو و نما کو اجتماعی سالمیت کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔

(۶) تعلیم کے تصور میں فرق :۔ مدرسے اگرچہ نئی پود کو تعلیم دینے کے لیے قائم کیے جاتے ہیں لیکن مدرسوں سے باہر بیسیوں قسم کے عوامل بچوں کے ذہنوں پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ گرجے یا مسجد کا وعظ۔ اخبارات۔ اشتہارات۔ ریڈیو۔ سینما۔ تھیئٹر۔ ٹیلی وژن۔ اخبارات، رسالے یہ تمام چیزیں خیالات کی نشر و اشاعت کے ذریعے ہیں۔ اور وہ لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

امریکی تعلیم اگرچہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ نئی پود درست قسم کے خیالات اور جذبات اخذ کرے لیکن مدرسے باہر دوسرے طاقتور عوامل بھی اپنے اپنے طور پر ذہنوں کو متاثر کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچے اور نوجوان لبسا اوقات غلط قسم کے خیالات اور جذبات اخذ کر لیتے ہیں۔ امریکہ میں کوئی ایسا طاقتور مرکزی ادارہ موجود نہیں جو ہر قسم کے تعلیمی عوامل کو ہم آہنگ کیے رکھے۔ مدرسہ ایک محدود میدان میں کام کیے جاتا ہے۔ اس میدان سے باہر کئی اور قوتیں بھی مصروف عمل ہیں جن کا کام بعض اوقات مدرسے کے کام سے کچھ مناسبت نہیں رکھتا۔

اس کے مقابلے میں روسی تعلیم کا تصور بے حد کشادہ ہے۔ روس میں ہر اس چیز کو تعلیم کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے جو انسانوں کے خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنے والی ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ ہو یا سینما یا ریڈیو یا اخبار یا ٹیلی ویژن۔ ہر ایک کو مقررہ قومی نصب العین کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام کے درمیان ایک مضبوط مرکزی قیادت کے طفیل ہم آہنگی اور مناسبت قائم رکھی جاتی ہے۔

(۷) نقطۂ نگاہ کا فرق :۔ تعلیم کے متعلق امریکی نقطۂ نگاہ روسی نقطۂ نگاہ سے بہت مختلف ہے۔ امریکہ میں تعلیم کلی طور پر مقامی ہاتھوں میں ہے۔ ہر بستی اور ہر آبادی اپنے مدرسے اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے۔ وہ اس معاملے میں کسی مرکزی اثر یا مداخلت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ صاف تر لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ گو امریکی قوم تعلیم کو بہت اہمیت دیتی ہے اور اس کی خاطر مالی قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ مگر وہ مقامی آزادگی

تعلیم سے مقدم سمجھتی ہے۔ وہ مقامی آزادی کھو کر تعلیم کو ترقی دینے کی قائل نہیں۔ حال ہی میں امریکی کانگرس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی حکومت مدرسوں کو مالی مدد دے۔ کانگرس نے یہ مسودہ نامنظور کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر امریکہ میں اس بات پر استصواب رائے کر دیا جائے کہ کیا لوگوں کو مقامی آزادی زیادہ پیاری ہے یا تعلیم تو آبادی کی بھاری اکثریت تعلیم کو دوسرا درجہ دے گی۔

اس مقابلے میں روسی رہنماؤں نے تعلیم کو ہمیشہ سب سے قوی حربہ خیال کیا ہے۔ وہ اس نکتے سے کبھی غافل نہیں ہوئے کہ ہر مقصد کی تحصیل اور ہر تبدیلی کی تکمیل کے لیے تعلیم ایک لاجواب ہتھیار ہے۔ انھوں نے اشتراکیت کے استحکام کے لیے تعلیم سے بھرپور خدمت لی ہے اور لے رہے ہیں۔ اس مطلب کے لیے انھوں نے روپیہ خرچ کرنے اور تعلیم کو مؤثر بنانے میں قطعاً کوئی دریغ نہیں کیا۔ روس کے سیاسی اور تعلیمی نظام کے تمام رشتے اس طرح ایک مرکزی نقطے پر جمع ہیں کہ روسی رہنما تعلیم سے حسب منشا خدمت لے سکتے ہیں۔

(۸) مواقع کا اختلاف :- امریکہ کے جمہوری فلسفۂ زندگی کا ایک بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ تمام شہریوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں۔ اہل امریکہ اس عقیدے میں بڑا پکا تعین رکھتے ہیں ہیں اور انھیں یقین ہے کہ امریکہ میں تمام نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ مگر یہ خیال صرف ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ ثانوی تعلیم بے شک مفت ہے اور بعض اوقات کتابیں تک مفت بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ مگر امریکہ میں تعلیم مرکزی حکومت کی ذمہ داری نہیں، ہر آبادی کی اپنی مقامی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ کی اڑتالیس ریاستیں ایک سی امیر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض ریاستیں تعلیم پر بہت بھاری بھاری رقمیں صرف کرتی ہیں لیکن بعض ان کے مقابلے میں تعلیم پر بہت تھوڑا خرچ کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض علاقوں کے مدرسوں میں طلبہ کی وہ بے پناہ بھیڑ ہے کہ مؤثر تعلیم ممکن نہیں رہتی۔ پھر ملک کے کئی حصوں میں حبشی بچوں کے لیے الگ سکول قائم ہیں ان مدرسوں میں عموماً وہ تعلیمی سہولتیں موجود نہیں جو گورے مدرسوں میں میسر ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا پوری طرح درست نہیں کہ امریکی مدرسے تمام بچوں کو ایک سے تعلیمی مواقع پیش کرتے ہیں۔

اب مدرسے کو چھوڑ کر کالج کی تعلیم کی طرف آئیے۔ امریکہ میں کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مفت نہیں۔ اس تعلیم پر روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ ملکہ کولمبیا، ہارورڈ اور دوسری مشہور یونیورسٹیوں کی فیس اتنی بھاری ہے کہ ایک

اوسط ذرائع کے طالب علم کے لیے اس کا ادا کرنا آسان نہیں۔ بے شک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کچھ وظائف بھی موجود ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے نوجوان جو اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ثانوی درجے کے بعد تعلیم ختم کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اوسط ذرائع کے جو نوجوان طلبہ اور طالبات کالج یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں، انھیں جزوی طور پر کچھ کام کاج کر کے روپیہ کمانا پڑتا ہے یہ تمام باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امریکہ میں ہر ایک کو یکساں تعلیمی مواقع حاصل نہیں۔

تعلیمی مواقع کی یکسانیت کے معاملے میں روس امریکہ سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ روسی رہنماؤں نے یہ سبق اچھی طرح پلے باندھ رکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شہری یا کارکن اپنے غیر تعلیم یافتہ یا کم تعلیم یافتہ ساتھی کے مقابلے میں بہت بہتر ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر روسی حکومت ہر اس شخص کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے جو تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بے شک روس کا قانون تعلیم صرف ساتویں جماعت تک کی تعلیم کو ہر ایک کے لیے لازمی قرار دیتا ہے، اور ملک کے کئی حصوں میں تعلیمی سہولتوں کا ابھی خاصہ فقدان ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف وسائل کی کمی ہے۔ جوں جوں وسائل دستیاب ہوتے جا رہے ہیں ملک کے ہر حصے میں تعلیمی سہولتیں عام کی جا رہی ہیں۔

لیکن روسی نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا کارنامہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع کی یکسانیت ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کرنے کا انحصار طالب علم کی مالی استطاعت پر نہیں بلکہ پورے طور پر اس کی قابلیت پر ہے اعلیٰ تعلیمی ادارے داخلے کے امتحان لیتے ہیں اور یا پھر ثانوی مدرسے کے ریکارڈ کی بنا پر داخلہ کرتے ہیں۔ ان اداروں میں داخل ہونیوالوں کے اخراجات برداشت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے والے طلبہ اور طالبات کو اتنا وظیفہ دیا جاتا ہے جو ان کے تمام اخراجات پورے کر دے۔ اس طریق کار نے روس کو ماہر سائنس دانوں اور انجینئروں کی فراوانی اور بہم رسانی کا ایسا کارگر اور شافی انتظام کر دیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ مصنوعی روسی سیاروں کی تیاری کے بعد جب امریکہ اور روس کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق اخباروں میں اعداد و شمار خارج ہوئے تو عام امریکیوں اور دوسرے لوگوں کو بھی پہلی بار یہ علم ہوا کہ روسی کالج اور یونیورسٹیاں امریکہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ انجینئر اور فنی ماہر تیار کر رہی ہیں۔ ان اعداد و شمار نے

امریکہ کو یہ احساس دلایا کہ گو اس کا فلسفۂ تعلیم بہت معقول ہے اور اس کا تعلیمی طریق کار بعض اعتبار سے بہت ہی اطمینان بخش ہے، تاہم روس نے تعلیم کے بعض میدانوں میں ایسے کارنامے سرانجام دیے ہیں جن سے امریکہ کو سبق سیکھنا چاہیے۔

(۹) جذبۂ مسابقت کا اختلاف:- امریکی معاشرہ مسابقت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ معاشی میدان میں ہر شخص کو بلا روک ٹوک کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ آزاد معاشرہ اور آزادانہ مسابقت دولازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ لیکن معاشی اور سیاسی زندگی میں مسابقت میں یقین رکھنے کے باوجود امریکی تعلیم جذبۂ مسابقت سے کام لینا غلط خیال کرتی ہے۔ وہ اس بیے نفسیاتی تحقیق مسابقت کو پسندیدہ چیز قرار نہیں دیتی۔ نفسیاتی استدلال یہ ہے کہ فطری استعداد کے معاملہ میں تمام بچے ایک سے نہیں ہوتے۔ اگر انھیں یکساں نوعیت کے کام پر لگا کر ان کے درمیان مقابلہ پیدا کر دیا جائے تو کم استعداد رکھنے والے بچے لامحالہ پیچھے رہ جائیں گے۔ اس سے ان کے دلوں میں ایسا احساس کہتری جڑ پکڑ لے گا جو بعد میں دور نہ کیا جا سکے گا۔ بچوں کے انفرادی اختلافات میں یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکی مدرسے نے اپنے تعلیمی معیار کافی نیچے کر رکھے ہیں، تاکہ ہوشیار اور کمزور ہر قسم کے بچے مدرسے کے کام کو بھرپور سے ہاتھ ڈال لیں اور ہر ایک کو یہ احساس ہو کہ وہ دوسروں کی طرح ترقی کر رہا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ چیز خواہ کیسی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو اس میں کلام نہیں کہ اس سے غیر معمولی ذہانت کے بچوں کو زیادہ ابھرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ نیز تعلیمی معیاروں کے پست ہو جانے سے بیشتر طلبہ لگ لپٹ کر کام کرنے کی عادت سے عاری رہتے ہیں۔

اس کے برعکس روسی معاشرہ صحیح معنوں میں مسابقت پسند معاشرہ ہے۔ اشتراکیت بلا روک ٹوک معاشی مسابقت میں یقین نہیں رکھتی تاہم اشتراکی نظام مسابقت سے بھرپور خدمت لیتا ہے۔ کانوں، کارخانوں، اجتماعی فارموں غرض معاشی زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا انحصار دوسروں سے زیادہ کام کرنے میں ہے۔ ہر جگہ انتہائی کارکردگی کے ریکارڈ آنکھوں کے سامنے آویزاں رہتے ہیں اور مزدور، کاریگر، انجینئر اور دوسرے تمام کارکن اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کارکردگی کے نئے ریکارڈ قائم کیے جائیں۔ مسابقت کا یہ جذبہ روسی تعلیم میں بھی پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔ روسی مدرسے اول سے آخر تک بلند تعلیمی معیاروں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ فطری استعداد کے بارے میں

طلبہ میں خواہ کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، روسی مدرسے ان سب سے اونچے معیاروں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روسی ماہرین تعلیم اس بات کو کچھ اہمیت نہیں دیتے کہ بچوں میں مقابلہ پیدا کرنے سے کمزور بچے بددلی اور احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے دس سالہ ثانوی مدرسے کے خاتمے تک طلبہ کے متعلق مفصل ریکارڈ تیار ہوتے رہتے ہیں۔ اس نصاب کے خاتمہ پر اچھا ریکارڈ رکھنے والے طلبہ کو کالج یا یونیورسٹی میں بھیج دیا جاتا ہے اور پست ریکارڈ رکھنے والے طلبہ کو کانوں، کارخانوں، زراعتی فارموں وغیرہ میں معمولی کام کاج کے لیے بھیج دیا جاتا ہے تعلیمی میدان میں بھرپور خدمت لینے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس طرح اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی ذہانت کے بچے نہ صرف منظر عام پر آ جاتے ہیں بلکہ وہ علمی اور عملی کام کی پسندیدہ عادات بھی اچھی طرح اخذ کر لیتے ہیں۔

تعلیم کو ثانوی درجے تک لازمی بنانے اور ہر بچے کو اس سے مستفید کرنے کے لیے امریکی مدرسے نے اپنے نصاب کو بے اندازہ وسعت دی ہے۔ ہر وہ کام جو زندگی میں کوئی اہمیت رکھتا ہے ثانوی نصاب میں جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ نصاب کی اس بے پناہ وسعت نے امریکی مدرسے میں نظری اور عملی تعلیم کو نہایت خوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ لیکن نصاب مدرسہ میں اتنی وسعت پیدا کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے انھیں امریکہ ایسا امیر ملک ہی فراہم کر سکتا ہے۔ روسی رہنماؤں نے تعلیم پر خرچ کرنے کے معاملے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا تاہم روسی ثانوی مدرسے کا نصاب حال ہی تک زیادہ تر علمی قسم کا تھا، اور بے شک سائنس کی تدریس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ مگر یہ تعلیم زیادہ تر نظری تھی۔ لیکن اب روسی مدرسے بھی عملی مضامین کی تعلیم دینے لگے ہیں۔ مگر جس طرح وہ علمی تعلیم میں بلند معیاروں کے قائل ہیں اسی طرح عملی تعلیم میں بھی وہ اعلیٰ ترین معیاروں سے کم پر مطمئن نہیں ہوتے۔ عام مدرسوں میں اب زراعت، باغبانی وغیرہ قسم کے عملی مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ ثانوی مدرسے کا نصاب دس کی بجائے گیارہ برس کا کر دیا جائے اور اس میں سے دو سال مؤثر عملی تربیت پر صرف ہوں۔ جن لوگوں نے روسی مدرسوں کو دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کے ہاں عملی کام کا معیار یہ ہے کہ طلبہ جدید ترین آلات اور تکنیکوں سے کام لینا سیکھ جائیں۔ مثلاً جن مدرسوں میں باغبانی داخل نصاب ہے وہاں طلبہ صرف چند چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں کام نہیں کرتے بلکہ بڑے بڑے کھیتوں میں ترقی یافتہ زرعی آلات کیمیاوی کھاد اور سائنسی طریقہ ہائے کاشت سے کام لیتے ہیں۔

منصوبی طریقہ

محمد عبدالعزیز

اس ملک میں مدرسین کی اکثریت جدید تدریسی طریقوں سے یا تو نا آشنا ہے یا اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ تعلیم و تعلم میں ناواقفیت جرم ہے اور مفید باتوں سے عمداً اغماض ایک ایسا جرم ہے، جسے زندہ قومیں معاف نہیں کرتیں۔ جس تعلیمی منصوبے کی بنیاد بچوں کی ذہنی استعداد پر رکھی گئی ہے، اس کا تعلق خواہ مغرب سے ہو یا مشرق سے، اس سے طلبہ کی بہت بڑی جماعت متمتع ہو سکتی ہے۔ کسی تدریسی طریقے کو یہ کہہ کر کہ یہ مغرب کی تخلیق یا دریافت ہے، اس کا ہمارے ماحول سے کوئی تعلق نہیں، فیضان کے سرچشموں کو بند کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کی تفصیلات مزاج کے مطابق مرتب ہوئی ہوں گی، لیکن ان اصولوں کے پیش نظر مزید تحقیق کے بعد ہم اسے اپنے ماحول اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

منصوبی طریق تدریس بھی ہماری اس غفلت شعاری سے مستثنیٰ نہیں، اس کی ایک وجہ پڑھانے والے کی عدم واقفیت اور اس کا خود لذت تحقیق سے نا آشنا ہونا ہے۔ کسی چیز کی اچھائی یا برائی کے پرکھنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس سے طلبہ کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس میں ترمیم و اضافے کی گنجائش ہے یا اسے بروئے کار لانے میں کس قسم کی تعلیمی یا تنظیمی قباحتیں ہیں؟ انھیں دور کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ یسی باتیں ہیں جن پر غور و فکر کیے بغیر کسی نتیجے پر پہونچنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے مدرسین میں تحقیق و تدقیق کا راق پیدا ہونا ضروری ہے۔

امریکا میں منصوبی طریقہ اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ اس ماحول میں اب اسے جدید نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ارے ملک میں ہنوز اس سلسلے میں کوئی مفید کام نہیں ہوا، بلکہ ہم تو اس کی اچھائیوں اور برائیوں سے بے پرواست پسندی کے بگولوں میں قلابازیاں کھاتے نظر آتے ہیں۔ اس عمومی بے توجہی کے پیش نظر منصوبی طریقے کے لف ادوار اور مدارج کا مختصر سا خاکہ پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے تعلیم میں نئے تجربوں کی افادیت

کی توضیح کی جائے گی۔

منصوبے (PROJECT) کی اصطلاح سب سے پہلے سی۔آر۔رچرڈز نے ۱۹۰۰ء میں استعمال کی۔ رچرڈز ٹیچرز کالج، کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ دست کاری کا صدر تھا۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ طلبہ میں تخلیقی استعداد پیدا کرنے کے لیے انھیں خود کار اور آزاد بنانا چاہیے، اور خود کاری اور آزادی اس وقت میسر آ سکتی ہے کہ اپنے کام کا منصوبہ یہ خود ہی تیار کریں۔ رچرڈز نے اپنی اس تجویز کو منصوبہ کہا۔

دوسری مرتبہ بھی اصطلاح کم و بیش اسی مفہوم میں اسٹیونسن نے ۱۹۰۸ء میں استعمال کی لیکن اس وقت اس کا اطلاق محدود تھا۔ اسٹیونسن کا منصوبہ میساچوسٹ کے پیشہ ورانہ اسکولوں کے زرعی نصاب سے متعلق تھا۔ مثلاً ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں اناج بونا، کیاریوں میں سبزی اگانا۔ ۱۹۱۱ء میں اس کا احاطہ قدرے اور وسیع ہوا، اور میساچوسٹ اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن نے جو رپورٹ زرعی تعلیم پر شائع کی اس میں اسے اس کے اسی وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا۔ اس رپورٹ کے مطابق منصوبے کے تین عناصر ہیں (۱) کھیت کا کام کرنا (۲) مخصوص حالات میں مخصوص نتائج (۳) مکمل تربیت۔

زرعی منصوبے تین قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اول ترقیاتی۔ دوم تجرباتی اور سوم پیداواری۔ ۱۹۱۱ء میں جو زرعی رپورٹ شائع ہوئی، اس کا ایک رکن اسٹیونسن بھی تھا۔ اس نے ۱۹۱۶ء میں منصوبے کی مزید توضیح کی۔

"چند سال ہوئے ہم میں سے بعض لوگوں نے تعلیمی کام کے واحدے کی تشریح کے لیے منصوبے کا لفظ استعمال کیا۔ اس کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ کوئی ٹھوس کام کی تربیت دی جائے۔ مثلاً روٹی پکانا۔ قمیص سینا۔ اناج بونا۔ میز بنانا وغیرہ۔ جب متعلم انھیں اس طرح بروئے کار لائے کہ اس سے علم اور تجربہ دونوں حاصل ہو سکیں تو یہی چیزیں منصوبہ کہلاتی ہیں۔ اس قسم کے منصوبے انفرادی اور اجتماعی دونوں ہو سکتے ہیں۔ ان پر اسباق کے عمومی پیریڈ میں بھی عمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متعلم اس پر کئی ہفتے روزانہ ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ کام کیا کرے۔ اس قسم کے منصوبے کی ابتدائی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) منصوبہ بجائے خود ایک وحدت ہو (۲) متعلم کی نگاہوں میں اس کا عملی مقصد واضح ہو۔ اس سلسلے میں ہمیشہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس نتیجے میں پایانِ کار بڑی دلچسپیاں ہوں گی جو اسے ایک مخصوص منزل تک

پہونچا دیں گی (۳) حصول کے معیار خارجی ہوں۔ اس طرح کہ متعلم اور اس کے شریک کار اپنی مصنوعات کے سلسلے میں قابل قدر فیصلہ کر سکیں (۴) یہ منصوبے اس قسم کے ہوں کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے متعلم کو مزورتاً اپنی معلومات اور اپنے تجربے سے کام لینا پڑے۔ بلکہ اس سلسلے میں مزید علم اور مہارت حاصل کرنی پڑے۔ اس طرح کسی ٹھوس کام کو جو کسی پیشہ ورانہ ادارے میں اختیار کیا جائے۔ اور جس میں کسی قابل قدر نتیجے کی توقع ہو، اسے منصوبہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن تعلیمی منصوبہ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ اس میں کسی چیز کی عملی تربیت کے لیے صرف نئی مہارتوں اور تجربوں کی تحصیل ہی کے مواقع نہ ہوں بلکہ متوقع علم کے سلسلے میں پرانوں کے اطلاق اور نئے تجربوں کے سیکھنے کے بھی اتنے ہی مواقع ہوں۔"

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یو۔ ایس۔ اے۔ میں منصوبے کی تاریخ اتنی نئی نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص مفہوم میں اس کا استعمال کم و بیش ساٹھ برس پرانا ہے۔ لیکن اس اصطلاح کا اطلاق بالعموم ایسے تعلیمی کاموں کے لیے ہوتا رہا جو ہاتھ سے کرنے کے تھے یعنی ایسے تعلیمی مسائل جو عملی، ٹھوس اور نتیجہ خیز ہوں جن میں طلبہ کی دل چسپی قائم رہ سکے اور جو انھیں اس کی منصوبہ بندی اور عمل کے لیے مسلسل دعوت عمل دیتے رہیں۔ لیکن یہ آمادگی کار اس کی آخری حد نہ تھی۔ اس کے بعد اس کی منصوبہ بندی اور اس کا عملی حل تلاش کر کے کسی نتیجے پر پہونچنا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ اس طرح اس کے چند مدارج قائم ہو گئے۔ سب سے پہلے کسی تعلیمی مسئلے کا ہونا۔ دوم اس کی منصوبہ بندی۔ سوم تلاش حل، چہارم نتیجہ۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں منصوبے کے مفہوم میں قدرے اور وسعت پیدا ہو گئی۔ اس وقت تک جان ڈیوی کے علمی نظریات بعض ارباب فکر کے ذوق عمل کو مرتعش کر چکے تھے۔ کلپیٹرک اس سے براہ راست متاثر تھا۔ ڈیوی کے نظریۂ تحریک کار کو اپنی فکری اساس بنا کر اس نے پُر مقصد عمل (PURPOEIVE ACTVITY) کو منصوبہ کہا۔ چناں چہ اس نے اس کی تعریف اس طرح کی۔

"ایسی پُر مقصد سرگرمیاں جو کسی سماجی ماحول میں پرورش پا رہی ہوں یا اپنی محدود شکل میں اسی قسم کی سرگرمیوں کے مرودہ ہوں۔ دل چسپ اور با مقصد عمل کے مترادف ہوتی ہیں۔ میں اسی با مقصد عمل پر منصوبے کا اطلاق کرتا ہوں اور اس میں سارا زور لفظ مقصد پر ہے۔ میں نے خود یہ اصطلاح وضع نہیں کی اور نہ میں نے

اسے اس کا تعلیمی مفہوم دیا۔ دراصل مجھے خود اندازہ نہیں کہ یہ کتنی مدت سے مستعمل ہے۔ لیکن بہر صورت شعوری طور پر میں نے اسے قابل قدر زندگی سے متصف کیا ہے۔

۱۹۲۱ء میں کلپٹرک نے اس کی مزید توضیح کی۔ اگرچہ اپنی پہلی تعریف کے اہم عنصر کو اسی طرح قائم رکھا لیکن یہ تعریف زیادہ واضح اور جامع ہے۔

بامقصد تجربے کا کوئی عنصر یا بامقصد عمل کی کوئی مثال جس میں کسی فطری آرزو کے تابع غالب مقصد (۱) مقصد عمل کی تعیین (۲) عمل کی رہنمائی اور (۳) جذبۂ کار کو مرتعش کرتا ہو۔

اگر کلپٹرک کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو منصوبے کا پرانا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ اسٹیون سن یا اسنیڈن (SNEDDEN) نے اسے ٹھوس عملی کاموں کے مفہوم میں استعمال کیا۔ اس میں نہ تحریک کار کا سوال تھا اور نہ ارتعاش جذبات کا۔ ایک کیاری میں گیہوں بونا ہے۔ طلبہ سے کہہ دیا گیا کہ اس کا ایک منصوبہ تیار کر لو اور اس پر عمل کرو۔ جس نتیجے کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی وہ یہ ہے کہ گیہوں ڈھنگ سے اُگ آئے وہ حسب ضرورت اس کی آبیاری کرتے رہیں تا آں کہ وہ پک جائیں اور انھیں کاٹ کر دانے اور بھُس کو علاحدہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس میں کسی ذہنی کاوش کا دخل نہ تھا۔ کلپٹرک نے اسے بامقصد خیال بنا دیا کہ اس سے تحریک کار پیدا ہو اور خود تحریک کار کو مرتعش کرتی رہے۔

اس تعریف کے پیش نظر منرو (MONROE) نے اس کی یوں صراحت کی ہے۔

"منصوبی طریقہ طلبہ کو عملی تعلیم میں شریک کرانے کے لیے ایک تعلیمی مختلف راہِ عمل کی نمائندگی کرتا ہے اس میں انھیں تفویض نہیں دی جاتی۔ طلبہ جو کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اور اس میں ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔"

ان تشریحوں سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ منصوبی طریقہ اصول تدریس کا کوئی فارمولا نہیں کہ اس کے مطابق طلبہ کو ایک مضمون پڑھا دیا جائے۔ یہ دراصل ایک نقطۂ نظر ہے۔ ایک تعلیمی فلسفہ ہے۔ اب اگر اسے ایک تعلیمی فلسفہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تحصیل کے لیے کسی اصول تدریس کا ہونا ضروری ہے کہ اس کی مدد سے منزل تک پہنچنے کی صورت پیدا ہو جائے۔ کلپٹرک اس کے اس پہلو سے غافل نہ تھا۔ اس کے خیال میں منصوبے

چار قسم کے ہو سکتے ہیں۔

(۱) تعمیری منصوبہ:۔ اس میں ایسے تجربے شامل ہیں، جن کا مقصد کرنا۔ جاتا اور عمل میں لاتا ہو۔

(۲) استحسانی منصوبہ:۔ اس میں طلبہ کی شرکت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس میں ان کے متوقع استحسان کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) مسائلی منصوبہ

(۴) تعلیمی منصوبے:۔ اس قسم کے منصوبوں میں علم یا مہارت کی تحصیل مقصود ہوتی ہے۔

کلپٹرک کی اس تقسیم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منصوبے کے لیے کوئی ایک اصول تدریس متعین نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ یہ چاروں قسمیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان کے تدریسی طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ عملی منصوبے میں جس طریق کار کی ضرورت ہوگی، تعلیمی منصوبے میں یقیناً اس کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس طرح استحسانی اور مسائلی منصوبوں میں، علی ہذا القیاس، چاروں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کلپٹرک کی اس تقسیم کے پیش نظر کونگس نے اس میں ایک کا اور اضافہ کیا اور اس کی تقسیم یوں کی۔

(۱) انکشافی

(۲) تعمیری

(۳) مواصلاتی

(۴) فعالی

(۵) مہارتی

کونگس کی تقسیم کلپٹرک کی تقسیم سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ منصوبے کی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن، اس کی کامیابی کا تمام تر انحصار تدریسی اصولوں پر ہے اور کونگس نے جن تدریسی طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بنیادی طور پر مروجہ طریقوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان طریقوں میں مدرس کی حیثیت ایک تماشائی کی نہیں ہوتی بلکہ اس میں طلبہ اس کی رہنمائی کے محتاج رہتے ہیں۔ اور یہ حق یہ ہے کہ یہ ممکن بھی نہیں کہ طلبہ مدرس کی رہنمائی کے بغیر خود ہی اپنا مقصد متعین کر لیں۔ خود ہی منصوبہ تیار کریں اور خود ہی اس پر عمل کریں۔ تدریس میں اس قسم کی مطلق العنانی غیر ضروری

اورنا واجب ہے ۔

کلپٹرک کے متعین منصوبوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے منصوبے کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اس سے فکر نیچے مفلوج ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ ایک لفظ کو اس کے عام معنیٰ سے ہٹ کر ایک نیا مفہوم دینے اور پھر آمرانہ طور پر اس کی نئی توضیحات کرنے سے فکری انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کلپٹرک نے فلسفۂ تعلیم اور اصول تدریس کو ایک سمجھ لیا ہے۔ اگرچہ فلسفہ اور تدریس دو علاحدہ چیزیں ہیں۔ انھیں ایک سمجھنا غلطی ہے۔ فلسفہ ایک منزل متعین کرتا ہے اور اصول تدریس اس منزل تک پہنچنے کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ طلبہ کی بھلائی ان دونوں کے تعامل میں ہے۔ اور اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ تیسرے یہ کہ منصوبے کو فلسفۂ تعلیم قرار دے کر اس کا مدرسے کے ہر تعلیمی پروگرام پر اطلاق کرنا قطع نظر اس سے کہ اس فلسفے سے کوئی تدریسی تکنیک وابستہ ہے یا نہیں، کوئی موزوں اقدام نہیں۔ چوتھی دشواری یہ ہے کہ اس طرح تدریسی اصولوں کا کوئی طریقہ وضع نہیں کیا جا سکتا

جدید رجحانات کچھ اور ہیں۔ کلپٹرک کے وضع کردہ اصولوں سے اختلاف بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اکثر ماہرین تعلیم اس کی تعریف سے متفق نہیں بلکہ ان کے یہاں اس کے ترک کرنے کا رجحان زیادہ ہے۔ اس کے باوصف تعمیری منصوبے کی اہمیت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ منصوبے میں حقائق پر زیادہ زور دیتا ہے۔ منصوبی طریقہ مفادیاتی سطح پر مسائل حل کرنا سکھاتا ہے۔ منصوبہ دراصل ایک با مقصد اور متعین مسئلہ ہے۔ ایک ایسا مسئلہ جسے طلبہ کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ بہت ہی اہم ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق صحیح فعالیتوں سے ہوتا ہے۔ ایسی فعالیتوں سے جن کا روزمرہ زندگی سے تعلق ہے۔ پرٹن اسے ایک عملی مسئلہ قرار دیتا ہے جس کا مقصد عمل ہوتا ہے۔ مارسیل نے اس کی توضیح یوں کی ہے۔
منصوبہ ایک وسیع اور اہم کام ہے جو بچوں میں اس قسم کے رجحانات پیدا کر سکتا ہے جو متعینہ تعلیمی عمل کا مقصد ہے۔

جدید اور قدیم دونوں ادارہ ہائے فکر میں چند باتیں مشترک ہیں۔ دونوں گروہ متفق ہیں کہ منصوبے کی نوعیت مسائلی ہو تاکہ طلبہ کسی نہ کسی مسئلے کے حل کی جستجو میں لگے رہیں۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ اس قسم کا ہو کہ اس سے

طلبہ کا احساس عمل متحرک ہوتا ہے۔ تیسری بات منصوبے کی تیاری اس کی ترتیب اور عمل میں بچوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے اور چوتھا یہ کہ منصوبہ مسائل حل کرنے کی عملی فعالیت ہو۔

ان توضیحات کی روشنی میں منصوبے کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔

منصوبہ مسائلی فعالیت کا ایک اہم اور عملی پہلو ہے جسے طلبہ نے خود ہی تیار کیا ہو اور خود ہی اس کی تکمیل کی ہو۔ اور جس میں انھوں نے از خود مادی وسائل سے کام لے کر اپنے تجربے کو مکمل کیا ہو

منصوبے کی قسمیں

منصوبے دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔

انفرادی منصوبہ

انفرادی منصوبہ میں متعلم خود کام کرتا ہے۔ تکمیل کار کے سلسلے میں نہ تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتا ہے ورنہ اعانت طلب ہوتا ہے۔ بلکہ خود یا حسب ضرورت مدرس کی رہنمائی میں اپنا منصوبہ مکمل کروالیتا ہے۔ انفرادی منصوبے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک میں، ایک ہی منصوبے پر ہر طالب علم انفرادی طور پر کام کرتا ہے۔ ایک کے منصوبے کا دوسرے کے منصوبے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس قسم کے منصوبوں میں ظاہر ہے طلبہ زیادہ دلچسپی سے کام لیں گے۔ لیکن مدرس کے لیے ان کی تنظیم مشکل ہو جائے گی۔ اور ممکن ہے وہ طلبہ کی صحیح رہنمائی سے معذور رہ جائے۔ مثلاً اول الذکر انفرادی منصوبے میں ایک کلاس کے سارے طلبہ ایک ہی وقت میں قمیص کا کام تیار کرنے میں مصروف ہوں گے۔ یا اسکول کے کارخانے میں مشین کا ایک پرزہ بنانے میں محو ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگرچہ ہر متعلم اپنا اپنا کام خود ہی کرتا ہے۔ لیکن اس میں مدرس کو نگرانی میں آسانی ہوتی ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ کالر کاٹنے اور سینے کا طریقہ یا پرزہ ڈھالنے کا اصول بتا سکتا ہے۔ اس سے وقت کی بچت بھی ہوتی ہے اور طلبہ کو انفرادی طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا بھی موقع ملتا ہے۔ دوسری صورت میں طلبہ کی دلچسپی ضرور بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنے اس ذوقِ کار کی تسکین کے لیے اس کی تکمیل میں بیش از بیش حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اس سے مدرس کے کام میں خاصی دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے منصوبوں میں ایک ہی وقت میں ایک ہی کلاس کے مختلف طلبہ مختلف قسم کے کام میں فرداً فرداً مصروف ہوں گے۔ ایک طالب علم کالر تیار

کر رہا ہے، دوسرا موٹر سے بن رہا ہے۔ تیسرا گری جا رہا ہے، چوتھا پیرنٹ ڈھال رہا ہے۔ پانچواں خشت سازی میں مصروف ہے، چھٹا میز کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ درست کر رہا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جتنے طالب علم اتنے ہی منصوبے۔ اس میں مدرس اپنے طلبا کے کام کی نگرانی کر سکتا ہے اور وہ انہیں یہ بتا سکتا ہے کہ تم نے یہاں غلطی کی ہے۔ اس کی اصلاح یوں ہو سکتی تھی، یا تم نے تکمیل کار کے لیے جو اقدام کیا ہے وہ طویل ہے۔ اس میں تمہیں کوشش و خطا کے بیسیوں مراحل طے کرنے ہوں گے۔ اسے اس طرح کرو تو مناسب ہوگا۔ یہ اور اس قسم کی سیکڑوں ہدایتیں مدرس اس وقت زیادہ آسانی سے دے سکتا ہے، جب منصوبہ ایک ہو۔ اس میں وقت کی بھی بچت ہوگی، طلبہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے اور مدرس کو بھی اپنی فکری ہم آہنگی کو ایک کام پر مرکوز کرنے کا موقع ملے گا۔

اجتماعی منصوبہ

اس میں کلاس بہ حیثیت مجموعی کام کرتی ہے۔ ہر طالب علم اپنی استطاعت کے مطابق منصوبے کی تکمیل میں حصہ لیتا ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ مثلاً جغرافیہ کے سبق میں نہر سویز کی تعمیر ایک اجتماعی منصوبہ بن سکتا ہے۔ سویز ایک عالمی بحری شاہراہ ہے۔ ساری جماعت مل جل کر اس کا ایک خاکہ تیار کرے گی۔ اس کے بعد کام مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ایک گروہ سویز سے بندر سعید تک نہر کی تعمیر کا کام کرے گا۔ دوسرا گروہ تعمیری سامان مہیا کرے گا۔ تیسرا سڑک اور ریلوے لائن بنائے گا۔ چوتھا سویز، اسمٰعیلیہ، قنطرہ اور بندر سعید جیسے شہروں کے ماڈل تیار کرے گا۔ اس طرح اور گروہ اس قسم کے دوسرے کاموں میں لگ کر اسے مکمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اجتماعی منصوبوں میں طلبہ اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو یکجا کر کے ایک کام کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ان کے ذہنوں میں اجتماعیت کا تصور پیدا ہو جائے گا، بلکہ دوسروں کے افکار و خیالات کی تحسین اور خود اپنی معلومات پر تنقید کرنے کا شعور بھی بیدار ہو جائے گا جو فکری ترقی کے لیے ایک اچھی علامت ہے۔

منصوبے کا عمل تکمیل

منصوبے کی تکمیل کے لیے طلبہ کو مختلف مدارج سے گزرنا ہوتا ہے اور تکمیل کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک منصوبہ مکمل نہ ہو جائے۔ جس طرح ایک مسئلے کی تنقید و تنقیح کے بعد متعلم کا ذہن اس کے حل کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے اسی طرح منصوبے کی تکمیل کے لیے بھی کاوش کرنی پڑتی ہے

یہ کاوش قدرے ذہنی ہوتی ہے اور قدرے جسمانی۔ سب سے پہلے مدرس کی امداد سے ایک منصوبہ تیار کرتے ہیں پھر تخیل کے سہارے قلم سے اس کی نوک پلک درست کرتے ہیں۔ اس کے بعد مواد جمع کرنے کی باری آتی ہے جب مواد جمع ہو جائے تو طلبہ اس کی تکمیل کے لیے اقدام کرتے ہیں۔

منصوبے کی تکمیل کے لیے طلبہ کو مختلف مدارج سے گذرنا ہوتا ہے۔ یہ مدارج کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اختلافی نہیں بلکہ اس سے ہر ادارہ فکر کو اتفاق ہے۔ خواہ یہ ادارہ فکر کلپٹرک کا ہم نوا ہو یا اس کا مخالف۔ عمل کے چار درجے ہیں۔

(۱) مقصدیت

جدید تعلیم میں محرکات کی افادیت مسلم ہے۔ اگر طلبہ کا ذوق کار بیدار ہو جائے تو مسائل کی گتھیاں وہ از خود سلجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں دل چسپی نہ ہو تو یہی کام غیر دل چسپ اور دور از کار معلوم ہونے لگتا ہے کسی کام میں دل چسپی قائم کرنے کے لیے جذبات کو مرتعش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ منصوبی طریقہ مسائلی بھی ہے اور عملی بھی۔ اس طرح وہ جذبۂ خود کاری کا خود محرک بن جاتا ہے، اور طلبہ میں کچھ ایسی سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ منصوبے کی تکمیل کے لیے وہ اپنے ساتھیوں سے پورا پورا تعاون کرتے ہیں اور اس اشتراک سے ان کے ذوق کو تسکین ملتی رہتی ہے۔ لیکن یہ اشتراک مشروط ہوتا ہے۔ اگر منصوبے کا خاکہ مدرس کی اعانت سے تیار کیا گیا ہے تو اس کی نوعیت کچھ اور ہو گی لیکن اگر اسے کسی متعلم نے یا چند ساتھیوں نے مل کر تیار کیا ہے تو اس کی صورت اور ہو گی۔ طلبہ اس منصوبے میں زیادہ دل چسپی لیں گے جو ان کی اپنی تخلیق ہے اور جو خاکہ وہ اپنی مشترکہ مساعی سے تیار کریں گے اس میں آب و رنگ بھرنے کے لیے بھی اتنی ہی احتیاط سے کام لیں گے۔ اس قسم کے منصوبے انفرادی اور گروہی دونوں ہو سکتے ہیں۔

نئے نئے منصوبوں کی تخلیق کے لیے طلبہ کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ طلبہ خود اتنے بالغ نظر نہیں ہوتے کہ منصوبوں کی افادیت پر غور و خوض کر سکیں، ان کا انتخاب، ضروری نہیں کہ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے صحیح ہو۔ اگر انتخاب کی اساس محض جذباتی ہے تو منصوبے کی تعلیمی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں تھوڑی بہت تعلیمی افادیت بھی ہو۔ لیکن وقت اور موقع کے لحاظ سے اس کا

انتخاب غلط اور اس کی تکمیل کی کوشش طلبہ کو غلط راہ پر ڈال دے۔ اس قسم کے احتمالات سے بچنے کے لیے مدرس کی بالغ نظری اور اس کے علم پر تکیہ کرنا زیادہ مفید ہوگا۔ طلبہ کی نظر اتنی وسیع نہیں ہوتی کہ وہ منصوبے کے ہر پہلو کا قبل از وقت جائزہ لے سکیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوشش و خطا کے مسلسل عمل سے ان کی سمجھ میں آجائے کہ انھوں نے جو اقدام کیا ہے اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ لیکن ایسے کارلاحاصل کی ضرورت کیا۔ مدرس کا تجربہ وسیع، اور اس کی نگاہ تیز ہوتی ہے۔ اس کے اس تجربے اور وسعت نظر سے فیض یاب نہ ہونا بہت بڑی بھول ہوگی اسے اس کے عواقب سے خاصی واقفیت ہوتی ہے اور اپنی ان معلومات کے پیش نظر وہ طلبہ کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔

ایک اچھے مدرس کے لیے طلبہ کے جذبۂ کار کو تحریک کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ وہ کسی منصوبے کو ان کے سامنے اس طرح پیش کرسکتا ہے کہ وہ اس میں دلچسپی لینے لگیں۔ اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ منصوبے کے انتخاب میں آخری رائے مدرس کی ہو۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ طلبہ کی آزادیِ فکر سلب کرلی جائے انھیں بھی غور و فکر کا موقع دینا چاہیے۔ جب وہ کسی ایسے منصوبے کا خاکہ مدرس کے سامنے پیش کریں جس کے وہ خود خالق ہیں تو اس کا تجزیہ کرکے انھیں سمجھا دینا چاہیے کہ اس وقت یہ موزوں ہے یا نہیں۔ یا اگر اس کے اس پہلو پر کام کیا جائے تو مفید ہوگا اور اس کے اس پہلو کو قطعی طور پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری ہدایتیں طلبہ کے رجحان فکر کو یقیناً موڑ دیں گی اور وہ مدرس کی رہنمائی میں زیادہ کارآمد کام کرسکیں گے اس کے لیے شرط یہی ہے کہ طلبہ کے ذوق کار اور جوشِ اشتراک کو متحرک کیا جائے۔

(۲) منصوبہ بندی

جب یہ فیصلہ ہو جائے کہ منصوبہ کیا ہوگا، اور طلبہ بھی تکمیل کار کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اس وقت اس کی تفصیلات کا طے کرنا ضروری ہو جاتا ہے منصوبہ کس طرح کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے ایک ایک پہلو کی تفصیلات کیا ہوں گی، ان کے متعلق اب حتمی فیصلہ کیے بغیر آگے بڑھنا فضول ہوگا۔

منصوبہ بندی کی بیشتر ذمہ داری طلبہ کی ہونی چاہیے۔ یہ اس لیے کہ اگر یہ سارا کام مدرس کے سپرد کر دیا گیا تو منصوبے کا ایک توضیحی خاکہ تو مرتب ہو جائے گا لیکن طلبہ کی اپنی تخلیقی صلاحیتیں محروم عمل

رہ جائیں گی، یہ درست ہے کہ طلبہ کی منصوبہ بندی میں غلطیوں کا امکان زیادہ ہوگا۔ لیکن غلطیاں تہذیب دانش کا موجب ہوتی ہیں، بالخصوص اس وقت کہ طلبہ کی رہ نمائی کے لیے ایک دانش ور موجود ہے۔ اس کے علاوہ مسلسل غور و فکر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے بعد غلطیوں کا احتمال بھی کم ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر منصوبہ بندی کی ذمہ داری طلبہ پر ڈال دی جائے تو مدرس ان کی رہ نمائی کس عنوان سے کر سکتا ہے۔ آیا وہ اس کا مجمل سا خاکہ خود تیار کرے اور طلبہ اس کی تفصیلات طے کر لیں یا اس کی اور کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی۔ ایک اچھے مدرس کے لیے اس کے چار طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ طلبہ سے اس قسم کے سوال پوچھے کہ ان کی ساری توجہ منصوبے کے عملی مسائل پر مرکوز ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ جو عملی اقدام متعین ہو چکے ہیں ان کے مختلف مدارج کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لینا سکھائے۔ تیسرے یہ کہ اس سے پہلے کہ منصوبے پر عمل کیا جائے، طلبہ میں اس کے تنقیدی جائزے کی عادت پڑ جائے۔ چوتھے یہ کہ طلبہ کی تربیت اس انداز میں کی جائے کہ وہ صحیح غور و فکر کے لیے مجبور ہو جائیں۔

طلبہ بالعموم عجلت پسند ہوتے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اکثر عجلت سے کام لیتے ہیں لیکن یہ عجلت فطری ہوتی ہے۔ تحقیق کی صبر آزما منزلوں سے گذرنا ایک ایک چیز کی چھان بین کرنا۔ اس کے عواقب کا جائزہ لینا، ان کے لیے اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ چاند کو چھونا چاہتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ اچھل کر چھو لیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ حصول مقصد کے لیے مختلف مدارج سے گذرنا ناگزیر ہے۔ منصوبی طریق تدریس میں بھی مدارج کے جوکھوں میں سے گذرنا پڑتا ہے اور اس کا کام انھیں، انھیں مدارج سے گذرنے کی تربیت دینا ہے۔

اس طرح تحقیق و تدقیق کی روشنی میں جو منصوبہ بندی ہوگی، اس میں غلطیوں کا امکان کم ہوگا۔ اور ضروری بحث و تمحیص کے بعد جماعت جو فیصلہ کرے گی وہی ناطق ہوگا۔ اس بحث میں مدرس کی حیثیت ثالثی کی ہوگی جو وقتاً فوقتاً طلبہ کی رہ نمائی کرتا رہے گا۔ مبادا وہ بے راہ ہو جائیں۔ اس کے بعد اس کا جو خاکہ تیار ہوگا اس سے ساری جماعت متفق ہوگی۔ اور ان مراحل سے گذرنے کے بعد جب وہ اس کی تکمیل کا عزم کرے گی تو اس کا کوئی رکن اپنے متعینہ کام سے گریز نہیں کرے گا، بلکہ جو کام اسے تفویض کیا گیا ہے اسے اپنا سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ بے کیف ہو کر نہیں، مزے لے لے کر، اور جوش و انہماک کے ساتھ۔

(۳) تکمیل کار

منصوبہ بندی کے بعد تکمیل کار کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کی منصوبی طریق تدریس میں بڑی اہمیت ہے۔
منصوبہ بناری کے وقت طلبہ کے ذوق جستجو کو جوتا زیانہ لگتا ہے۔ منصوبے کی تکمیل اس کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے طلبہ کو عمومی دل چسپی ہوتی اور چوں کہ منصوبے میں عمل کے بیش از بیش مواقع حاصل ہوتے ہیں، اس لیے ان کی دل چسپیاں قائم رہتی ہیں۔ لیکن اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ طلبہ اپنی ان دل چسپیوں اور منصوبے کے عملی کاموں میں کچھ اس طرح منہمک ہو جائیں کہ انھیں منصوبے کی اصل غایت ہی یاد نہ رہے۔ اس وقت منصوبے کا مقصد تعلیم نہیں بلکہ تفنن طبع ہوگا۔ اور تفنن کی خاطر اتنا وقت صرف کرنا ظلم ہوگا اس طرح تکمیل کار کے اس عمل میں مدرس کی رہ نمائی بڑی ضروری ہوتی ہے۔ عمل کا ایک ایک پہلو اور منصوبے کی تکمیل کے مختلف مدارج میں مدرس کی قیادت سے اس کی تعلیمی افادیت قائم رہتی ہے۔

مدرس کی اس رہ نمائی کی پہلی صورت مواد کا فراہم کرنا ہے۔ اگر ضروری ساز و سامان موجود نہ ہو تو اس صورت میں نہ طلبہ دل چسپی سے کام کر سکتے ہیں اور نہ مدرس انھیں مقصد آشنا بنا سکتا ہے۔ طلبہ اپنی طبعی افتاد کی وجہ سے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بھٹک سکتے ہیں یا یہ کہ منصوبے کے بعض پہلو اتنے دل چسپ ہوں کہ وہ اس کی باریکیوں ہی میں ہی الجھ کر رہ جائیں۔ طلبہ کی توجہات کو اصل کام کی طرف منعطف کرانا، اور اس کی تعلیمی افادیت کو قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات طلبہ کی رفتار ترقی سست ہو، یا مدرس کی توقع کے مطابق نہ ہو۔ یا جو وقت اس کی تکمیل کے لیے مقرر کیا گیا ہے اس میں وہ اسے پورا نہ کر سکیں۔ ایسی صورت میں مدرس کی بے تابی اسے تکمیل کار پر اکساتی ہے اور وہ بے محابہ منصوبے کو مکمل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اس سے ممکن ہے منصوبہ وقت پر مکمل ہو جائے لیکن طلبہ کو اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔ امداد خواہ طلبہ کی اس طرح اعانت کرنا ان کے ذوق کار اور ذوقِ تحسین دونوں کو مردہ کر دینا ہے۔ چاہیے تو یہ کہ مدرس اپنی اس بے تابی پر قدرت حاصل کر کے ان کی رہ نمائی کرے اور حسب ضرورت ان کا دل بڑھاتا رہے کہ میاں تم نے اتنا کام تو بڑی عمدگی سے کر لیا ہے۔ ذرا اسے اس طرح اور اس رفتار سے کرو تو یہ اور بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر رفتار

ہی سست ہو تو اس وقت انفرادی طور پر کسی ایک متعلم کی امداد ضروری ہو جاتی ہے۔ مگر یہ امداد محض امداد
بجائے خود کام کی تکمیل نہ ہو۔ اس سے ممکن ہے دوسرے کم کوش طلبہ بھی ہمت آزمائی کے لیے تیار
ہیں اور جو کام تشنۂ تکمیل ہے اس کی تکمیل ہو جائے۔

اپنے کام پر تنقید کرنا اور اس کے حسن و قبح کا جائزہ لینا آسان نہیں ہوتا، اپنی چیز خواہ اچھی ہو یا
بھی لگتی ہے۔ یہ خیال ذہنی شکست کے مترادف ہے۔ اس لیے طلبہ میں تحلیلی شناسی کا شعور اس طرح
جائے کہ وہ منصوبے کے ہر پہلو کا تنقیدی جائزہ لیں۔ ان کی نگاہ میں تنقید کا شعور ہو اور وہ اس کے اچھے
ے پہلو پر غور کرنے کے اہل ہوں۔

منصوبی طریق تدریس مطالعہ زیر نگرانی سے ملتا جلتا ہے۔ چناں چہ اس میں بھی جو تکنیک اختیار کی جائے
نوعیت اس سے مختلف نہ ہو۔ ضرورتاً طلبہ کو مشورہ دینے اور اگر کسی تعمیری منصوبے میں خاص میکانکی
کی ضرورت ہو تو براہِ راست امداد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مدرس بہر صورت منصوبے کے مکمل
ں ان کا ہم درد، معاون، محرک اور بے لاگ دوست ہو، وہ دیکھتا ہے کہ کام کی گراں سامانی سے
رفتارِ ترقی تھم نہ جائے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عدم دل چسپی کی وجہ سے طلبہ منصوبے کو ادھورا چھوڑ دیتے ہیں یہ بھی
ہیں۔ کام کا ادھورا رہ جانا بالالتزام بعض ذہنی الجھاؤ، عدم دل چسپی یا کسی جذباتی تصادم کا نتیجہ
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مدرس کی جانب سے کوتاہی ہوئی ہو، اور اسے طلبہ کے متحرک کرنے میں
نہ ہوئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ راستے کی الجھنوں نے طلبہ ہی کو بد دل کر دیا ہو۔ اور یا تو انھوں نے اس کے
نے کا فیصلہ کر لیا ہو، یا یہ کہ اس میں انھیں کوئی دل چسپی نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں مدرس کی بصیرت ہی
کام آسکتی ہے۔

فیصلہ

منصوبی طریق تدریس میں آخری منزل منصوبے کے متعلق ایک فیصلہ کن رائے کا اظہار ہے۔ آیا یہ منصوبہ
رہا یا اس میں کچھ بنیادی خامیاں رہ گئی ہیں۔ کام کی تکمیل کے بعد طلبہ کے سامنے ان کی محنت کا حاصل ہوتا ہے،

یہ حاصل اچھا ہے یا برا، اس سے بحث نہیں۔ بہرصورت حاصل ہے۔ غلطیاں ناگزیر ہیں لیکن ان سے انسان کو اپنی تصحیح کا موقع ملتا ہے۔ ایک منصوبے کی تکمیل میں اگر کچھ ایسی خامیاں رہ گئی ہیں تو دوسرے میں طلبہ اس سے یقیناً اجتناب کریں گے۔

فیصلہ حالات کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر منصوبہ انفرادی ہے تو طالب علم کو حق ہے کہ وہ اپنے کام کا تنقیدی جائزہ لے۔ آیا اس میں حسن کار کی جلوہ نمائی ہے یا وہ قبیح محض ہے۔ اس کا فیصلہ طالب علم پر چھوڑ دینا چاہیے اور مدرس اسے اچھا یا برا کہنے کی بجائے صرف یہ سمجھا دے کہ کسی شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے پیمانے کیا ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ طالب علم انھیں کس طرح استعمال کر سکتا ہے۔ خود اپنی تنقید دوسروں کی تنقید سے بہتر ہوتی ہے۔ اس میں ایک قسم کا رچاؤ ہوتا ہے جس کی لذت اسے اصلاح کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسری صورت اجتماعی منصوبے کی ہے۔ طلبہ کا جو گروہ منصوبے کی تکمیل میں منہمک رہا اور تکمیل کے مختلف مدارج سے گذرا، انھیں بھی اپنی صنعت کے خوب و زشت کے متعلق اظہار رائے کا اتنا ہی حق حاصل ہے۔ تعلیم کا مقصد طلبہ کی تنقیدی حس کو تیز کرنا اور تعمیری رائے دینے کی اہلیت پیدا کرنا ہے۔ اگر فیصلہ اور تنقید کی ساری ذمہ داری طلبہ کو سونپ دی جائے تو مجموعی طور پر اس کا ان پر بہت خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ ایک طالب علم کے لیے اکثر اپنے ساتھی کی رائے زیادہ وقیع ہوتی ہے۔ اس کے مشورے مدرس کے مشوروں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے اپنی عمر والوں کی بات بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مدرس طلبہ کے ان رجحانات سے فائدہ اٹھا کر طلبہ کے ذوقِ جستجو کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔

کونلنگ کی رائے میں طلبہ کے لیے اس کے چار پہلو ہو سکتے ہیں۔ اوّل تبدیلی کے متعلق مشورے، دوم اصلاح کی پڑتال۔ سوم فیصلہ کرنے کا موقع۔ چہارم اصلاح پر عمل۔ (باقی)

تدریس شعر

شیخ اصغر علی

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

صفی لکھنوی کے اس شعر سے صاف جھلکتا ہے کہ شعر، شعر کہنے والے کے جذباتِ ملفوظہ کا نام ہے یعنی شعر شاعر کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر اچھا شعر، کہنے والے کے دل سے نکلتا اور سننے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔

جذبات انسانی کو متعدی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک انسان سے دوسرے انسان اور ایک دل سے دوسرے دل تک آپ سے آپ منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں بعض اوقات تو انتقال جذبات کا یہ عمل کسی لفظ، فقرے یا آواز کا بھی محتاج نہیں ہوتا بلکہ حرکاتِ انسانی، چہرے کی رنگت، ماتھے کے شکن، آنکھوں کی پتلیوں کی گردش اور دیگر تاثرات ان جذبات کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔ جب ہم خاموش تصاویر سے تاثر قبول کیے بغیر نہیں رہتے تو کلامِ شاعر جو ایک انسان کے "دلِ گداختہ" کی پکار اور اس کے جذبات قلبی کی واضح للکار ہے، ہمیں متاثر کیے بغیر کیوں کر رہ سکتا ہے بس ضروری ہے کہ شعر کو سننے کے بعد سامع پر بھی وہی اثر طاری ہو جو شاعر کے دل پر وارد ہوا ہے۔ اور وہ شعر، شعر نہیں جو جذبات انسانی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ یا ان جذبات کو خاص تاثرات کے تحت تحریک نہیں دیتا۔

تدریسِ شعر کے مقاصد

تدریس شعر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طالب علم میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ شعر سننے یا پڑھنے کے بعد ان جذبات کو محسوس کرے جن کو شاعر کی حساس طبیعت نے خود محسوس کرنے کے بعد شعر کہا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعر کا احساس و ادراک یا شعر فہمی، شعر گوئی کی طرح ایک ذوقی و وجدانی چیز ہے اور شعر کو

سمجھنے کے لیے طبعی صلاحیت اور خداداد ذوق کی ضرورت ہے۔ اور ہر بچے میں شعر کو سمجھنے، اس کو سراہنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کم و بیش صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو عالمِ طفولیت میں جب کہ بچہ صحیح معنوں میں زبان نہیں بول سکتا۔ وہ تال اور سُر پہ سَر نہ دھنے۔ بچوں کو کلامِ موزوں کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ وزن کے پیارے۔ لَے کے عاشق اور جوڑ کے ساتھ جوڑ ملانے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ گا گا کر پڑھنا۔ گانوں کے ریکارڈ سننے کے لیے گراموفون یا ریڈیو کے گرد جمع ہو جانا اور خود گنگناتے رہنا ان کے اس فطری ذوق اور رغبتِ شعری کا آئینہ دار ہے۔ استاد کا مقصد شعر فہمی کی طبعی صلاحیت کو اجاگر کرنا، اس وہبی ذوق کی تربیت کرنا اور اس جذبۂ تحسینِ شعر کو نکھارنا ہے۔

شعر کسی ایک تاثر اور کسی ایک جذبے کا حامل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مختلف تجربوں اور متنوع کیفیتوں کا غماز ہوتا ہے۔ ایک شعر نعرۂ مسرت لگاتا ہے تو دوسرے سے غم و الم کی چیخیں بلند ہوتی ہیں۔ تدریسِ شعر کا مقصد ہر شعر سے طلبا اور طالبات میں اس مخصوص جذبہ کا احساس پیدا کرنا ہے جس کا وہ مظہر ہے۔

شاعری کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے بلکہ اسے جملہ فنونِ لطیفہ میں ایک برتر مقام دیا جاتا ہے کیوں کہ ہر فنِ لطیفہ کسی ایک احساس کی ترجمانی کرتا اور کسی ایک حس کو اپیل کرتا اور اسے مسرت بخشتا ہے، جب کہ شاعری بہ یک وقت گوناں گوں احساسات کی نمائندہ بن کر جملہ حواس کو محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مثلاً موسیقی صرف قوتِ سامعہ کو حظ بخشتی ہے۔ مصوری کا تعلق محض بینائی سے ہے۔ لیکن شاعری ایک ہی وقت میں موسیقی و مصوری دونوں کا مزہ عطا کرتی ہے۔ ایک طرف اس کی دل نواز غنائیت سامع کے کانوں میں میٹھا میٹھا رس گھول کر ڈالتی ہے اور دوسری طرف اس کی محاکاتی کیفیت ذہن کے کینوس پر ایسی لاجواب تصویر کھینچتی اور اس میں وہ رنگ بھرتی ہے کہ اس کے سامنے مصور کا موقلم بھی عاجز و ششدر رہ جاتا ہے اور ترنم و محاکات کے ساتھ ایک احساس، جذبات میں تموّج، طبیعت میں ارتعاش، جملہ حواس کی تسکین کا سامان پیدا کرنا، یہ سب شعر کے سوا کسی اور فنِ لطیفہ میں ممکن نہیں۔

تدریسِ نظم کا بنیادی مقصد یہ تو نہیں کہ طلبہ چند الفاظ کے معانی سمجھ لیں یا چند ایک محاورات کا محلِ استعمال جان لیں۔ بلکہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہر طالب علم نظم پڑھنے کے بعد ایک پُر خلوص ادبی مسرت اور ایک

ذہنی کیف محسوس کرے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ شعر کو یوں پڑھائے کہ طلبہ اس کے لطف سے بہرہ ور ہوں، بلکہ لطف اندوز ہوں۔ وہ شعر کے ترنم کی داد دیں۔ اس کی غنائی کیفیت سے مزہ لیں۔ اس کے وزن کو سمجھیں۔ اس کی تال اور لے کو پرکھیں۔ اور بحیثیت مجموعی اس کے تاثرات سے متاثر ہوں۔ نظم کے اعلیٰ تخیل تک رسائی، اور طلبہ کے شہباز فکر کو شاعر کی رفعت تخیل تک اڑانا، شاعر کے حسن بیان کی تحسین اور شعر کے دوسرے عناصر مثلاً سلاست صفائی حسن بندش، جدت ادا، اور تشبیہ واستعارہ کے استعمال پر آفرین، یہ بھی تدریس شعر کے مقاصد میں شامل ہیں کسی اخلاقی نظم سے سبق لینا۔ کسی واقعاتی نظم سے اس واقعہ کے پس منظر کو سمجھنا اور اس کے نتائج سے روشناس ہونا بھی ایک اہم مقصد ہے۔

تدریس شعر سے مدعا یہ بھی ہے کہ طلبہ کے اندر ایک ایسا احساس جنم لے جو ان کی اس کثیر ادبی سرمایہ کی طرف رہ نمائی کرے جو ہمارے شعرا کی ذہنی کاوش کا نتیجہ اور ان کے دلی جذبات کا مرقع ہے۔ اگر ایک استاد بچے کو شعر کی چاٹ نہیں لگا دیتا۔ اس میں ایک لگن پیدا نہیں کر دیتا۔ اس میں شعر سے محبت اور لگاؤ کا جذبہ بیدار نہیں کر پاتا وہ استاد تدریس شعر کی اصل غرض وغایت سے کوسوں دور رہتا ہے۔

ندامات

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جملہ مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مدرس کو کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔

(۱) انتخاب نظم:- کسی نظم کو شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ استاد اس کی ہیئت اور اس کے مفہوم ومطالب پر نظر ڈالے اور اس بات کا جائزہ لے کہ آیا یہ نظم اپنے مطالب۔ ذخیرۂ الفاظ، بحر اور ردیف وقافیہ کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے ان مخصوص طلبہ کو جو استاد کے مخاطب ہیں، پڑھایا جائے۔ یہاں استاد کو طلبہ کے رجحانات۔ ان کے فطری تقاضوں۔ ان کی علمی سطح، ان کے فکری معیار اور ان کی عمر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی نظم انتخاب کرنا ہوگی جو ہر پہلو اور ہر اعتبار سے ان کے لیے موزوں ہو اور ان کی زندگی سے ربط رکھتی ہو۔ پھر نظم کے انتخاب میں موسم اور ماحول کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ رت گرما پر لکھی ہوئی نظم کو موسم سرما میں پڑھانا جب کہ خون انسانی رگوں میں منجمد ہوا جاتا ہو اور سردی کے موضوع پر کہے گئے اشعار کو سخت گرمی کے دن پڑھانا جب کہ تمازت آفتاب سے دماغ کا گودا تک پگھلا

جاتا ہو، نظم کا خون کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مخصوص کتابوں کے مقرر کر دینے سے استاد کا حق انتخاب ختم ہو جاتا ہے اور معلم مجبور ہوتا ہے کہ وہ تمام نظمیں جو نصاب کی کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں پڑھائے۔ لیکن اس میں استاد کو اتنی رعایت تو ضرور ہوتی ہے کہ وہ نظموں کی اس بندھی ٹکی ترتیب میں اپنی جماعت کے طلبہ اور موسم و ماحول کی ضروریات کے مطابق ترمیم و تبدیلی کرے۔ اور یہ بات ذہن میں رہے کہ نصاب کی کتاب منظور کرنے سے پیشتر اس بات کی پوری چھان بین کی جاتی ہے کہ نصاب کی کتابوں میں مشمول نظمیں، بچوں کے معیار کے مطابق ہوں۔ ان سے ان کے رجحانات، ان کے فطری تقاضوں، ان کے طبعی ذوق اور دیگر حواس کی پوری تسکین کا سامان فراہم ہو۔ نیز وہ فنِ شعر کے معیار پر پوری اترتی ہوں اور مستند شعراء کی کہی ہوئی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی استاد کسی خاص نظم کو بہت ہی معقول وجوہ کی بنا پر اپنی جماعت کے معیار سے اونچا یا اپنے ماحول سے ٹکراتا ہوا پاتا ہے تو اسے یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اس نظم کی بجائے کوئی اور نظم پڑھائے جس کی تدریس اس کے خیال میں زیادہ ضروری اور مفید ہے۔ معلم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چھوٹی جماعتوں میں مترنم بحروں والی نظمیں مرغوب ہوتی ہیں۔ اور بڑی جماعتوں میں ترنم کے علاوہ طرزِ ادا اور ندرتِ تخیل قابلِ توجہ ہوتے ہیں۔

تمہید

نظم کے انتخاب کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس نظم کو کس طرح طلبہ کے سامنے پیش کیا جائے کہ وہ ان کے لیے موجبِ دلچسپی اور باعثِ مسرت ہو۔ طلبہ کے اذہان اسے بطیبِ خاطر قبول کریں اور معلم کو نظم کی تدریس کے دوران طلبہ کا پورا پورا تعاون حاصل رہے۔ اصطلاح میں اس اقدام کو "تحریکِ ذہنی" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ نظم کی تدریس سے قبل استاد کے لیے لازم ہے کہ وہ نظم پڑھنے، شعر سمجھنے اور اس کی داد دینے کے لیے ایک خوش گوار ماحول اور موضوع سے مطابقت رکھنے والی سازگار فضا مہیا نہ ہو، نظم کے سبق کی کامیابی محال ہے۔ معلم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی دلچسپ اور موزوں گفتگو سے، اپنے سلیقہ مندانہ برتاؤ سے اور اپنی نفسیاتی اور علمی سوجھ بوجھ سے کچھ نظم کے موضوع سے ملتی جلتی باتیں کرے

ایسی باتیں جن کا ایک سرا طلبہ کی سابقہ معلومات سے ملتا ہو تو دوسرا اس نظم کے موضوع و مطالب میں کھلتا ہو مثلاً
استاد کو مرحوم کی لکھی ہوئی نظم "ملکہ نورجہاں کا مزار" پڑھانا ہے۔ طلبہ نورجہاں ایسی تاریخی شخصیت سے نابلد نہیں
ہیں۔ وہ ملکہ نورجہاں کی عظمت، اس کی فراست، اس کے حسن، حکومت کے نظم و نسق میں اس کے عمل دخل اور
جہانگیر کی زندگی میں اسے جو بلند مقام حاصل رہا اس سے واقف ہیں۔ لیکن یہ باتیں ان کے حافظۂ بعید یا بعض
طلبہ کے حافظۂ قریب میں ہیں۔ اب ان ساری باتوں کو گفتگو کا موضوع بنانا۔ مناسب سوالات کے ذریعہ
نورجہاں کے بارے میں یہ سارا مواد حاصل کرنا۔ پھر کمال اور زوال کا تعلق اور اس دنیا کی بے ثباتی کو واضح
کرنا اور اس بارے میں طلبہ کے تاثرات معلوم کرنا اور اس کے بعد اس نظم کو پڑھانا یقیناً زیادہ موزوں ہے
بجائے اس کے کہ استاد جماعت میں جائے اور نظم کا متن پڑھتا جائے اور اس کا مفہوم بیان کرتا جائے
جب کہ طلبہ کے دماغ کہیں کے کہیں گھوم رہے ہوں۔ اس نظم کو شروع کرنے کے لیے لاہور کے اساتذہ کا
تو اور بھی موزوں مواد ہاتھ آجاتا ہے کہ اکثر طلبہ نے نورجہاں کا موجودہ مزار دیکھ رکھا ہوتا ہے۔ اور مطلقاً
مزار پر براہِ راست گفتگو کرنے اور فوراً اصل موضوع کی طرف گریز کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ نورجہاں
کے مزار کی تصویر یا اس کے ماڈل اور نورجہاں اور جہانگیر کی تصاویر دکھانے سے سبق میں زندگی کی لہر
دوڑ جاتی ہے۔ اور اس طرح نورجہاں۔ جہانگیر اور ان کے مزاروں کے دھندلے نقوش نکھر کر پورے
رنگ و روپ کے ساتھ ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغوں سے پراگندگی
بادل چھٹ جاتے ہیں۔ اور اذہان میں سبق اور صرف سبق کے متعلق خیالات جمع ہو جاتے ہیں۔ سبق کے آغاز
میں شاعر کی تصویر دکھانے، اس کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر مختصر گفتگو کرنے سے طلبہ کے دلوں
میں شاعر کی عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور شاعر سے محبت اور لگاؤ کا یہ جذبہ اس کی نظم پڑھنے اور اس
سراہنے میں مدد و معاون بنتا ہے۔ چکبست کی منظوم رامائن کا وہ ٹکڑا جہاں رام چندر جی بن باس کو سدھار
وقت ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں۔ پڑھانے سے پیشتر ایک خاص فضا تیار کرنے کی ضرورت پیش آ
ہے۔ بچے ماں کی ممتا کو سمجھتے ہیں، اور اس کی محبت و شفقت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ
قول و اقرار۔ ایفائے عہد کی اہمیت، باپ کی عزت اور اس کے حکم کا پاس، اور ایثار و قربانی یہ ایسی چیز

بن کا دھندلا سا خاکہ طلبہ کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ اب ان سب حقائق کے بارے میں ان کے تاثرات کو
لکھوانا اور پھر اس اخذ کردہ مواد سے ایک ایسا محل تعمیر کرنا جس کے جھروکوں میں بیٹھ کر وہ اس سماں کو ملاحظہ کریں
جس کی منظر کشی شاعر نے کی ہے۔ معلم کی فن کاری اور اس کی سلیقہ شعاری کا متقاضی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس "آمد صبح"
کے موضوع پر انیس کے اشعار پڑھانے سے قبل اگر بچوں کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھا کر صبح کے
سہانے سماں، طلوع آفتاب کے حسین نظارے، پرندوں کی چہک، کلیوں کی مہک، سرسبز گھاس اور اس پر
بکھرے ہوئے شبنم کے قطرے کہ جن کو سورج دیوتا کی سنہری کرنیں موتی بنا کر چمکاتی ہیں وغیرہ کے بارے میں خاصی
گفتگو کر لی جائے اور پھر دوسرے شعرا کے چند ایک اچھے اچھے شعر جو اسی موضوع پر کہے گئے ہوں سنا دیے
جائیں تو سبق کی اٹھان آسان اور نظم کی تفہیم سہل تر ہو جائے گی۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں - عدل جہاں گیری - سیر کہسار - ایک آرزو - جوگی - غرض نظمیں ان کی
مناسبت سے اتنی جدا جدا تمہیدیں۔

تاریخی واقعات والی نظموں کی تمہید میں استاد کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تاریخ کو ہمیشہ ثانوی حیثیت حاصل
ہے۔ یعنی سبق دیکھ کر یہ احساس پیدا نہ ہو کہ یہ سبق اردو ادب کا سبق نہیں بلکہ تاریخ کا سبق ہے۔ تاریخی واقعہ
پر روشنی ڈالنا بجا۔ تاریخی شخصیتوں سے ان کی تصاویر یا در چارٹ دکھا کر تعارف کرانا درست۔ لیکن اس طرح کہ
تاریخ ادب پر غالب نہ آنے پائے۔

اخلاقی نظموں میں۔ اخلاق کی متعلقہ شق پر مناسب لیکن مختصر بحث سبق کی کامیابی کا راستہ ہموار کر دیتی
ہے۔ غزلیات میں جہاں ہر شعر ایک الگ تجربے کا حامل ہو اور معلم کو کوئی ایسا موضوع ہاتھ نہ آئے جسے موضوع
تمہید بنایا جا سکتا ہو۔ وہاں شاعر کے تذکرے اور اس کے فن اور شاعری پر گفتگو کر کے بچوں کے ذہنوں کو نئے
سبق کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔

ملدیہ کا استعمال

تمہیدی گفتگو کو دلآویز بنانے اور تدریس کو دلچسپ بنانے کے لیے موزوں تصاویر یا در نقشہ جات سے
مدد لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ "جوگی" کی نظم کو پڑھاتے وقت اگر معلم ایک ایسے جوگی کی تصویر جو ایک لمبا سا

چوغہ نما کرتہ پہنے ہوئے۔ ایک ہاتھ میں عُصّا فقیری اور دوسرے میں کشتول تھامے ہوئے۔ لٹیں لٹکائے اور پاؤں میں کھڑائیں اور گلے میں موٹی سرٹی مالا پہنے ہوئے ہو۔ پھٹے ہوئے کان جن میں بڑے بڑے مندرے پہنے ہوئے کھڑا ہوا دکھا دے تو سبق میں خود بخود دل چسپی بڑھ جائے گی۔ پہاڑ کے ایسے مناظر کی خوش رنگ تصاویر جنہیں شاعر نے لفظی تصویروں میں بیان کیا ہے۔ نظم کی تدریس کو اس قدر جاذب توجہ بنا دیں گی کہ بیان ممکن نہیں۔ اسی طرح "ایک آرزو" کو پڑھاتے وقت ایک ایسی تصویر جس میں بیچ دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔ اور جہاں سے صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں۔

ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو۔

ایسی تصویر جس میں بیچ پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گُل کی ٹہنی۔ اور جہاں غروب آفتاب کا دل فریب منظر پیش کیا گیا ہو۔ پہاڑ کے ایک کونہ میں اس چشمے کے کنارے ایک کٹیا ہو اور علامہ اقبال سبزے کے بچھونے پر ہاتھ کا سرہانا بنائے ہر فکر سے آزاد لیٹے نظر آئیں۔ یقیناً جماعت ہفتم کے بچوں کے لیے ایک عجیب فرحت اور دل چسپی کا سامان مہیا کرے گی۔

تمہید میں احتیاط کی ضرورت

ماحول کی تیاری میں استاد کو اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی گفت گو لمبے چوڑے لیکچر پر مشتمل ہونے کی بجائے آسان اور مختصر بات چیت پر موقوف ہو جس میں طلبہ برابر کے شریک ہوں۔ استاد کی حیثیت عامل اور بچے کی کیفیت معمول کی نہ ہو، بلکہ معلم متعلمین کے پورے تعاون سے تمہید کی استوار بنیادوں پر سبق کی عمارت کھڑی کرے جس میں استاد کے موزوں سوالات اور طلبہ کے مناسب جوابات خام مواد اور مسالے کے طور پر استعمال ہوں، تمہید میں بے جا طوالت سبق کا ناس کر دیتی ہے۔

معلم کے ہاں وقت کے تناسب کا احساس پایا جانا بھی نہایت ضروری ہے اور جو مدرس اس احساس سے عاری ہوتا ہے وہ کبھی بھی سبق کو کامیابی کی منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس لیے کہ اول تو وہ ماحول کی تیاری میں ادھر اُدھر بھٹک کر بہت سا وقت ضائع کر دیتا ہے اور تحریک ذہنی کی بجائے وہ طلبہ کے دل و دماغ دور از کار باتوں سے اور زیادہ پراگندہ اور منتشر کر دیتا ہے اور اگر وہ تحریک ذہنی میں کامیاب بھی ہو جاتا تو

وہ بچوں کی اس آمادگی اور ذہنی تیاری سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کہ منزل اول ہی میں وہ اتنا وقت لے جاتا ہے کہ دوسرے اقدامات ادھورے اور تشنہ رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلے سے سوچی ہوئی تمہیدی گفتگو اور پہلے سے سوچے سمجھے سوالات استاد کے لیے خاصے مفید ہوتے ہیں۔ اس لیے موقع پر سوال پوچھتے رہنا جہاں تضیع اوقات کا موجب ہوتا ہے وہاں بعض سوالات بے معنی، بعض بچوں کے فہم وادراک سے بالا، اور بعض بے ڈھب اور غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ جملہ سوالات کا مدار بچوں کی سابقہ واقفیت پر ہونا چاہیے۔ سوالات ایسے ہوں جو نئے سبق کی طرف بڑھنے میں مدد دیں۔ سوالات فکر انگیز ہوں، البتہ زبان ان کی سادہ رہے۔ سوالات سے طلبہ کی جبلتِ استعجاب چمک اٹھے۔ اور طلبہ نئے سبق کے لیے نہ صرف آمادہ بلکہ بے تاب ہو جائیں۔

اسباق سیاحتہ میں اکثر تمہیدیں اپنی بے ربطی کے باعث کھٹکا کرتی ہیں، اور بعض تو اچھی خاصی مضحکہ خیز ہوتی ہیں اور طلبہ اور ناقدین دونوں کے لیے سرمایۂ تمسخر کا کام دیتی ہیں۔ اگر خوف طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو تفنن طبع کے لیے دو چار مثالیں یہاں نقل کردی جاتیں۔

موضوع سے تعارف

تدریس شعر میں، ماحول کی تیاری کے بعد، یہ ضروری ہے کہ بچوں کو اصل موضوع سے متعارف کرایا جائے اور مختصراً نظم زیر مطالعہ کی اہمیت اور اردو ادب میں اس کے مقام پر روشنی ڈالی جائے۔ شاعر کا تذکرہ اگر تمہیدی نہ ہوا ہو تو یہاں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر اس شاعر کی کوئی نظم بچوں نے پہلے سے پڑھ رکھی ہے۔ اور طلبہ اس شاعر کی شخصیت اور شاعرانہ کمالات سے بخوبی واقف ہیں۔ اور اس شاعر کے بارے میں مزید کچھ بتانا معیار سے اونچا اٹھنا ہے تو پھر انہی بتائی ہوئی باتوں کا اعادہ کرلینا کافی ہوگا۔

قرأت

اب نظم خوانی کی باری آتی ہے۔ یہ حصہ فی الحقیقت سبق کی جان کا حکم رکھتا ہے۔ نظم کا سبق عبارت ہے اس کی اچھی قرأت سے۔ قرأت اچھی تو نظم اچھی۔ ورنہ بڑھیا نظم بھی قرأت کے گھٹیا پن کے بھینٹ چڑھ گئی۔ سبق کی کامیابی کا سارا مدار استاد کے اپنے نمونۂ قرأت پر ہے۔ استاد کا اندازِ نظم خوانی نہایت موثر اور دل کش ہونا

اس کی آواز موضوع نظم کے مطابق آتار چڑھاؤ کے فن سے آشنا ہو۔ غم میں آواز کا ڈوب جانا، دکھ کے بیان میں دل کا بیٹھنا اور جی کا چھوٹ جانا۔ ایک فطری امر ہے۔ لب و لہجہ اور آواز سے مترشح ہونا چاہیے کہ داستان غم پڑھتے ہوئے معلم کا دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ آواز بھرا رہی ہے۔ آنکھوں میں غم کی رمق اس کی غم بھری آواز کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کے برعکس اگر نظم میں فرحت و انبساط کی باتیں ہیں، خوشی اور مسرت کے ترانے ہیں، محبت کے مدھر گیت ہیں تو استاد کی آواز میں ایک مستی، ایک سرور اور کیف ہونا چاہیے۔ اگر نظم شجاعت اور دلیری کا قصہ بیان کرتی ہے۔ قوم کو جہاد کی دعوت دیتی ہے۔ جذبات میں جرأت اور جوش پیدا کرتی ہے اور انسان کو مردانگی اور بہادری کا درس دیتی ہے تو معلم کی آواز میں مردانہ وقار، ایک خطیبانہ جوش، ولولہ اور زور کا پایا جانا ضروری ہے۔ کہ یہ نہ ہو تو قلوب میں گرمی اور جذبات میں جولانی کہاں سے آئے گی اور نظم سے خاطر خواہ تاثر کیوں کر پیدا ہو گا؟ جذبات، آواز اور حرکات کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ درست ہے کہ کبھی صرف آواز اور کبھی صرف حرکات ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن اگر یہ دونوں موجود ہوں تو انفعالی جذبات کا عمل نہ صرف سہل ہو جاتا ہے بلکہ زیادہ پُراثر اور زیادہ واضح بھی۔ اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ آواز کے زیر و بم اور تغیرِ لحن کے ساتھ ساتھ بغرضِ ضرورت حرکات و سکنات کا بھی خیال رکھے۔ ورنہ سبق کا بنیادی مقصد کہ طلبہ ان جذبات سے متاثر ہوں جن سے متاثر ہو کر خود شاعر نے شعر کہے ہیں، فوت ہو جائے گا۔ استاد کی آواز میں ایک جادو ہونا چاہیے، وہ جادو نہیں جو ایک موسیقار اور مغنی کی آواز میں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ کشش اور وہ اثر جو ایک خطیب اور جادو بیان مقرر کی آواز میں ہوتا ہے۔ آواز بلاشبہ ذوق کی طرح ایک فطری اور وہبی چیز ہے۔ لیکن اس کی تربیت اسی طرح ممکن ہے جس طرح جمالیاتی ذوق کی۔ لب و لہجہ کو سنوارنا، اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنا اور نظم کے جذبات کو اپنے آپ پر وارد کر کے خلوص کے ساتھ اسے آواز کا روپ دینا بہت حد تک استاد کے بس کی بات ہے اور جو استاد اس بارے میں محنت اور ریاضت سے کام لیتے ہیں، وہ اس مقصد سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

خلوص: ۔ قرأت میں اصل چیز قاری کا خلوص اور دل ہے، خود شعر جس کی تدریس کی ذمہ داری معلم اپنے سر لیتا ہے، شاعر کے خلوص کا مظہر ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

برگِ گل رنگین ز مضمونِ من است ✦ مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است

شعر، شاعر کے دل سے نکلتا ہے اور اس کا ہر مصرعہ اس کے خونِ جگر سے رنگینی حاصل کرتا ہے۔ ایسے شعر اور نظم کی قراءت کا حق کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ اگر اس میں قاری اپنے خلوص کا رس نہ گھولے اور اس پر اپنے خونِ جگر کی آب نہ چڑھے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال اپنے مخصوص پیرائے میں اور پیارے انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

آیا کہاں سے نغمۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے یا چوبِ نے
جس روز دل کے رمزِ مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

اور پھر ؏ خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اور ؏ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

کہ کر علامہ نے اس بات کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ قندِ مکرر کا مزہ آنے لگا ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ ہر نظم کو گا گا کر پڑھنا یا اسے طبلے اور سارنگی کی دھنوں پر بٹھانا درست نہیں، اور اگرچہ اس دور میں بعض گائی ہوئی نظموں کے ریکارڈ جماعت میں لگانا یا ریڈیو سے سنوانا بجا ہے لیکن عام حالات میں یہی بہتر ہے کہ معلم نظم کو تحت اللفظ پڑھتے ہوئے اپنے اخلاص اور فن کے رچاؤ سے وہ بات پیدا کرے کہ طلبہ کے دلوں کی دھڑکنیں استاد کی آواز اور اس کی حرکات و سکنات کے طربیہ نظم میں ان کے دل خوشی سے جھلوم جائیں اور چہرے پھول کی طرح کھلکھلا اٹھیں۔ المیہ میں وہ مجسمہ غم نظر آئیں اور پژمردگی کے اثرات ان پر غالب ہوں۔

(باقی)